تمنا بے تاب

رشید امجد

رشید امجد

حرف اکادمی

۱۰۳۔اے، پشاور روڈ، راولپنڈی۔ فون:۵۴۷۸۸۸۲

HaSnain Sialvi

اب تک:

حرف اکادمی

اہتمام

کرنل (ر) سید مقبول حسین (ستارۂ امتیاز)

کتاب :	تمنا بے تاب
مصنف :	رشید امجد
سرورق :	منزہ جاوید
اشاعت اول :	ستمبر ۲۰۰۱ء
اشاعت دوم :	ستمبر ۲۰۰۳ء
تعداد :	پانچ سو
کمپوزنگ :	○ مبشر نذیر رانجھا، فرنیڈز کمپیوٹر سنٹر، یوسف مارکیٹ کمال آباد ۳، راولپنڈی۔ فون: ۰۵۱۔۵۵۴۷۲۴۱
	○ عابد سیال، فون: ۰۳۳۳۔۵۱۹۳۹۰۳
مطبع	محمود برادر پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی
قیمت	۱۵۰ روپے
ناشر	حرف اکادمی

۱۰۳۔اے، پشاور روڈ، راولپنڈی۔ فون: ۰۵۱۔۵۵۶۶۱۳۱

ISBN.969-8644-01-6

علیا چاچا

استاد غلام رسول طارق

اور

حلقہ ارباب ذوق

کے نام

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

(غالبؔ)

○

معروف معنوں میں یہ خودنوشت نہیں بلکہ یادیں، خیالات، تجزیے اور مختلف اشیا کے بارے میں میرے نقطہ ہائے نظر ہیں، جن میں میری نجی زندگی اور میرا عہد دونوں شامل ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے۔ اس میں زمانی ترتیب نہیں، جس طرح کوئی ذکر آیا ہے اور بات میں سے بات نکلی ہے، میں نے اُسے اسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود میری زندگی ایک تمنائے بے تاب ہے، عاشقی کے لیے جو صبر طلبی چاہئے، وہ مجھ میں نہیں۔

ان یادداشتوں میں ذاتی احوال کے ساتھ ساتھ بعض ایسی بحثیں بھی شامل ہیں جو کسی حد تک مضمون بن گئی ہیں۔ اسی طرح بعض تجزیے خاصے پھیل گئے ہیں، لیکن یہ سب میری زندگی کا حصہ ہیں۔ میں ان سب میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہوں۔ ان سے میرا اپنا نقطۂ نظر بھی واضح ہوتا ہے اور میری پوری نسل کے ادبی و فکری مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، نیز یہ کہ میرے عہد کی ایک تصویر بنتی ہے، اچھی بری جو کچھ بھی ہے، سو ہے۔ میری نسل کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی کا بڑا حصہ مارشل لا میں گزارا۔ میں اٹھارہ سال کا تھا تو پہلا مارشل لا لگا۔ چالیس کی دہلیز پر قدم رکھا تو دوسرا مارشل لا لگ چکا تھا اور ساٹھ کے دائرے میں پاؤں رکھ رہا تھا تو ملک تیسرے مارشل لا کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

○

پہلے ایڈیشن میں کمپوزر کی لاپرواہی کی وجہ سے اتنی اغلاط ہوئیں کہ تحریر کا تسلسل ہی ٹوٹ گیا اور کئی حصے کمپیوٹر ہی میں رہ گئے۔ اس ایڈیشن میں یہ سارے صفحات شامل ہیں۔ عزیزہ صوبیہ سلیم، جو یونیورسٹی میں میری ساتھی ہیں، کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے مسودے کو کئی بار پڑھا اور غلطیاں درست کیں۔ عابد سیال کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف سارے مسودے پر نظر ڈالی بلکہ کمپوزنگ کی اغلاط درست کر کے اسے موجودہ صورت میں پیش کیا۔ سب سے زیادہ شکریہ کرنل (ر) مقبول حسین کا کہ وہ بہت سارے دباؤ کے باوجود اس کتاب کو دوسری بار شائع کر رہے ہیں۔

○

مارچ میں سری نگر کے پہناوں میں گرماہٹ بکھیرتی کانگڑیاں ٹھنڈی پڑنے لگتی ہیں۔ شہر برف کی کینچلی اتار کر نیم گرم سانسیں لیتا ہے۔ بادام کے درختوں پر سفید بُور آ جاتا ہے اور شہر کا شہر بادام وری کے سفید سفید منظر سے لطف اٹھانے کے لیے طرح طرح کے پکوانوں کے ساتھ باغوں میں اُمڈ آتا ہے۔ دو دریاؤں کے درمیاں نواں بازار کے شاہ محلہ میں گلی کے آخر بائیں طرف ایک دو منزلہ مکان ہے، جس کا لکڑی کا چھجا روایتی وسط ایشیائی طرز کے بیل بوٹوں سے سجا ہوا ہے۔ سب سے نیچے تہہ خانہ ہے، جس میں سردیوں کے لیے لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں۔ سارا گھر دائیں طرف ہے، سامنے ایک چھوٹی سی گلی نما کھلی جگہ ہے جس کا ایک دروازہ جسے مرکزی دروازہ کہنا چاہیئے بڑی گلی میں اور دوسرا پچھواڑے میں کھلتا ہے۔ چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ نچلی منزل میں دو کمرے ہیں اور ان کے درمیانی منزل کی راہ داری نیم تاریکی میں ڈوبی رہتی ہے۔ یہاں بھی نیچے کی ترتیب سے دو کمرے ہیں اور درمیان سے سیڑھی اوپر جاتی ہے۔ اوپر والا حصہ ہوادار اور روشن ہے، سیڑھیوں سے نکلتے ہی دائیں طرف والے حصے میں باورچی خانہ، سٹور اور کھلا سا برآمدہ ہے۔ بائیں طرف ایک بڑا کمرا جو سونے کے کام آتا ہے۔ اس سے اوپر پڑچھتی ہے جو تقریباً سارے حصے کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے اوپر ٹین کی چھت، ڈھلوان کی صورت، اسی اوپر والے بڑے کمرے میں جو روشن، کشادہ اور ہوادار ہے اور جس کی گیلری کی ساری کھڑکیاں گلی کی طرف کھلتی ہیں، میں نے ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو زندگی کے دشت میں پہلا قدم رکھا۔

میرے والد غلام محی الدین مونس نقشی قالینوں کے ڈیزائنر تھے۔ کسی انگریز کی قالینوں

کی فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے ،لیکن انھوں نے اپنی بھی ایک چھوٹی سی فیکٹری کھول رکھی تھی ۔ ان کے پڑدادا ڈوگراظلم وستم سے تنگ آکر اپنے خاندان سمیت امرتسر چلے گئے تھے۔ دو پشتیں وہاں رہیں لیکن والد سارے خاندان کو چھوڑ کر دوبارہ سری نگر گئے۔ کشمیری کے علاوہ فارسی اور پنجابی پر بھی انہیں عبور تھا۔ فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ شاید کشمیری میں بھی انہوں نے کچھ کہا ہو مگر میرے علم میں نہیں ۔ان کی شاعری پر صوفیانہ رنگ غالب تھا،طبیعت میں درویشی اور بے نیازی تھی ،انہوں نے ساری زندگی ایک فقیرانہ شان سے گزاری ۔سنا ہے کہ ان کی پہلی شادی سری نگر آنے سے پہلے ہوگئی تھی لیکن ان کے فقیرانہ مزاج کے ساتھ بیوی کا نباہ نہ ہوسکا اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی ۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی دوسری شادی کتنا عرصہ بعد ہوئی ۔ ہاں یہ معلوم ہے کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی ۔دوسری شادی کے لیے وہ امرتسر گئے اور خورشید بیگم سے ،جو میری والدہ ہیں ،ان کا نکاح ہوا اور وہ انہیں لے کر واپس سری نگر آگئے ۔میری والدہ کے پڑدادا بھی ڈوگرہ راج میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ امرتسر وارد ہوئے تھے ۔یوں ان دونوں خاندانوں کی تیسری یا چوتھی نسل واپس سری نگر آگئی ۔ والد اور والدہ دونوں دراز قد اور خوبصورت تھے ۔شادی کے کئی سال بعد تک ان کے گھر میں اولاد نہ ہوئی۔ ایک بیٹا ہوا لیکن چند ہی دنوں میں فوت ہوگیا۔میری والدہ اولاد کے لیے مزاروں پر منتیں مانگتیں اور وظیفے کرتیں ۔ کشمیر میں اولیاء کے کئی مزار ہیں ۔ پہاڑوں کی کھوؤں میں ،یہ پر اسرار مزار، ہر زائر کو اپنے سحر میں لپیٹ لیتے ہیں ۔امی ہر جگہ پہنچتیں ،منتیں مانگتیں ،چراغ جلاتیں ،شاید دس سال بعد ان کی دعا قبول ہوگئی ۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھیں "تجھے بڑی منتوں سے پایا ہے" ایک خواب بھی سنایا کرتی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ وہ دریا کے کنارے بیٹھی ہیں ۔ایک پھول بہتا آرہا ہے،قریب پہنچا تو انہوں نے اُچک کر اسے اٹھالیا اور گود میں رکھ لیا۔

والد کو تصوف کے ساتھ ساتھ ہندو جوتش سے بھی گہری دلچسپی تھی ،چنانچہ میری پیدائش

پر انہوں نے باقاعدہ جنتری بنوائی اور جنم پتری کے مطابق میرا نام اختر رشید رکھا۔ والد اور والدہ کے علاوہ گھر میں ایک تیسرا فرد بھی تھا، علی محمد۔ علی محمد کے ماں باپ سری نگر سے دور ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ باپ ماں غریب کسان، تھوڑی سی زمین، گھر کا گزارا نہ ہوتا، اس لیے بیٹے کو نوکری کے لیے شہر بھیج دیا۔ ہمارے گھر میں وہ گھریلو نوکر کی حیثیت سے آئے۔ گھر میں بچہ کوئی نہیں تھا آہستہ آہستہ گھر کے فرد بن گئے۔ والد کو خیال آیا کہ یہ بچہ ساری زندگی برتن مانجھتے گزار دے گا چنانچہ انہوں نے اُسے طالب سکھانا شروع کی۔ طالب نویسی وہ فن ہے جس میں قالینوں کے نقشوں کو ہندسوں میں لکھا جاتا ہے۔ کاریگر یہ ہندسے دیکھ کر خانے لگاتے جاتے ہیں اور قالین پر نقشا خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔ یہ خاصا مشکل فن ہے لیکن کچھ والد کی توجہ اور کچھ علی محمد کی لگن سے وہ جلد ہی یہ فن سیکھ گئے۔ والد نے اُسی کارخانے میں جہاں وہ ڈیزائنر تھے انہیں طالب نویس کے طور پر ملازم کروا دیا۔ علی محمد اپنی تنخواہ گاؤں بھجوا دیتے اور رہتے والد کے ساتھ۔ اب گھر میں دوسرا نوکرا آ گیا تھا۔ علی محمد گھر کے ایک فرد تھے۔ ان کا گاؤں سری نگر سے خاصا دور تھا۔ میں کئی بار وہاں گیا۔ والد تو شاید ایک دو بار ہی وہاں گئے لیکن میں، امی اور علی محمد اکثر بہار کے موسم میں وہاں جاتے۔ امی اُسے اپنا گاؤں کہتی تھیں اور میں علی محمد کی والدہ اور والد کو دادی اور دادا کہتا تھا۔ سری نگر سے ہم بس میں وہاں جاتے تھے۔ بس گاؤں سے کافی دور اتار دیتی تھی۔ اُس کے بعد ایک بڑا میدان تھا جسے وڈر کہتے تھے۔ وڈر کو طے کر کے ڈھلوان شروع ہو جاتی جس کا اختتام گاؤں پر ہوتا۔ ڈھلوان کے آخری حصے میں ایک غار میں شیخ نورالدین ولی کا مزار تھا۔ غار کے دھندلکے میں ایک ٹمٹماتا چراغ اور شیخ نورالدین ولی کی قبر ایک عجب پراسرار فضا۔ امی کو تو مزاروں پر جانے کا جنون تھا۔ وہ آتے جاتے وہاں رکتیں، اور دیر تک کچھ پڑھتی رہتیں۔ میں ان کے ساتھ کئی مزاروں پر گیا۔ یہ مزار زیادہ تر پہاڑوں کی غاروں اور کھوؤں میں تھے۔ پراسرار فضاؤں میں یہ ٹمٹماتے دِیے ساری عمر میرے اندر موجود رہے اور ایک تحیر و تجسس کی فضا ہمیشہ

میرے اردگرد قائم رہی۔ علی محمد جنھیں میں چچا کہتا تھا، کا گاؤں بہت خوبصورت تھا۔ کمروں کے سامنے بڑا صحن تھا۔ جس کے ایک طرف جانوروں کے باندھنے کا کھلا کمرا، اس کی تین دیواریں تھیں سامنے والا حصہ کھلا تھا۔ اس کے اوپر ایک چوبارہ، جس کے لیے لکڑی کی سیڑھی تھی ہمیں اسی چوبارے میں ٹھہرایا جاتا۔ امی گاؤں جاتے ہوئے شہر سے ڈھیروں بسکٹوں کے ڈبے، دلیے کے ٹین لے جاتیں لیکن میں علی الصبح بستر سے نکل کر چپکے سے سیڑھیاں اترتا اور صحن عبور کر کے بڑے کمرے میں پہنچ جاتا جہاں چولھا جل چکا ہوتا اور دادی اماں چائے بنا رہی ہوتیں۔ وہ سبز چائے میں ستو ڈال کر میرے سامنے رکھ دیتیں۔ انگریزی دلیے کے مقابلے میں ستوؤں والی یہ چائے میں چسکے لے لے کر پیتا۔ امی اٹھتیں تو سخت ناراض ہوتیں کہ میں نے دلیے کی بجائے ستوؤں والی چائے کیوں پی لی ہے۔ وہ دادی کو منع کرتیں کہ کل سے مجھے چائے نہیں دینا لیکن دوسری صبح میں چپکے سے بستر سے نکلتا اور دادی اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ستوؤں والی چائے کا پیالہ میرے آگے کر دیتیں۔

میری پیدائش اس چھوٹے سے گھر میں خوشی کا ایک انمول لمحہ تھا۔ امرتسر سے دادا دادی دوڑے آئے۔ کہتے ہیں کئی دن جشن کا سا سماں رہا۔ میرے شعور کی آنکھ ذرا سی کھلی تو مجھے اُس بڑے کمرے سے مانوسیت ہوئی جس کی ایک دیوار کے ساتھ زمین پر دو بستر تھے جن میں سے ایک میں میں اور امی اور دوسرے میں والد سوتے تھے، چچا سب سے نچلی منزل میں بائیں طرف والے کمرے میں تھے۔ ان کا بستر بھی زمین پر ہی تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے کشمیر میں زمین پر بستر لگانے کی روایت ہے۔ ہمارے گھر میں تو ایسا نہیں تھا لیکن عام گھروں میں ایک ہی بڑا سا طاف ہوتا ہے جس میں سب مل کر زمین پر سوتے ہیں۔ امی دیر سے اُٹھتی تھیں۔ چچا کارخانے جانے سے پہلے مجھے دلیا بنا کر کھلاتے۔ دلیے کے ڈبے میرے لیے خاص طور پر امیرا کدل کے ایک بڑے سٹور سے آتے تھے۔ یہ ٹین کے ڈبے تھے جن پر تاش کے بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی۔

آہستہ آہستہ مجھے چچا سے اتنی انسیت ہوگئی کہ میں ان کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزارتا تھا۔ والد نے چچا کو دوپہر کے وقت گھر بھیجنا شروع کر دیا۔ رات کو میں ضد کرتا کہ چچا کے ساتھ سونا ہے۔ امی مجھے ڈانٹتیں، کبھی کہتیں اس کا بستر گندا ہے اس میں سے بُو آتی ہے لیکن میں نہ مانتا۔ شام کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہ مجھے اپنے بستر میں گھسیٹ لیتیں اور تھپک تھپک کر سلا دیتیں لیکن رات کو جونہی میری آنکھ کھلتی میں خاموشی سے بستر سے نکل کر سیڑھیوں میں آ جاتا۔ نیم تاریک سیڑھیوں میں دبک کر بیٹھا ہوا خوف مجھے دبوچ لیتا۔ میں آہستہ سے آوازیں دیتا ...... علیا چاچا ...... علیا چاچا ...... چچا بھی شاید میری آواز کے منتظر ہوتے، ایک لمحہ میں وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے میرے پاس پہنچ جاتے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے گود میں اٹھا کے چپ چاپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ مجھے فوراً نیند آ جاتی۔ صبح امی انہیں بھی ڈانٹتیں...... ''تم کیوں لے کر گئے اسے'' اور مجھے بھی ''سیڑھیوں میں جرمن متو ہے، اب گئے تو پکڑ لے گا''۔

ہمارے گھر کے تین حصے تھے۔ نچلی منزل، درمیان اور اوپر، درمیان ایک چھوٹی سی گزرگاہ اور جس کے دونوں طرف کمرے، ایک سیڑھی نیچے، ایک اوپر جاتی۔ اس گزرگاہ میں ہمیشہ اندھیرا ہوتا۔ امی مجھے ڈراتیں کہ یہاں جرمن متو رہتا ہے، مجھے نہیں معلوم اس کے معنی کیا ہیں لیکن میری چشم تصور نے اُس کی جو تصویر بنائی تھی وہ بڑی ڈراونی تھی۔ ایک لمبے قد کا شخص، لال انگارہ آنکھیں، ہاتھوں میں بجتے ہوئے کڑے اور ایک ڈنڈا۔ اس جرمن متو نے ساری زندگی مجھے ڈرایا اور یہ اندھیرا کبھی میرے اندر سے نہ نکل سکا۔

جرمن متو شاید جرمنی کے حوالے سے تھا۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور ہٹلر ساری دنیا کے لیے خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔ یورپ میں اتحادیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور اب جاپان برصغیر کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے ہندوستانیوں کی اکثریت ہٹلر کو پسند کرتی تھی۔ سُنا ہے کہ اس زمانے میں ہٹلر نے اعلان کیا تھا کہ

اگر تانبے کے برتن میں پانی ڈال کر اس میں بجلی کی تار ڈال دی جائے تو جرمن ریڈیو سنا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس میں کتنی حقیقت تھی لیکن سری نگر کے گلی کوچوں میں جرمن ریڈیو سننے کی بڑی تمنا تھی۔ جنگ کی خبریں تو ہولناک تھیں ہی لیکن اس کے اثرات اس سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ ہندوستان بھی ان کی زد میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے گھر پر اس کا کتنا اثر ہوا، لیکن بظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ تازہ دودھ فراہم کرنے کے لیے گائیں یدکر گھر کے پچھواڑے، دروازے کے ساتھ اس کے لیے جگہ بنا دی گئی تھی۔ بسکٹوں کے پیکٹ، دلیے کے ڈبے سب کچھ اسی فراوانی سے موجود تھا۔ ہر اتوار کو والد مجھے امیرا کدل لے جاتے، میں جس چیز کی طرف اشارہ کرتا، فوراً خرید لی جاتی۔ کھلونوں کی یہ صورت تھی کہ کئی کھلونوں کو دوسری بار ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہ آئی۔

ہماری گلی بند تھی اور ہمارا گھر بائیں طرف آخری گھر تھا۔ گلی جہاں بند ہوتی تھی وہاں غلام حسین صاحب کا گھر تھا جو کسی انگریزی ہوٹل شاید فلیش مین میں منیجر تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ہمارے پنڈی آنے کے دو تین سال بعد یہ لوگ بھی یہاں آ گئے۔ پنڈی میں ان کی رہائش صدر کوئلہ سینٹر میں تھی۔ وہ ہر اتوار کو دونوں بیٹیوں کے ساتھ ہمارے گھر آتے تھے۔ پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ بڑی بیٹی کی شادی طاؤس بانہالی سے ہوئی ہے اور چھوٹی نے ریڈیو ہی میں ایک بنگالی ساتھی سے شادی کر لی ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ اپنے خاوند کے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی۔ سامنے والے گھر میں جو صاحب رہتے تھے وہ کسی جگہ ملازمت کرتے تھے اور یہیں وہ لڑکی تھی جس کا ذکر میری کہانی ''ایک کہانی اپنے لیے'' میں آیا ہے۔ بچپن کے اس زمانے کی دھندلی تصویروں میں مل کر کھیلنا، برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارنا، چھجے میں بیٹھ کر گلی میں جھانکنا اور اسی طرح کی دوسری دلچسپیاں شامل ہیں۔ برف کے موسم میں جب ٹین کی چھت پر برف کا...... بوجھ بڑھنے لگتا تو چچا اوپر چڑھتے اور درمیان میں کھڑے ہو کر ایک ترشول نما ڈنڈے سے برف کو ٹکورتے۔ ایک شخص گلی میں کھڑا ہو جاتا اور آنے جانے والوں کو

دور ہی روک دیتا۔ ٹکورنے سے برف کی تہہ ٹوٹتی، آگے کھسکتی اور پھر برف کی چادر گلی میں آن گرتی۔ یہ عمل ہر دس بارہ دن بعد دہرایا جاتا کہ برف کے بوجھ سے چھت نہ بیٹھ جائے۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی اس لیے چھت سے گرنے والی برف کو فوراً ہی اٹھا کر کہیں اور پھینک دیا جاتا۔ گلی کے بالکل سامنے بازار کے دوسری طرف تنور تھا جہاں صبح کلچے اور ہریسہ ملتا تھا۔ بائیں طرف امیرا کدل تھا اور دائیں طرف کچھ فاصلہ پر پل تھا جہاں سے آگے دو راستے بنتے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ یہ راستے کدھر جاتے تھے، البتہ دائیں طرف والے راستہ میں کچھ آگے جا کر امی کی ایک سہیلی رہتی تھیں۔ میں انھیں اپنی مینا خالہ کہتا تھا۔ ان کے میاں شمس الدین رنگوں کے ماہر تھے۔ اور والد صاحب ہی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان کا کام قالینوں کے لیے اون کو مختلف رنگوں میں تیار کرنا تھا۔ ان کا ایک بیٹا زاہد میرا ہم عمر تھا، بیٹی لالی بڑی تھی۔ سرینگر سے یہ لوگ تقسیم کے بعد جام نگر چلے گئے تھے (ایک طویل عرصہ بعد اسّی کی دہائی میں میری ان سے پنڈی میں ملاقات ہوئی)۔ پُل سے دائیں طرف سیڑھیاں اترتی تھیں جن کا آخری حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ایک بار ان سیڑھیوں سے اتر کر پانی میں چلا گیا۔ پانی کی لہر مجھے گھسیٹ کر لے گئی اور میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ علیا چاچا کہیں قریب ہی تھے، شاید میں ان کے ساتھ ہی اُدھر کسی کام سے گیا تھا، دوڑے آئے اور انہوں نے دریا میں کپڑوں سمیت چھلانگ لگا دی اور مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ پانی میں غوطے کھانے کا خوف ساری زندگی میرے لاشعور میں سرسراتا رہا۔ تیراکی کے شوق کے باوجود مجھے زندگی بھر پانی میں اترنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

میرے بچپن کا ایک اور خوف ایک نامعلوم ڈر تھا۔ رات کو مجھے یوں لگتا جیسے کوئی میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں چیختا اور امی سے لپٹ جاتا۔ یہ خوف زندگی بھر میرے ساتھ رہا۔ میں رات کو کمرے میں اکیلا نہیں سو سکتا۔ شادی سے پہلے میں امی کے کمرے میں سوتا

تھا۔ شادی کے بعد اگر بیوی ایک رات کے لیے بھی میکے جاتی تو میں امی کو کہتا کہ میرے کمرے میں سو جائیں۔ اب بھی میرا یہ حال ہے کہ کوئی نہ ہو تو میں کسی بچے ہی سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے پاس رہے۔ اکیلا پن میرے لیے ایک عجیب طرح کا خوف بن جاتا ہے۔ اکثر رات کو مجھے یوں لگتا کہ کوئی اچانک آ کر میرے اوپر بیٹھ گیا ہے۔ اس کے بوجھ سے میں کروٹ بھی نہیں لے سکتا۔ میں چیختا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔ کچھ دیر یہ کیفیت رہتی ہے۔ اس کے بعد شاید میں پوری طرح حواس میں آ جاتا ہوں اور لگتا ہے اوپر بیٹھا اچانک غائب ہو گیا ہے۔

ایک خواب بھی عرصہ تک میرے ساتھ رہا ہے۔ ایک ہی خواب جسے میں نے برسوں ایک ہی طرح دیکھا ہے۔ ایک دوڑ ہے، میرے ساتھ ایک لڑکی ہے جس کی صورت مجھے یاد نہیں، ہم بھاگ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں اور ہمارے تعاقب میں ایک بوڑھی عورت ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ یہ خواب میں نے بتسلسل سے برسوں دیکھا ہے لیکن آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ لڑکی کون ہے جسے لے کر میں بھاگ رہا ہوں اور ہمارا پیچھا کرنے والی بوڑھی کون ہے۔

بچپن کے ان خوفوں میں قدم قدم آگے بڑھتا، عمر کی سیڑھیاں چڑھتا میں پانچویں سال میں پہنچ گیا۔ والد نے مجھے برن ہال سکول میں، جو میرا کدل میں تھا۔ کے جی ون میں داخل کروا دیا۔ موٹروں کا ابھی زیادہ رواج نہیں تھا اس لیے میرے آنے جانے کے لیے ایک تانگہ خرید ا گیا۔ میں صبح سویرے تانگہ پر سکول جاتا اور تین بجے کے قریب واپس آتا۔ اس دوران عموماً تانگہ سکول کے باہر کھڑا رہتا۔ برن ہال کی عمارتیں ایک بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مین گیٹ سے اندر داخل ہو کر دائیں اور بائیں دونوں طرف بڑے بڑے بلاک تھے، انہیں میں ایک کھانے کا بڑا کمرا تھا۔ بارہ بجے تک کلاسیں لگتیں، پھر کھانے کا وقفہ ہوتا۔ بنیادی طور پر یہ ایک ریذیڈینشل تعلیمی ادارہ تھا لیکن چند ڈے سکالر بھی تھے۔ ان میں شاید ہی کوئی دوپہر وہاں کھانا کھاتا لیکن میرا نام دوپہر والوں میں بھی شامل تھا۔ والد کا خیال تھا کہ دوپہر کو

وقت پر کھانا نہ ملے تو صحت خراب ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ بچہ کھانے کے آداب سیکھ لیتا ہے
چنانچہ مجھے مجبور کیا گیا کہ دوپہر کو وہیں کھانا کھاؤں، مجبور یوں کہ مجھے وہاں کھانا بالکل پسند نہ
تھا، کھانے کے وقفہ کے بعد دوبارہ کلاسیں ہو جاتیں اور چھٹی دو ڈھائی بجے ہوتی۔ کھانے کا
طریقہ یہ تھا کہ اگر آپ وقت مقررہ پر آ کر اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھے اور ذرا سی بھی دیر ہو گئی ہے تو
آپ کو پہلے سیدھا بڑے فادر کے پاس جا کر معذرت کرنا پڑے گی۔ فادر کی میز ہال میں سامنے
تھی جس کے لیے کئی میزوں کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ میں اکثر لیٹ ہو جاتا۔ فادر کے پاس جا
کر معذرت کرنے سے میری جان نکلتی چنانچہ میں کئی دفعہ بھوکا ہی باہر بیٹھا رہتا۔ جب سب لوگ
کھا کر باہر نکلتے تو میں ان میں شامل ہو جاتا، دو چار بار میں اس وقفہ میں گھر آ گیا، تانگہ تو باہر کھڑا
ہی ہوتا تھا۔ لیکن امی سخت ناراض ہوئیں اور انہوں نے مجھے کھانا نہیں دیا کہ وہیں جا کر کھاؤ،
وہاں پیسے کس لیے دیتے ہیں۔

بچپن ہی سے میرے اندر ایک عجیب طرح کا شرمیلا پن اور دوسروں سے دور رہنے کا
رویہ تھا۔ یہ رویہ میرے حلقہ احباب پر بھی اثر انداز ہوا اور میرے دوستوں کی تعداد کبھی بھی ایک
حد سے آگے نہیں بڑھی، اب مجھے یاد نہیں کہ سکول میں کتنے لوگ میرے دوست تھے، لیکن اس
شرمیلے پن نے کئی بار مجھے بھوکا رکھا، کبھی لیٹ ہو جانے سے کبھی کسی اور وجہ سے، فادر کے پاس
جا کر معذرت کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ گھر جا کر ڈانٹ ہوگئی بار امی کو بتاتا بھی نہ کہ میں بھوکا
ہوں۔ برن ہال میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ تفریح کا بھی بہت اچھا انتظام تھا۔ ہمارے لیے کھیل
کا ایک علیحدہ کمرہ تھا جس میں کھلونے اور پلاسٹک آف پیرس کی طرح کی کئی چیزیں تھیں، جن
سے ہم چیزیں بناتے، اور توڑتے۔ برن ہال میں کسی بھی استاد کے قریب نہ ہو سکا۔ ہمیں تو
میڈم ہی پڑھاتی تھیں اور وہ سب انگریز تھیں۔ عورت ہونے کے باوجود وہ ہم دیسیوں سے
زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی تھیں، پھر زبان کا بھی ایک حجاب تھا برن ہال میں ایک ایسا ڈسپلن

تھا، جو میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں وہاں پڑھتا تھا، روزانہ جانا بھی پڑتا تھا لیکن کوئی شے مسلسل میرے اندر ٹوٹتی رہتی تھی۔ پانچ چھ برس کی عمر ایسی نہیں ہوتی کہ کسی امر کا تجزیہ کیا جا سکے کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے یا نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ احساس ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ میں اکثر دوپہر کھانا وہاں نہیں کھاتا تھا۔ ہال سے باہر کہیں چھپ کر کھڑا ہو جاتا، بھوکا رہتا مگر ڈر کے مارے گھر میں بھی کسی کو نہ بتاتا، بس علیا چاچا کو کسی طرح معلوم ہو جاتا، وہ مجھے اور میرے مزاج کو جس طرح سمجھتے تھے امی بھی نہیں جان سکتی تھیں۔ علیا چاچا سے میری وابستگی سے امی کبھی کبھی چڑ جاتی تھیں، میرا بس چلتا تو میں ایک لمحہ بھی ان سے جدا نہ ہوتا۔ میرے سکول سے آنے تک وہ بھی کارخانے سے آ چکے ہوتے، پھر میں سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ رات کو امی مجھے گھسیٹ کر بستر میں ڈالتیں، میں علیا چاچا، علیا چاچا کرتا، کبھی اس پر تھپڑ بھی پڑ جاتا، جرمن متو کا ڈراوا الگ، میری آنکھ لگ جاتی لیکن رات کو جس وقت بھی میری آنکھ کھلتی، میں چپکے سے بستر سے نکلتا، خاموشی سے سیڑھیوں میں آتا، آگے جرمن متو، خوف سے گھگی بند ہو جاتی، میں رونا شروع کر دیتا اور دھیمی آواز میں کہ امی نہ جاگ پڑیں۔ علیا چاچا، علیا چاچا کا ورد شروع کر دیتا۔ علیا چاچا جیسے انتظار میں ہوتے، شاید دوسری یا تیسری آواز پر دوڑتے ہوئے آتے، مجھے گود میں اٹھا کر دبے پاؤں نیچے اتر آتے۔ ان کے بستر میں جاتے ہی میرا سارا خوف دور ہو جاتا۔ میں ان سے لپٹ کر ایک ہی لمحہ میں گہری نیند سو جاتا۔

صبح میرے ساتھ ان کو بھی ڈانٹ پڑتی۔ امی چیختیں "جب میں نے کہا ہوا ہے کہ اسے مت لے کر جایا کرو، پھر تم کیوں لے کر گئے"۔

علیا چاچا کچھ نہ بولتے، اپنا کام کرتے رہتے۔ جیسے ہی وہ ادھر ادھر ہوتے، وہ سرگوشی میں مجھے کہتیں "اس کا بستر تو جوؤں سے بھرا ہوا ہے، گندا، بیمار ہو جاؤ گے" میں ان کی طرف دیکھتا ہی نہ، وہ غصہ سے کہتیں "ٹھیک ہے جرمن متو پکڑ لے گا تمہیں، پھر مزا آئے گا"۔ جرمن متو

کے خیال ہی سے مجھے جھرجھری آجاتی، خوف کی ایک ٹھنڈی لہر میرے سارے بدن میں دوڑنے لگتی۔ میں اپنے دل میں کہتا، اب کبھی اکیلا سیڑھیوں میں نہیں آؤں گا۔ لیکن اگلی رات سب کچھ بھول جاتا، علیا چاچا...... علیا چاچا، ان کے گرم بستر میں ایک عجیب طرح کی محبت اور سکون تھا، وہ صبح سویرے جب ابھی سب سوئے ہوتے مجھے اٹھاتے، میرا منہ دھلا کر ایپرن باندھتے اور اپنے ہاتھ سے گرم گرم دلیا کھلاتے۔ سکول جانے کے لیے تیار کرتے اور اس دوران کچھ نہ کچھ مجھے کھلاتے ہی رہتے۔ امی مسلسل انہیں اور مجھے ڈانٹتی رہتیں۔ جرمن منتو، جرمن منتو کا ورد اجاری رہتا، اتنے میں نیچے سے تانگے والے کی آواز آتی، علیا چاچا مجھے لے کر نیچے اترتے اور گلی میں سے گزر کر سڑک پر آتے، مجھے تانگے میں بٹھاتے اور جب تک تانگہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا، وہیں کھڑے رہتے، دن بھر منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے کی مشق، دوپہر کو کھانے کی کوفت، چھری کس ہاتھ میں، کانٹا کدھر، چھری کانٹے کی پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز نہ آئے۔ کھانے میں لوبیا تو روزانہ ہوتا، کسی دن چاول، کسی دن مچھلی، ہر چیز پھیکی پھیکی سی، کھانے کے دوران بولنے کی ممانعت تھی۔ جیسے ہی بڑے فادر کھا کر کھڑے ہوتے، سب کے لیے، کھانا مکمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، کھڑا ہونا ضروری تھا۔ سب سے پہلے بڑے فادر اور ان کے ساتھی ہال سے نکلتے، ان کے بعد میزوں کی ترتیب سے ہم سب باہر آتے، پہلے آخری میز والے، سب سے آخر شروع والے، عموماً ہم چھوٹی کلاس والے شروع میں ہونے کی وجہ سے آخر میں باہر نکلتے تھوڑی دیر بعد گھنٹی بج جاتی اور وہی ریں ریں۔

اتوار کو دنیا ذرا مختلف لگتی، ایک تو دیر تک سونا، علیا چاچا تو حسب معمول مجھے صبح سویرے ہی ناشتا کروادیتے، لیکن میں دوبارہ سو جاتا۔ اتوار کو سب کو چھٹی ہوتی۔ والد صاحب عموماً گیلری میں بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ امی اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر والد مجھے امیرا کدل لے جاتے، علیا چاچا بھی اکثر ساتھ ہوتے۔ میں جی بھر کے کھلونے اور مٹھائیاں

خریدتا۔ آتے آتے شام ہوجاتی اور پھر وہی ہفتہ بھر کا معمول۔ کسی کسی اتوار کو سب لوگ ڈل کی طرح نکل پڑتے۔ معلوم نہیں اب ڈل کیسا ہے۔ میں اب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے پانی کا ایک بڑا سا تھال نظر آتا ہے جس میں چیزیں آہستہ آہستہ رقص کررہی ہیں۔ ڈل قدرت کی صناعی کا ایک عجب تحفہ ہے، ایک طرف نیم دائرے میں سری نگر ہے اور دوسری طرف بلند پہاڑ نیم دائرہ بنائے پانی کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ ڈل میں تیرتے کھیت اور ان پر پھیلا ہوا سبزہ عجب بہار دکھاتا ہے۔ ہاؤس بوٹ، عام کشتیاں، ڈونگے ڈل کی سطح پر محوِ خرام ہیں۔ ہاؤس بوٹ عام طور پر سیاحوں کے استعمال میں رہتے ہیں۔ شہر کے لوگ کشتیوں اور ڈونگوں میں پکنک مناتے ہیں۔ ہم کھانا گھر سے پکا کر لے جاتے اور دن بھر ڈل میں گزارتے۔ ڈل کے پانی کے اندر بھی پودے لہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ڈل یاترا دو ایک مہینوں میں ایک بار ہوتی یا پھر امرتسر سے کوئی مہمان آتا تو ڈل کی سیر ہوتی۔ گھر کے لوگ نہ بھی جاتے تو میں مہمانوں کے ساتھ ضرور ہو لیتا۔ امرتسر سے گرمیوں میں اکثر رشتہ دار آتے۔ ان میں سے میری ایک خالہ اور خالو اور ان کے بچے تو ہر سال آتے۔ ایک پھوپھی تو مستقل طور پر جموں میں تھی، باقی دو بھی جموں آتیں تو سری نگر آنا لازمی تھا۔ باہر سے آنے والوں کے لیے ڈل میں تیرتے کھیت ایک عجوبہ تھے۔ یہ کھیت صفوں پر مٹی کی تہیں جما کر بنائے جاتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کھینچ کر بھی لے جاتے ہیں۔ ڈل وہ جگہ ہے جہاں پورے کا پورا کھیت زمین سمیت چوری ہو جاتا ہے، اپنی جگہ بدل لیتا ہے۔ دور سے یوں لگتا ہے جیسے چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہوں اور ہاؤس بوٹ پانی پر تیرتے چھوٹے چھوٹے گھر، جن کی روشنیاں رات کو ڈل کے پانیوں میں منعکس ہوکر سونے کی لہریں بن جاتی ہیں۔

خالو عبدالخالق اور ان کے بیٹے نذیر احمد باقاعدگی سے گرمیوں میں آتے، چند دن ہمارے یہاں قیام کرتے اور پھر آس پاس کے پُر فضا مقامات پر چلے جاتے۔ دونوں ہی ابادان (ایران) میں نوکریاں کر کے آئے تھے اور وہاں سے لائے ہوئے پیسوں سے اب

امرتسر میں اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ یہ لوگ جن دنوں سری نگر آتے، مجھے بھی چھٹیاں ہوتیں، چنانچہ خالہ مجھے بھی ساتھ لے لیتیں۔ میں نے ان لوگوں کے ساتھ پہل گام، اچھا بل اور اسلام آباد کے علاوہ کئی جگہیں دیکھیں اور کئی کئی دن وہاں قیام کیا۔ سری نگر اور اس کے آس پاس جتنی بھی پر فضا جگہیں ہیں ان میں مغلوں کی یادگاریں باغوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ان سب باغوں میں شالا مار لاہور کے طرز کو قائم رکھا گیا ہے، یعنی فوارے اور بارہ دریاں۔

میرے ابتدائی پانچ سال اب دھندلی یادوں کا حصہ ہیں۔ اس دوران جنگ ختم ہوگئی لیکن اس کے اثرات ہر سطح پر برصغیر میں بھی محسوس ہونے لگے۔ سیاسی تحریکوں کو ایک نیا رخ ملا، سری نگر میں نیشنل کانگرس اپنے عروج پر تھی۔ مجھے صرف ایک جلوس یاد ہے۔ اس کی قیادت شیخ عبداللہ کر رہے تھے۔ جلوس امیرا کدل کی طرف سے نواں بازار میں داخل ہوا۔ میں اپنی گلی کی نکڑ پر ایک تھڑے پر کھڑا تھا۔ بازار میں سر ہی سر تھے۔ لگتا تھا لوگوں کا سیلاب آگیا ہے۔ سب سے آگے شیخ عبداللہ ایک گاڑی پر سوار تھے، پھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے۔ دیر تک جلوس گزرتا رہا۔ پھر علیا چاچا میری انگلی پکڑ کر گلی میں آگئے۔ میرے برن ہال میں داخل ہونے سے پہلے یو این او بن گئی تھی۔ ہٹلر اپنی تلخ یادوں کے باوجود رحم کی علامت بن چکا تھا۔ جرمنی کا ہوا ٹوٹ گیا لیکن جرمن متو کی لال انگارہ آنکھیں، ہاتھوں میں بجتے کڑے درمیانی منزل میں مجھے اسی طرح ڈراتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں، میں کے جی ون میں پاس ہو کر اگلی جماعت میں ترقی پا گیا۔ اسی سال کی ایک دوپہر، میں سکول سے واپس آیا تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ مجھے اوپر جانے سے روک دیا گیا اور علیا چاچا نے بتایا کہ اللہ میاں نے مجھے ایک بہن کا تحفہ دیا ہے۔ والد نے حسب معمول اس کی جنم پتری بنوائی اور اعداد و شمار کے حساب سے اس کا نام مشتری رکھا۔ اس زمانے میں میرے خالو عبدالخالق اور خالہ سردار بیگم بھی سری نگر آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس

نام کی بڑی مخالفت کی، امی کا بھی خیال تھا کہ یہ کوئی مناسب نام نہیں لیکن والد نہ مانے۔ ان کے پنڈت دوست کی رائے میں پیدائش کے وقت اور زائچے کے مطابق یہی نام درست تھا۔

۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے وسط تک سری نگر میں جلسے جلوس عام ہو گئے تھے۔ نیشنل کانگرس کے ساتھ ساتھ غلام عباس کی مسلم کانفرس بھی بڑی فعال تھی۔ سکول سے چھٹی کے وقت امیرا کدل میں کئی بار سیاسی ہجوم کی وجہ سے رکنا پڑتا۔ گھر آتے آتے دیر ہو جاتی، امی گیلری سے لگی میری راہ تک رہی ہوتیں۔ میں گلی میں داخل ہوتا تو ان کی جان میں جان آتی۔ تانگہ مجھے اتار کر والد کو لینے چلا جاتا۔ ان دنوں ان کا کام خاصا اچھا تھا۔ وہ چیف ڈیزائنر بن گئے تھے۔ اپنی فیکٹری میں بھی کھڈیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چاچا علیا اب کارخانے سے آکر اپنی فیکٹری میں چلے جاتے۔ ان کا کام بھی بڑھ گیا تھا۔ بس اتوار کا دن ایسا تھا جب سب اکٹھے ہوتے۔ دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے اور شام کو امیرا کدل کی سیر، امی کبھی ساتھ جاتیں، کبھی میں، والد اور علیا چاچا، واپسی پر ڈھیر ساری چیزیں، امی اکثر لڑتیں کہ بچے کو بگاڑ رہے ہو۔ لیکن والد ایک نہ سنتے۔ کسی کسی اتوار کو ڈل کی سیر بھی ہوتی۔

جھیل ڈل کے علاوہ دو اور جگہیں جو ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہیں، درگاہ حضرت بل اور شاہ ہمدان کا مزار ہے۔ ان دونوں جگہ میں امی کے ساتھ جاتا تھا۔ امی کو درگاہوں اور مزاروں پر جانے کا چسکا تھا۔ عموماً جمعرات یا سوموار کو امی، میں اور علیا چاچا کسی نہ کسی درگاہ پر ضرور جاتے۔ شاہ ہمدان اور درگاہ حضرت بل، دریا کے قریب ہیں۔ ان کا ماحول عجب طرح کا پُراسرار اور خاموش ہے۔ خصوصاً شاہ ہمدان کی درگاہ میں ایک اسرار ایسا ہے جو ہر آنے والے میں ایک روحانی لہر دوڑا دیتا ہے۔ قریب ہی ہندوؤں کی بھی پوجا پاٹھ کی جگہ ہے۔ اور بھی کئی متبرک جگہیں تھیں جہاں چراغ جلانے کے لیے تیل ہم گھر سے لے کر جاتے تھے۔ چراغوں کی لوؤں سے اٹھتے دھوئیں، نیم تاریکی میں حرکت کرتے لوگوں کے ہیولے اور پس منظر میں دور کہیں ایک

چاپ، اب بھی میرے اندر موجود ہے۔

سری نگر کے آس پاس کے پرفضا مقاموں، یا علیا چاچا کے گاؤں کے سفر کے علاوہ دو اور سفر مجھے یاد ہیں، سری نگر سے راولپنڈی تک بس کا تکلیف دہ سفر اور پھر ٹرین کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، جو امرتسر جا کر ختم ہوتا تھا۔ پہلا سفر تو بہت دھندلا سا ہے، دادا جان کی وفات پر ہم بھی آئے تھے۔ دوسری بار امی اور میں تھے۔ مان سنگھ کے کڑے میں ددھیال تھا اور چوڑوں والے دروازے میں ننھیال، جہاں خالہ کے علاوہ دونوں ماموؤں کے گھر بھی تھے۔ امرتسر میں ایک باغ ساذ بن میں آتا ہے لیکن یہاں کی یادیں بس خیال سا ہیں۔ ایک دھندلکا سا۔

اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے علاوہ جو پہلا اجنبی نام میرے شعور کا حصہ بنا وہ غالب کا تھا۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلہ پر قالینوں کا ایک کارخانہ تھا جس کے منیجر حبیب اللہ تھے ان کا تعلق امرتسر سے تھا۔ غیر شادی شدہ تھے اور کارخانے ہی میں رہتے تھے۔ خود تو شاعر نہ تھے لیکن شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ والد اکثر شام کو ان کے یہاں جاتے، کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ ان ہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار غالب کا نام سنا اور پھر تکرار کے ساتھ۔ والد اور حبیب اللہ جنہیں میں چچا کہتا تھا، اکثر غالب کی شاعری پر بحث کرتے، اُس زمانے میں مجھے غالب کی حیثیت اور ان کی شاعری کی تو کیا شدھ بدھ ہوتی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ غالب کا نام میرے ذہن سے چپک گیا۔ والد کی آواز بہت اچھی تھی اور انہیں گنگنانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ وہ گنگناتے تو اکثر غالب کا نام میرے کان میں پڑتا۔ تحت اللفظ میں بھی وہ اکثر غالب کے شعر پڑھتے۔ غالب کے ساتھ دوسرا نام جس سے میں آشنا ہوا حافظ کا تھا۔ والد فارسی روانی سے بولتے تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے، حبیب اللہ بھی فارسی جانتے تھے۔ ان محفلوں میں اکثر فارسی شاعری پر بھی گفتگو ہوتی۔ شعر پڑھے جاتے، یہیں میں حافظ سے واقف ہوا، یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہیں اور ان کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

۱۹۴۶ء کے آخر تک سیاسی سرگرمیاں عروج کو پہنچ گئی تھیں۔نواں بازار سے اب اکثر جلوس گزرتے تھے۔مختلف سیاسی لیڈروں کے نام فضا میں گونجنے لگے تھے۔لیکن سب سے اہم نام شیخ عبداللہ کا تھا،ان کی نیشنل کانگرس کافی متحرک تھی اور اس کے جلوس اور جلوسیاں اکثر نواں بازار کی خاموشی میں کچھ دیر کے لیے ارتعاش پیدا کر دیتیں،کچھ اور نام بھی اب تواتر سے سنے جانے لگے تھے۔گھر میں اکثر ان کا ذکر ہوتا۔ان میں گاندھی،نہرو اور قائداعظم تھے،مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ قائداعظم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں لیکن والد کی گفتگو،ان کے دوستوں سے جو کچھ سنتا تھا اس سے میرے دل میں قائداعظم کا ایک احترام قائم ہو گیا تھا۔ایک دن والد ایک اخبار لے کر آئے جس میں قائداعظم کی تصویر چھپی تھی۔ان دنوں میرے خالو عبدالخالق بھی امرتسر سے آئے ہوئے تھے۔والد اور وہ دیر تک قائداعظم کی باتیں کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء شروع ہو گیا تھا اور قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور افسردگی تھی۔جلسے جلوس بڑھ گئے تھے۔والد نے تانگہ بان کو خاص طور پر ہدایت کی کہ آتے جاتے راستے میں کہیں رکنا نہیں،کہیں راستہ بند ہو تو انتظار نہیں کرنا متبادل راستے سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔مجھے ان کی باتیں سمجھ نہ آتیں کہ آخر اچانک اتنی احتیاط کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔اب اتوار کو امیراکدل جانا بھی کبھی کبھار ہو گیا تھا۔گھر میں جو باتیں ہوتیں وہ میری سمجھ سے بالاتر تھیں،علیا چاچا کو خاص طور پر کہا گیا کہ مجھے لے کر کہیں دور نہیں جانا اب کے سردیوں میں میری سرگرمیاں گلی تک محدود ہو گئیں،برف باری رک جاتی تو گھر سے نکلتا دوسرے بچے بھی آ جاتے،ہم لوگ گھروں کے سامنے بیٹھ کر برف کے بت بناتے،توڑتے،پھر بناتے،اُن ہی ساتھیوں میں ایک وہ بھی تھی جس کا کوئی نام نہیں،وہ ہمیشہ ہر دور میں میرے آس پاس رہی ہے اور میں ہمیشہ اس کے قریب جا کر اس سے دور ہو جاتا ہوں۔اب مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا،میں گیلری میں کھڑے ہو کر اسے دیکھتا اور وہ بھی صحن میں آ کر

مجھے آوازیں دیتی۔

برف کے بت بناتے توڑتے سردیاں بیت گئیں۔ بادام کے درختوں پر سفید پھول کھل اٹھے لیکن اس بار ہم بادام وری کا لطف اٹھانے کسی باغ میں نہیں گئے۔ امرتسر سے بھی کوئی نہیں آیا، حتیٰ کہ میری خالہ جو ہر سال باقاعدگی سے اپنے اہل خانہ کے ساتھ سری نگر آتی تھیں، اس سال نہ آئیں۔ معلوم ہوا کہ امرتسر کے حالات ٹھیک نہیں۔

میں اب کے جی ٹو میں تھا۔ سکول سے گھر آتے ہی ایک کھلونا مشتری تھی جواب کچھ کچھ پہچاننے لگی تھی۔ گود میں آنے کے لیے لپکتی تھی۔ نیچے اترنے اور گلی میں جانے کے لیے اجازت لینا پڑتی تھی، البتہ مشتری کے آنے سے میرے علیا چاچا کے پاس جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی، اب میں ان کے پاس سوتا تھا۔ صبح وہی مجھے ناشتا دیتے اور پھر سکول جانے کے لیے گلی کی نکڑ تک ساتھ آتے اور تانگہ میں بٹھا کر اتنی دیر وہیں کھڑے رہتے جب تک تانگہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ سکول میں، میں اب دوسری جماعت کا طالب علم تھا لیکن میرا شرمیلا پن اُسی طرح تھا۔ دوپہر کو کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میں معذرت کرنے سے بچنے کے لیے ہال میں نہ جاتا اور بھوکا ہی ادھر اُدھر پھرتا رہتا۔ سلطنت برطانیہ میں جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا سورج اب ڈوبنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ برصغیر کی تاریخ کے ہولناک فساد شروع ہو چکے تھے۔ نہ معلوم کس کی فتح ہوئی تھی اور کون ہارا تھا، لیکن دھرتی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا، اُس زمانے میں ریڈیو کسی کسی گھر میں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بڑا سا ریڈیو تھا جس کے ساتھ گرافون مشین بھی تھی جس پر توے نما ریکارڈ چلتا تھا۔ والد کو سہگل بہت پسند تھا اور اکثر حقہ کے کش لگاتے ہوئے دیر تک سہگل سنا کرتے تھے۔ ریڈیو تو خبروں کے لیے تھا، خبروں کا وقت ہوتا تو محلہ کا محلہ ہمارے گھر امڈ آتا۔ معلوم نہیں ان خبروں میں کیا تھا، جنھیں سن کر آنے والوں کے چہرے اتر جاتے۔

سری نگر فسادات سے بہت دور تھا لیکن جن لوگوں کی محبتوں کے رشتے پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے، ان کی حالت دیدنی تھی، ہمارے اکثر رشتہ دار امرتسر میں تھے، ننھیال میں سے دو ماموں اور دو خالائیں وہاں تھیں، ددھیال میں سے دادی اماں کے علاوہ میرے چچا فاروق، ان کے بیوی بچے اور دو پھوپھیاں وہاں تھیں۔ ایک پھوپھی جموں میں تھیں، وہاں حالات اتنے خراب نہ تھے۔ ان سب لوگوں کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ امی والد کو بار بار کہتیں کہ کہیں سے امرتسر کے حالات معلوم کرو۔ ۱۴ اگست کو برصغیر تقسیم ہو گیا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ ایک ماموں اور ایک خالہ لاہور آ گئے ہیں۔ خالو عبدالخالق اپنے کنبہ کے ساتھ راولپنڈی میں اور دادی اماں، فاروق چچا اور ایک پھوپھی بھی پنڈی آن بسے ہیں اور ایک پھوپھی لاہور ہی میں رہ گئی ہیں۔ اب امی کو یہ فکر کہ کسی طرح پنڈی جا کر عزیزوں سے ملوں اور والد کو یہ اصرار کہ شاید اس وقت وہاں جانا مناسب نہ ہو، وہ لوگ تو ابھی خود پریشانی کا شکار ہیں، ہم لوگ کہاں جا کر رہیں گے۔ حالات کی وجہ سے کاروباری معاملات خاصے متاثر ہو رہے تھے۔ فیکٹری سے تنخواہ تو مل رہی تھی، لیکن وہاں بھی کام ٹھپ تھا۔ والد کی ذاتی فیکٹری کی حالت یہ تھی کہ کافی مال تیار ہو چکا تھا مگر آگے کھپت نہ تھی۔ پنڈی اور آگے آگے جہاں جہاں قالین جاتے تھے رابطے سے باہر ہو چکے تھے۔ حبیب اللہ نے والد کو مشورہ دیا کہ وہ عزیزوں سے ملنے پنڈی چلے جائیں اور کچھ قالین بھی ساتھ لے جائیں، ملاقات بھی ہو جائے گی اور کاروبار بھی، ایک پنتھ دو کاج۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ طے ہوا کہ کچھ قالین اور معمولی سا سامان یعنی کپڑے وغیرہ ساتھ لے لیے جائیں۔ امی نے اپنا زیور بھی ساتھ رکھ لیا کہ ان دنوں لاکر تو ہوتے نہیں تھے اور اتنا زیور کسی کے گھر رکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ علیا چچا سرینگر میں ہی رہیں گے، ایک تو اس لیے کہ وہ بھی فیکٹری میں ملازم تھے۔ اور دوسرے گھر کی دیکھ بھال کے لیے کسی ایک کی ضرورت تو تھی۔ یہ بات میرے لیے پسندیدہ نہ تھی۔ اس وقت اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ امی ابو کے ساتھ پنڈی جانا ہے یا علیا چاچا

کے ساتھ سری نگر میں رہنا ہے تو میں ایک لمحہ سوچے بغیر سری نگر رہنے کو ترجیح دیتا، لیکن مجھ سے کسی نے نہ پوچھا اور ایک صبح ہم الائیڈ چراغ دین کی بس میں، جو میرا کدل سے چلتی تھی، پنڈی جانے کے لیے سوار ہو گئے، قالین اور ایک کپڑوں کا صندوق چھت پر رکھ دیے گئے۔ زیورات کی پوٹلی امی نے بغل میں دبالی۔ والد نے صرف ریڈیو اپنے ساتھ رکھا، اس لیے کہ اس زمانے میں ریڈیو بہت کم تھے اور انہیں خبروں کا چسکا تھا۔ یہ ریڈیو ایک گتے کے ڈبے میں بند کر کے سیٹ کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا۔ ہم تین لوگ تھے لیکن والد نے چار سیٹیں بک کرائی تھیں۔ بس چلنے اور نظروں سے اوجھل ہونے تک علیا چاچا ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ ایک تکلیف دہ سفر تھا، سفر میں امی کی طبیعت بھی خراب ہوتی ہے اور میری بھی۔ ابھی ہم بارہ مولا ہی پہنچے تھے کہ امی نے اُلٹیاں شروع کر دیں، تھوڑی دیر بعد میرا بھی یہی حال ہوا، راستہ میں اوڑی، چناری اور پھر دومیل آ کر بس رکی۔ وہاں چائے پی، اگلا مرحلہ کوہالہ تھا، یہ اُس زمانے میں کشمیر کی سرحد تھا۔ باقاعدہ چیکنگ ہوتی تھی۔ کشمیر میں کئی چیزیں لانے کے لیے یہاں ٹول ٹیکس دینا پڑتا تھا چنانچہ والد نے کسٹم آفیسر کے نام ایک درخواست لکھی کہ میں چند دنوں کے لیے پنڈی جا رہا ہوں اور خبریں سننے کے لیے اپنا ریڈیو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، اسے چیک کر لیا جائے تاکہ واپسی میں مجھے ٹیکس ادا نہ کرنا پڑے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ واپسی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

تار دے دیا گیا تھا۔ پنڈی میں الائیڈ چراغ دین کا اڈہ کشمیر روڈ پر تھا، خالو عبدالخالق اور ان کے بڑے بیٹے نذیر احمد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ امرتسر سے بچ بچا کر پنڈی پہنچ گئے تھے اور نانک پورہ میں آن ٹھہرے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ گھر میں تین چار بچے تھے لیکن مجھے ٹوٹی پھوٹی اردو نما پنجابی کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا۔ کشمیری وہ سمجھتے نہیں تھے، چنانچہ مجھے اپنا آپ اکیلا اکیلا سا لگا اور پھر یہ کہ میں ابھی تک علیا چاچا سے علیحدگی کے

صدمہ سے بھی باہر نہ نکل سکا تھا، صبح اٹھتے ہی میں نے امی سے پوچھا، واپس کب جائیں گے؟
دوسرے یا شاید تیسرے دن پنڈی سری نگر روڈ بند ہوگئی۔ لڑائی شروع ہو چکی تھی،
علیا چاچا اور سری نگر اُس طرف رہ گئے، والد اور امی کو مرتے دم تک یقین تھا کہ وہ ضرور واپس
جائیں گے، لیکن سری نگر کو دوبارہ دیکھنے کی حسرت لیے وہ دنیا ہی سے چلے گئے اور میں، علیا چاچا
مجھے دوبارہ مل تو گئے، لیکن سری نگر، وہ میرے اندر ہی رہ گیا، اب سری نگر بالکل بدل گیا ہوگا۔
لیکن میرا سری نگر تو میرے اندر موجود ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کردوں تو اس کی
گلیوں بازاروں میں پہنچ جاتا ہوں۔ شاہ محلہ کی لمبی تنگ گلی، نواں بازار اور گلی کے سامنے صحن میں
وہ ایک بے نام، بے چہرہ خواب، جسے لکڑی کے چھجے میں کھڑا، میں اب بھی دیکھ رہا ہوں۔

O

پنڈی آکر دو چار دن تو مہمان داری میں گزر گئے۔ چچا اور پھوپھی نے کرشن نگر میں
ڈیرا جما لیا تھا، دو ایک دن ان کی طرف رہے۔ اس دوران کشمیر کی صورت حال بگڑتی گئی اور فوری
واپسی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ خالو عبدالخالق نے اوپر والا ایک کمرا ہمیں دے دیا۔ یہ گھر ایک
گوردوارا تھا۔ اُس وقت آس پاس کئی شاندار گھر خالی تھے لیکن خالو کا خیال تھا کہ اس ابتلا میں
اکٹھے رہنا بہتر ہے، انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک وقت آئے گا جب ایک ایک انچ جگہ کے لیے
جھگڑے ہوں گے۔ ساتھ لائے ہوئے قالین بکنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ آٹھ دس قالین
تھے۔ دو تین رشتہ داروں میں بٹ گئے ایک ماموں لاہور میں ہی رک گئے تھے دوسرے کالج
روڈ پر آن بسے۔ ایک ایک قالین ہر گھر میں تقسیم ہو گیا، باقی دو چار اونے پونے بکے، کچھ عرصہ ان
سے گزارا چلتا رہا۔ والد قالینوں کے ڈیزائنر تھے اور فی الحال قالینوں کی فیکٹری قائم ہونے کے
کوئی آثار نہ تھے۔ خالو نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ گنج منڈی میں کریانہ کی دوکان کھول لیں۔ بچے
کھچے پیسے سے ایک دوکان لی گئی اور والد کریانے کا سامان لے کر وہاں بیٹھ گئے۔

اب سکول میں میرے داخلہ کا مرحلہ آیا۔ مشکل یہ پیش آئی کہ مجھے کشمیری کے علاوہ صرف ٹوٹی پھوٹی اردو نما پنجابی آتی تھی۔ انگریزی واجبی سی تھی اتنی ہی جتنی کے جی ٹو کے بچے کو آنا چاہیے۔ مجھے جس سکول میں لے کر جاتے وہ کہتے پہلے اسے اردو سکھا کر لاؤ۔ اُس زمانے میں کشمیری بازار میں ایک طرف گھر اور دوسری طرف لمبی دیوار تھی جو روز سینما سے شروع ہو کر نا ولٹی پر ختم ہوتی تھی۔ اس دیوار پر مختلف قسموں کے اشتہار لکھے جاتے تھے۔ والد روز مجھے ساتھ لے جاتے اور ایک طرف سے شروع کر کے اشتہاروں کے ہجے اور تلفظ سکھاتے جاتے گھر میں بھی کشمیری کی بجائے اردو اور پنجابی بولنے لگے۔ خالو عبدالخالق جو نچلی منزل میں رہتے تھے، ان کے گھر والے تو بولتے ہی پنجابی تھے، چنانچہ چند ہی دنوں میں مَیں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں سے آشنا ہو گیا۔ ہمارا گھر نانک پورہ کا آخری گھر تھا، اس کی دیوار سے کھیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا جس کے دوسری طرف موہن پورہ تھا، یہیں ایک سکول میں جس کا نام پاکستان گرلز ہائی سکول تھا مجھے تیسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی ہیڈ مسٹریس مبارک بانو تھیں، ان کے خاوند سی ایم اے میں کام کرتے تھے۔ یہ بے اولاد تھے، معلوم نہیں کیسے میں ان کی نظروں میں آ گیا اور وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرنے لگے۔ سکول کے بعد اکثر مجھے روک لیتے۔ ان کی رہائش سکول کے اندر ہی تھی۔ کھانا کھلا کر بھیجتے، دیر ہو جاتی تو ان کا نوکر مجھے گھر چھوڑنے آتا۔ بنیادی طور پر تو یہ لڑکیوں کا سکول تھا جس میں لڑکے صرف پانچویں جماعت تک پڑھتے تھے، لیکن میں آٹھویں جماعت تک وہاں پڑھتا رہا۔ چھٹی سے آٹھویں تک میں سکول میں ایک ہی لڑکا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے شرمیلے پن کی وجہ سے سب لوگ مجھے لڑکی جیسا ہی سمجھتے تھے، اور سچی بات ہے سوائے اپنی استانیوں کے میں نے اپنی کسی کلاس فیلو کے بارے میں کسی بھی حوالے سے کچھ سوچا ہی نہیں۔

اپنی استانیوں سے مجھے ایک اور ہی طرح کا لگاؤ تھا، معلوم نہیں کیوں زندگی بھر مجھے

زیادہ عمر کی عورتوں سے عشق رہا ہے۔ عام طور پر جو لوگ ماں کی محبت سے محروم ہوتے ہیں وہ mother fixation کا شکار ہوتے ہیں لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔ میری ماں مجھے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی، اتنا زیادہ کہ اس میں کسی دوسرے کی شرکت بھی اسے گوارا نہ تھی، اس possessive love کی وجہ سے میرا اُن کا رشتہ love hated کا ہو گیا تھا، لیکن ماں ہمیشہ میرے ساتھ رہی پھر بھی مجھے مامتگی کی کمی محسوس ہوتی رہی شاید ان بڑی عمر کی عورتوں میں، میں اسی کو تلاش کرتا تھا۔ میری ان استانیوں میں سے دو تین بڑی خوبصورت تھیں۔ میں چپکے چپکے ان کے نام محبت بھرے خط لکھتا اپنی کاپی میں، اور انہیں چھپا کر رکھتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یہ خط ایک میڈم کے ہاتھ آ گیا۔ یہ خط تھا بھی اسی کے نام۔ میرا ڈر کے مارے برا حال تھا، وہ خط پڑھ کر ہنس پڑیں اور میرے گال کو تھپتھپا کر بولیں آئندہ نہ کرنا۔ آئندہ میں نے کاپی میں تو خط نہ لکھا لیکن لکھ کر پھاڑ دیتا۔ بہت دن گزر جاتے تو میں خود ہی کسی خط کا جواب اپنے نام لکھتا، کئی کئی دن اس کے مزے لیتا اور پھر خاموشی سے اسے پھاڑ دیتا۔ انہی چھوٹی موٹی خوشیوں میں زینہ زینہ چڑھتا میں آٹھویں میں آ گیا۔ اب اس سکول میں میرا رہنا ممکن نہ تھا، چنانچہ مبارک بانو کے نہ چاہنے کے باوجود مجھے سکول چھوڑنا پڑا۔ چند دن مشن ہائی سکول میں رہا جو فوارا چوک میں تھا، لیکن امی کو وہاں کا ماحول پسند نہ آیا چنانچہ انہوں نے مجھے ڈینیز ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔ ڈینیز ہائی سکول صدر میں تھا اور اس کا شمار شہر کے بہترین اداروں میں ہوتا تھا۔ میں نے 1955 میں وہیں سے میٹرک کیا۔ ڈینیز ہائی سکول میں میرے دوستوں میں نثار اور ابراہیم بہت قریب تھے، دونوں گوالمنڈی میں رہتے تھے۔

والد قالین کے رنگوں نقشوں اور ان کی باریک بینیوں سے تو واقف تھے لیکن کریانہ فروشی کے گر نہیں آتے تھے۔ اُن کے لیے دکان پر بیٹھنا خاصا مشکل تھا۔ تاہم دکان سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے گھر کا خرچہ چل جاتا۔ اپنی سہولت کے لیے انہوں نے ایک شخص کو

ملازم رکھ لیا۔ اس شخص نے آہستہ آہستہ سارا کام سنبھال لیا۔ والد کے معمولات میں فرق آ گیا، وہ دیر سے دکان پر جاتے، کچھ دیر بیٹھتے، پھر دوپہر کا کھانا کھانے گھر آ جاتے اور لمبا قیلولہ کرنے کے بعد واپس جاتے، خاموشی اور آہستگی سے نقصان ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آڑھتیوں کی اتنی رقم چڑھ گئی کہ دکان اور اس کا سامان بیچ کر ادائیگی ہوئی۔ والد فارغ ہو گئے، اس دوران خالو عبدالخالق فوت ہو گئے۔ وہ مروت والے اور آنچ کھانے والے شخص تھے، ان کی موجودگی میں کبھی احساس نہ ہوا کہ اس مکان میں دو کنبے رہتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ حالات خراب ہونے لگے۔ نذیر احمد کے بچوں کی تعداد بڑھی تو جگہ کی قلت کا احساس ہونے لگا۔ ہمارے گھر میں بھی ایک نیا مہمان آ گیا، میری بہن عشرت، اس بار یہ نام امی نے رکھا کہ اب والد کے جوتشی پنڈت موجود نہ تھے۔ انہوں نے اپنے طور سے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح علیا چاچا کو کوائف بھیج کر جنم پتری بنوائی جائے لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ کاروبار کے نقصان نے گھر میں تلخی کی فضا پیدا کر دی تھی اور میں نے پہلی بار امی اور والد کے درمیان کھچاؤ کی فضا محسوس کی، جس کا نتیجہ آئے دن کی تلخ گفتگو کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے سامنے لدھیانے سے ایک خاندان آ کر آباد ہوا تھا، یہ سنار تھے، ان کا ایک لڑکا محبوب میرا ہم عمر تھا، مشن سکول میں پڑھتا تھا، شام کو کچھ دیر کے لئے اس سے گپ شپ ہو جاتی۔ ہمارا کھیل پٹھو گرم تھا، کچھ لڑکے جمع ہو جاتے تو ہم گلی میں جو سڑک جتنی چوڑی تھی، پٹھو گرم کر لیتے، مجھے یہیں تک جانے کی اجازت تھی، امی کی محبت نے مجھے قیدی کی طرح زنجیریں پہنائی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو سکول تک میرے ساتھ جاتیں اور سارا عرصہ کلاس روم کے باہر بیٹھی رہتیں۔ شام کو اس کھیل کے دوران بھی وہ سیڑھیوں پر بیٹھی مجھے دیکھتی رہتیں، کھیلنے کوئی نہ آتا تو میں اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا۔ اس گھر کی صورت یہ تھی کہ اوپر والے حصے کے لیے باہر سے بھی ایک سیڑھی جاتی تھی۔

دراصل یہ گوردوارہ تھا۔ نچلے حصے میں شاید کسی کی رہائش ہوگی ۔اوپر ایک چھوٹا کمرا، اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور پھر پورے گھر پر ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں سنگ مرمر کا ایک چبوترہ تھا، جس پر گنبد بھی تھا۔ جوگندر پال جب پنڈی آئے تو میرے یہاں ہی قیام کیا، ان کا بستر اسی ہال میں تھا۔ چھوٹے کمرے کے اوپر ایک اور چھوٹا کمرا تھا اور اتنا ہی برآمدہ، ہال کی چھت اس کے برابر آتی تھی ۔جب ہم پنڈی آئے تو ہمیں یہی دو کمرے دیے گئے۔ میں پہلی بار ہال میں داخل ہوا تو ایک عجب قسم کی پراسرار خاموشی نے مجھے اپنی بغل میں دبا لیا۔ ہال میں چاروں طرف فینسی روشنیاں اور چار پانچ فانوس تھے، سارے فرش پر کتابیں تھیں، میں نے دیکھا، عجب طرح کی زبان تھی ،بعد میں معلوم ہوا کہ گرمکھی میں ہیں ۔بہت دنوں تک ہال کی یہی حالت رہی، پھر کتابوں کو سمیٹ کر دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا۔ان کتابوں کو نیچے والوں نے زیادہ اور ہم نے ذرا کم ردی میں بیچا۔اوپر والے چھوٹے کمرے میں ہم نے اپنا سامان رکھ دیا نیچے والا سونے کا اور برآمدہ باورچی خانہ بن گیا۔عبدالخالق کی زندگی میں ان کی کشادہ دلی کی وجہ سے جگہ کی تنگی کا احساس نہ ہوا، لیکن ان کے مرتے ہی خالہ کا رویہ بدل گیا، کچھ ان کی ضرورت، انہوں نے سب سے اوپر والا کمرا خالی کرانا چاہا، امی نہ مانیں، ان کا کہنا تھا کہ سامان ہال میں نہیں رکھا جا سکتا بس اس سے ایک ایسی تلخی نے جنم لیا، جو ہمارے اس گھر کو چھوڑ کر گلستان کالونی میں آنے تک موجود رہی بلکہ کبھی تو اتنا بڑھ جاتی کہ روزانہ کی گفتگو بھی ختم ہو جاتی۔

سرینگر سے آنے کے بعد میری زندگی میں جو کمی آئی تھی وہ علیا چاچا کی تھی ۔شروع شروع میں تو انہیں یاد کر کے روتا رہتا تھا، رات کو مجھے نیند نہ آتی ۔امی کے پاس مشتری ہوتی، میں والد کے ساتھ سوتا، مجھے لگتا میں محبت کے سائبان سے محروم ہو گیا ہوں، بار بار علیا چاچا کا ذکر کرتا کہ وہ کب آئیں گے، امی کبھی تسلیاں دیتیں، کبھی میرے بار بار پوچھنے پر چڑ جاتیں اور ڈانٹ پڑتی، زیادہ ضد کرتا تو ایک آدھ تھپڑ بھی پڑ جاتا، اس دوران کشمیر کے حالات بہت خراب ہو گئے

باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی اور پھر پنڈی سرینگر روڈ چکوٹھی کے مقام پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ کشمیر اُدھر رہ گیا، مسئلہ ہمارے پاس آ گیا۔ کچھ بے یقینی، کچھ ڈر اور کچھ اکلوتا ہونے کی وجہ سے امی کی گرفت مجھ پر بڑی سخت تھی، وہ جتنی محبت مجھ سے کرتی تھیں اتنا ہی ان کا ملکیتی رویہ بڑھتا جاتا جس کی وجہ سے مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مالی حالات کی وجہ سے والد گھر سے لاتعلق سے ہوتے جا رہے تھے، گھر میں امی، سکول میں استانیاں، بڑی استانی مبارک بانو کی شفقت بھی ضرورت سے زیادہ، چاروں طرف لڑکیاں، میری شخصیت دب کر رہ گئی۔ میں اپنی ذات کے اندر گھستا گیا، میری آزادی گھر کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ جہاں بیٹھے بیٹھے اداسی سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا۔ ۱۹۴۸ کے ستمبر کی ایک شام میں اداسی کی بکل میں لپٹا سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ دو شخص باتیں کرتے گزرے۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم مر گئے ہیں۔ میں نے رونا شروع کر دیا، مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس رونے کے پیچھے کیا جذبہ تھا۔ بس میں بے اختیار روئے جا رہا تھا۔ ایک عورت پاس سے گزری، مجھے روتے دیکھ کر رک گئی، پاس آئی اور بولی ”بچے کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو؟“

میں نے ہچکی بندھی آواز میں کہا ”قائداعظم مر گئے ہیں“۔ اُسے شاید میری بات سمجھ نہ آئی، کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی...... ”تمہارے کیا لگتے تھے؟“

میں کچھ نہ بولا، بولتا بھی کیا، بس روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آواز پڑی، آنسو پونچھتا ہوا اوپر گیا...... ”امی قائداعظم مر گئے“ ”ہاں مجھے معلوم ہے“ انہوں نے بغیر کسی تاثر کے کہا...... ”چلو سکول کا کام کرو“ قائداعظم کی رحلت کے بعد سیاسی نظام کی ابتری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے، قائداعظم نے ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو سرحد میں ڈاکٹر خان کی اسمبلی کو برطرف کر دیا، لیکن بعد والوں نے اسے معمول بنا لیا۔ قائداعظم کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے، وہ طبعاً شریف اور ڈھیلے آدمی تھے اس لیے اختیار کی مرکزیت لیاقت علی خان کے ہاتھ

میں آ گئی۔ لیاقت علی خان نے نئے سیاسی نظام کی جو اخلاقیات مرتب کیں وہ ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر بن گئیں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مہاجر مقامی کا جھگڑا کھڑا کیا اور یوں علاقائی عصبیت کی بنیاد رکھی۔ 1949ء میں پنجاب میں نواب ممدوٹ کی وزارت کو برطرف کر کے سیاسی شطرنج کی سمت متعین کر دی۔ لیاقت علی خان ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلم لیگ میں وزیراعظم اور صدر کے عہدے کو ایک کر کے وزاتِ عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ پر ذاتی گرفت مضبوط کر لی۔ لیاقت علی خان کے دورِ وزارت میں بلدیاتی الیکشن ہوئے۔ کشمیری بازار میں تحصیل کے دفتر میں عورتوں کا پولنگ بوتھ تھا۔ امی اپنا ووٹ ڈالنے گئیں تو مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔ اندر ایک ہنگامہ تھا۔ امی نے مجھے باہر کھڑا کر دیا اور ووٹ ڈالنے اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئیں اور بتایا کہ ان کا ووٹ تو پہلے ہی ڈالا جا چکا ہے اور اندر قصائی گلی کی طوائفوں کا قبضہ ہے۔ مسلم لیگ نے طوائفیں اور غنڈے جمع کر کے پولنگ بوتھوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ دس بجے کے لگ بھگ الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان ہو گیا اور ساری مخالف جماعتوں نے زبردست نعرے بازی کے بعد جلوس نکالا۔ جلوس فوارا چوک میں پہنچ کر جلسہ کی صورت اختیار کر گیا۔ امی مجھے لے کر گھر آ گئیں۔ اس پہلے الیکشن میں مسلم لیگ نے جس دھاندلی کی بنیاد رکھی وہ روایت ابھی تک قائم ہے۔ مسلم لیگ نے ملک ضرور بنایا لیکن اس کی بربادی کی بنیاد بھی اسی جماعت نے رکھی اور اس کی بنائی ہوئی روایتوں کا مزا ہم ابھی تک چکھ رہے ہیں۔ اس جماعت کو ۱۴ اگست کی رات کو جو فیصلے کرنا چاہیے تھے وہ آج تک نہ ہو سکے۔

ایک عرصہ تک یہ تاثر رہا ہے کہ جنرل گریسی نے جو پہلے کمانڈر انچیف تھے قائداعظم کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں مداخلت سے انکار کر دیا تھا۔ حال ہی میں سکندر مرزا کے بیٹے کی یادداشتیں چھپی ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جنرل گریسی نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ انھوں نے سکندر مرزا کے ذریعے جو اس وقت

سیکرٹری تھے لیاقت علی خان کو پیش کیا تا کہ وہ قائداعظم سے اس کی منظوری لیں لیکن لیاقت علی خان نے اس منصوبہ کو دبا لیا۔ اسلم بیگ جن دنوں آرمی چیف تھے، 1948ء کی جنگ کشمیر کے حوالے سے تین سیمینار ہوئے، جن کا مقصد ان غلطیوں اور خامیوں کا اندازہ لگانا تھا جو اس جنگ میں سرزد ہوئیں۔ یہ تو ظاہری مقصد تھا ممکن ہے پس پردہ کچھ اور باتیں بھی ہوں۔ بہر حال یہ سیمینار آئی ایس پی آر کے زیر اہتمام ہوئے۔ میں ان میں سے دو میں شریک ہوا۔ دوسرے سیمینار میں جو مظفر آباد میں ہوا، میرے ساتھ ایوب مرزا اور جلیل عالی بھی تھے۔ سیمینار میں غلام عباس کے سیکرٹری نے سٹیج پر آ کر بتایا کہ غلام عباس جنگ میں شدت چاہتے تھے، وہ اس سلسلے میں قائداعظم سے ملے اور انہوں نے قائداعظم کو قائل کر لیا کہ پاکستانی فوج کو کشمیر میں براہ راست مداخلت کر کے سرینگر پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ میٹنگ میں طے ہوا کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں اس پر عمل کیا جائے گا، لیکن اڑتالیس گھنٹوں بعد بھی جب کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو غلام عباس نے دوبارہ رابطہ کیا، معلوم ہوا کہ قائداعظم نے تو احکامات صادر کر دیے تھے، لیکن درمیان میں کسی نے انہیں دبا لیا، یہاں تک کہ بھارتی فوجیں سرینگر کے اڈے پر اتر گئیں۔ یہ ''درمیانی سلسلے'' پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی وجود میں آ گئے تھے۔

لیاقت علی خان کی کشمیر پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے جنرل اکبر کی سرکردگی میں چند فوجی افسروں نے جو لائحہ عمل اختیار کرنے کی کوشش کی وہ ''پنڈی سازش کیس'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سال یعنی پنڈی کیس کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندیاں عائد کر کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اسی دوران اگرچہ لیاقت علی خان نے نہرو کو مکا دکھا کر اپنے خلاف لگائے گئے ان الزامات کو کہ ان کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے، رد کرنے کی کوشش کی لیکن یہ مکا ہوا ہی میں لہراتا رہ گیا۔ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت باغ میں جو اُس وقت تک کمپنی باغ کہلاتا تھا وہ جلسہ ہوا جس میں لیاقت علی

خان سید اکبر کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ میری عمر اُس وقت گیارہ سال اور چھوٹی بہن مشتری کی پانچ سال تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی گھر سے نکلے تو ہمارے پاؤں میں اسفنج کی چپلیں تھیں۔ لوگ جوق در جوق کمپنی باغ کی طرف جا رہے تھے۔ لگتا تھا ایک میلہ سا ہے۔ ہم دونوں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ کمپنی باغ پہنچ گئے۔ جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا، ہم دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ کھسکتے سٹیج کے قریب آ گئے۔ دوسری یا تیسری قطار میں پھنس پھنسا کر بیٹھ گئے۔ لیاقت علی ابھی نہیں آئے تھے اور دوسرے مقررین کی تقریریں جاری تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جلسہ گاہ میں آ گئے، سٹیج سے اعلان ہوا کہ اب وہ تقریر کریں گے۔ مائیک پر آ کر ابھی انھوں نے برادران ملت ہی کہا تھا، ملت کی ت ابھی ان کی زبان پر ہی تھی کہ سب سے اگلی قطار سے ایک شخص کھڑا ہوا تڑ تڑ کی دو یا تین آوازیں آئیں۔ جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ کمپنی باغ کے میدان کے وسط میں جگہ نیچی ہے اور دونوں کنارے اونچے ہیں، ہم نیچے والے حصے میں تھے۔ بھگدڑ مچی تو ہم بھی بھاگے لیکن کنارے کے ساتھ لگ کر گر گئے۔ لوگ ہمارے اوپر سے گزرنے لگے۔ یوں لگا ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک پٹھان ہمارے اوپر جھک گیا اور چیختے ہوئے بولا........"او خنزیر کے بچو! ان معصوم بچوں کو مت کچلو" معلوم نہیں کیسے اس نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو وہاں سے نکال کر اوپر کیا۔ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ہم فوارہ چوک کی طرف بھاگے۔ لیاقت باغ کی طرف ایک عجب افراتفری تھی۔ اس دوران میں نے ایمبولینس کا سائرن سنا جو مری روڈ کی طرف مڑ رہی تھی، شاید لیاقت علی کو سی ایم ایچ لے جایا جا رہا تھا۔ فوارہ چوک تک دوڑتے دوڑتے ہمارا برا حال ہو گیا۔ پاؤں ننگے، چپلیں میدان میں رہ گئی تھیں، برے حالوں گھر پہنچے تو امی نے آڑے ہاتھوں لیا، بہن کو تو کیا کہنا تھا ساری ڈانٹ مجھے پڑی۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ لیاقت علی خان شہید ہو گئے ہیں۔

لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے۔ وہ طبعاً کمزور شخص

تھے۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے گورنر جنرل کا منصب سنبھال لیا۔ 19 اپریل 1953 کو انہوں نے ناظم الدین کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور کچھ عرصہ بعد 24 اکتوبر 1954 ء کو قومی اسمبلی برطرف کر دی۔ اس سے پہلے 29 مئی 1954 کو مشرقی پاکستان اسمبلی کو گورنر کے ماتحت کر کے سکندر مرزا کو گورنر بنا دیا گیا۔ مولوی تمیز الدین نے جو اُس وقت قومی اسمبلی کے سپیکر تھے، عدالت میں غلام محمد کے حکم کو چیلنج کیا لیکن جسٹس منیر نے نظریہ ضرورت کی اصطلاح تلاش کر کے یہ اپیل خارج کر دی جبکہ ہائیکورٹ کے جسٹس کارنیلس اسے منظور کر چکے تھے۔ نظریہ ضرورت کی اس اصطلاح نے بعد میں ہر مارشل لا کو قانونی جواز دینے کی راہ ہموار کر دی۔ غلام محمد نے لیاقت علی خان کے آمرانہ نظام کو مزید آمرانہ اور شخصی بنا دیا۔ یہ شخص تو تلا تھا، اسی دوران اس پر فالج کا حملہ ہو گیا جس کی وجہ سے زبان میں مزید لکنت آ گئی۔ اس کی بات صرف دو شخص سمجھتے تھے ایک اُس کی جرمن گورنس، دوسرے قدرت اللہ شہاب جو اس کے سیکرٹری تھے۔ اب یہ بات بہت سارے لوگوں نے لکھی ہے کہ ایوب خان جو کمانڈر انچیف بن چکے تھے، جو چاہتے تھے وہ کہلوا لیتے یعنی ان کی منشاء و مرضی کے مطابق جرمن گورنس اور شہاب کہتے کہ گورنر جنرل یہ چاہتے ہیں یا یہ ان کا حکم ہے۔ امریکی مداخلت شروع ہو چکی تھی اور سی آئی اے کی تائید سے ایوب خان مارشل لاء لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شاید اس عمل میں کچھ دیر لگتی لیکن خان عبدالقیوم خان کے جلوس نے سیاسی شاطروں کو چوکنا کر دیا۔ ان کے والہانہ استقبال سے مستقبل کا سیاسی نقشہ واضح ہو گیا۔ چنانچہ 1958ء میں پہلا مارشل لاء پاکستان کا مقدر ہوا۔ میں اُس وقت اٹھارہ سال کا تھا۔

اس مارشل لاء کے بارے میں لوگوں کو کچھ پتہ نہ تھا، شاید بہت سوں کو اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔ لوگ آئے دن کی بدلتی حکومتوں سے بددل تھے چنانچہ یہ سمجھا گیا کہ مارشل لاء اُن کے مسائل حل کر دے گا۔ اس زمانے میں اکثر چیزیں راشن سے ملتی تھیں اور عموماً بلیک ہوتی

تھیں۔ مارشل لا ءنے ذخیرہ اندوزی پر زد لگائی۔ دکانوں پر لائنیں لگ گئیں۔ راجا بازار میں ایک لمبی قطار میں کھڑے ہوکر میں نے بھی ایک الارم والی گھڑی خریدی جو کئی سال ہمارے پاس رہی۔ امی نے بھی قطار میں کھڑے ہو کر ایک ریشمی سوٹ لیا۔ پاکستانی بہت سیدھے ہیں۔ وقتی طور پر ملاوٹ کے خاتمے، ذخیرہ اندوزی میں کمی ہی پر خوش ہو گئے، ملاوٹ کرنے والوں نے خوف سے لئی کے کنارے نقلی چیزوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ان میں خاص طور پر مرچیں، ہلدی اور چائے شامل تھی۔

اس دوران بلکہ اس سے بہت پہلے ہمارے گھر کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ دوکان بند ہوگئی۔ امی کے چھوٹے زیور بیچ بیچ کر گزارہ ہوتا۔ ہر دفعہ زیور بکتے ہوئے ان کی اور والد کی لڑائی ہوتی۔ کئی کئی دن گھر کی فضا میں عجب طرح کا بوجھل پن پر پھیلائے بیٹھا رہتا۔ یہ لڑائیاں تو اب روز کا معمول تھیں۔ اس دوران میری ایک اور بہن شاہین پیدا ہوگئی۔ اب ہماری صورت یہ تھی کہ والد اور امی کے علاوہ میں اور تین بہنیں گویا چھ افراد اور آمدنی کا ذریعہ ایک بھی نہیں۔ امی کے مزاج کی تلخی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس دوران ایک دفعہ غیر متوقع طور پر علیا چاچا نے سرینگر سے کسی ذریعے سے کچھ رقم بھجوادی، وقتی سہارا تو مل گیا لیکن ان پیسوں کے ختم ہوتے ہی پھر کسی زیور کے بکنے کی باری آگئی۔ اب کسی نہ کسی طرح سال چھ ماہ میں علیا چاچا کا خط آجاتا، وہ مجھے ملنے اور دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ میرے ذہن میں اب ان کا ہیولہ دھندلا پڑنے لگا تھا۔ جیسے جیسے امی اور والد کے تعلقات میں کشیدگی بڑھ رہی تھی، امی کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی، شاید ان کے لاشعور میں یہ تھا کہ اب میں ہی ان کا ایک سہارا ہوں۔ والد نے بال میں سونا شروع کر دیا تھا، امی اور ان میں کئی کئی دن بات نہ ہوتی۔ مجھے وہ ساتھ والی چارپائی پر سلاتیں اور رات کو کئی کئی بار ہاتھ لگا کر دیکھتیں کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔

اسی دوران معلوم ہوا کہ مظفر آباد میں قالینوں کی ایک سرکاری فیکٹری قائم کی جارہی

ہے۔ معراج الدین جو اس فیکٹری کے نامزد منیجر تھے والد کو سرینگر سے جانتے تھے، وہ تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور والد کو ساتھ لے گئے۔ ہم نے پہلی بار ان کی جدائی کو محسوس کیا۔ گھر میں تلخی کی فضا کم ہوگئی۔ والد مظفر آباد سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ بھیج دیتے لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چلا، دو چار سالوں میں ہی فیکٹری کے کیشیر نے ایک لمبا غبن کیا، اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد دو ایک سال فیکٹری اور چلی لیکن اتنے گھاٹے میں کہ ملازمین کو مہینوں تنخواہ نہ ملتی۔ گھر میں وہی صورت پیدا ہوگئی۔ امی کا دکھ غصہ کی صورت میں ہم پر برستا۔ انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ اس لیے گھر کا سارا کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔ نانا خاصے خوشحال تھے۔ شادی ہو کر سری نگر آئیں تو کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی، اب ایک ایک پیسے کو ترستی تھیں۔ گھر کے حالات، امی کی سختی کی وجہ سے میرا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہوگیا اور میں ایک دن گھر سے بھاگ کر مظفر آباد کی بس میں بیٹھ گیا۔

گھر سے بھاگنے کی بڑی اور ایک ہی وجہ گھر کے حالات تھے۔ چیزیں بیچ بیچ کر کب تک گزارا ہوتا۔ زیور تقریباً سارا بک گیا تھا۔ مجھے جیب خرچ کے لیے کچھ نہیں ملتا تھا۔ ڈینیز بائی سکول گھر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ پیدل جانا اور پیدل آنا، آدھی چھٹی کے وقت میرے ہم جماعت کینٹین کا رخ کرتے تو میں حسرت سے انہیں دیکھتا۔ برن ہال کے زمانے میں، امی صبح زبردستی میرے بستے میں مٹھائیاں اور طرح طرح کی چیزیں رکھ دیتیں۔ میں ایک آدھ شے لیتا اور باقی اُسی طرح واپس آجاتیں، اب یہ حال تھا کہ سکول کے دوران پانی کے سوا مکھی تک منہ میں نہ جاتی۔ معلوم نہیں کیسے، مجھے گھر کے برتن چوری کر کے بیچنے کی عادت پڑ گئی۔ اُس زمانے میں گھروں میں پیتل اور تابنے کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ میں کوئی پلیٹ، کبھی چمچ کبھی کوئی اور چھوٹی موٹی چیز چھپا لیتا۔ صرافہ بازار کے آخر میں برتنوں کی دکانیں تھیں، وہ

تول کر یہ چیزیں خرید لیتے۔

امی کو کسی طرح پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھے اتنا مارا کہ جسم پر نیل پڑ گئے۔ پھر خود بھی رونے لگیں۔ ساری رات مجھے تھپتھپاتی رہیں اور روتیں رہیں، ان کے تصورات کا تاج محل یوں برباد ہوا تھا معلوم نہیں انہوں نے میرے لیے کیا کیا سوچ رکھا تھا اور میں ...... میں ایک معمولی چور بن گیا تھا۔ وقتی طور پر میں ماں کے آنسوؤں سے بڑا متاثر ہوا اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی یہ کام نہیں کروں گا، لیکن اپنے ہم جماعتوں کو خرچ کرتے دیکھ کر میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ امی نے چھوٹی چھوٹی چیزیں چھپا کر رکھنا شروع کر دیں، میں بالکل ہی بے بس ہو گیا، اس بے بسی نے میرے اندر ایک شدید ردعمل پیدا کیا۔ میں نے ایک بڑا سا پتیلا اٹھا لیا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کھیت تھے۔ میں نے پتیلے کو ایک کپڑے میں باندھا اور اوپر سے نیچے پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں چپکے سے نیچے اترا اور پتیلا لے کر کھیتوں میں سے ہوتا ہوا صرافہ بازار پہنچا۔ مجھے یاد ہے اُس زمانے میں اس پتیلے کے دس روپے ملے جو بڑی رقم تھی۔ رات تو خیریت سے گزر گئی۔ صبح امی کو کسی ضرورت کے لیے پتیلے کی تلاش ہوئی۔ میرا رنگ اڑ گیا انہیں ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ یہ کام میں نے کیا ہے وہ مجھ پر جھپٹیں۔ میں بازو چھڑا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور سیدھا مظفر آباد والی بس میں جا بیٹھا۔ مظفر آباد چھوٹی سی جگہ تھی۔ تھوڑی دیر میں، میں قالینوں کی فیکٹری میں جا پہنچا۔ والد مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے، لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔
کہنے لگا...... ''کھانا کھایا ہے''

میں نے کہا...... ''نہیں''

انہوں نے بازار سے کھانا منگوایا۔ دو تین دن ایسے محسوس ہوا جیسے جنت میں آ گیا ہوں۔ پھر انہوں نے فیکٹری کے ایک ملازم کے ساتھ مجھے پنڈی واپس بھجوا دیا۔ گھر پہنچا تو امی نے خلاف معمول کچھ نہ کہا۔ مجھے دیکھ کر رونے لگیں، اُس وقت میں ان کے رونے کی وجہ

نہیں سمجھتا تھا بلکہ الٹا غصہ آتا تھا، لیکن اب جب میں ان کی عمر میں پہنچ گیا ہوں مجھے اس رونے کے معنی بھی سمجھ آ رہے ہیں اور اُس دکھ کا احساس بھی ہو رہا ہے جس سے وہ گزر رہی تھیں۔ چند دن بعد پھر وہی صورت پیدا ہوگی۔ امی کے پاس تھا کیا جو مجھے دیتیں اور میرا یہ حال کہ فلمیں دیکھنا چاہتا، نئی نئی کاپیاں اور پنسلیں لینا چاہتا، سکول کینٹین میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ سموسے کھانا چاہتا مگر...... پھر وہی کام شروع ہو گیا۔ پکڑا جاتا، مار پڑتی، میں بھی روتا تکلیف کے مارے اور امی روتیں، ان کا دکھ ان کے اندر تھا۔ ایک ہی بیٹا جو ان کی کل کائنات تھا، برباد ہوا جا رہا تھا۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھیں، نفسیات سے واقف نہ تھیں۔ ان کے نزدیک برائی کو طاقت سے روکنا ہی ایک علاج تھا اور میرے اندر اس طاقت کے خلاف ایک بغاوت پیدا ہو رہی تھی ایک نہ ختم ہونے والی نفرت جنم لے رہی تھی۔

اس طرح کے کچھ چھوٹے چھوٹے دریچے تھے جن سے زندگی کے مختلف منظر کبھی کبھار دکھائی دے جاتے ورنہ اندر باہر وہی ایک موسم تھا، دکھ اور مصیبت کا، مظفر آباد کی فیکٹری بند ہوگئی۔ والد واپس آ گئے گھر کی تلخیوں میں اضافہ ہو گیا۔ والد کو حقہ پینے کی عادت تھی، دو آنے روز تمباکو کے لیے درکار تھے۔ امی سے جب بھی مانگتے تکرار ہوتی کہ ان کے نزدیک یہ کھلی عیاشی تھی۔ مجھے بہت برا لگتا اور والد پر ترس آتا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ تنگ آ کر والد نے لاہور جانے کا ارادہ کر لیا، وہاں قالینوں کا کاروبار پنپ رہا تھا۔ والد لاہور جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ایک شام گھر کی فضا ابر آلود تھی کہ علیا چاچا آ گئے۔ امی کو یہ فکر کہ سری نگر کا گھر کس کے سپرد کر آئے ہیں لیکن علیا چاچا نے ایک ہی جواب دیا کہ میں آپ سب کے بغیر وہاں نہیں رہ سکتا تھا اس لیے سب کچھ اُسی طرح چھوڑ آیا ہوں۔ امی سخت ناراض ہوئیں لیکن والد نے کہا تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ علیا چاچا پھر گھر کے فرد بن گئے۔ چند دنوں بعد والد لاہور چلے گئے۔ علیا چاچا نے کچھ دیر ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کی طالب نویسی کی بھی یہاں

کوئی گنجائش نہ تھی۔ ملازمت کی بھی کوئی صورت نہ تھی، ہمارے محلے میں ایک چودھری صاحب رہتے تھے۔ ان کے ٹرک چلتے تھے۔ انہیں ایک ایسے بااعتبار کلینر کی ضرورت تھی جو انہیں ڈرائیور کی کارکردگی سے باخبر رکھے، علیا چاچا کلینر بن گئے۔ ہفتہ ہفتہ بھر ٹرک کے ساتھ رہتے، ایک آدھ دن پنڈی میں گزرتا تو گھر آتے اور ٹرک میں جو سامان لادا جاتا اس میں سے گھر کے لیے کچھ نہ کچھ نکال لاتے۔ موسمی میوے انہوں نے ہمیں خوب کھلائے۔ پہلی تنخواہ ملی تو سیدھے آ کر امی کے ہاتھ پر رکھی، یوں گھر کی گاڑی پھر آہستہ آہستہ چل پڑی اور قدرے سکون ہوگیا۔

لاہور میں والد نے بہت برا وقت گزارا۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کئی کئی دن فاقہ کرتے۔ انارکلی کے باہر لاہوری سرکلر مین روڈ پر دائیں طرف ایک ہوٹل ہے۔ جہاں پنجابی شاعر بیٹھتے تھے۔ یہاں ان کے کئی شاگرد بن گئے۔ جو ان سے پنجابی شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ ان میں ایک ساگر تھے جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ یہ سارے لوگ شام کو اکٹھے ہوتے تو والد کو دو تین پیالے چائے مل جاتی، مہینوں انہوں نے صرف اسی چائے پر گزارا کیا، کہتے تھے کبھی ایک بند مل جاتا تو عیاشی ہو جاتی لاہور میں ان کی ایک بہن بھی رہتی تھی۔ میرے ماموں اور دو خالاؤں کے گھر بھی تھے لیکن ان کی غیرت نے ایک وقت کے لیے بھی کسی کے گھر جانا گوارا نہ کیا۔ اسی دوران شاہدرہ میں قالین سازی کا ایک کارخانہ قائم ہوگیا۔ انہیں وہاں ڈیزائنر کی جگہ مل گئی اور وہ کارخانے کے قریب ہی شاہدرہ میں منتقل ہو گئے۔ مجھے معلوم نہیں یہاں ان کی تنخواہ کتنی تھی لیکن گھر وہ کبھی کبھار ہی کچھ بھیجتے۔ امی لاہور جاتیں تو ہم لوگ ماموں یا خالہ کے یہاں ہی قیام کرتے۔ امی کچھ دیر کے لیے شاہدرہ آتیں جہاں والد ایک کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ دونوں کے تعلقات میں نامحسوس دوری پیدا ہوگئی تھی۔

علیا چاچا کی وجہ سے فاقوں کی نوبت تو ٹل گئی لیکن امی حالات سے سمجھوتہ نہ کرسکیں۔ ان کے مزاج میں ایک عجب طرح کی تلخی آ گئی تھی۔ میرے ساتھ تو جو ہوتا، علیا چاچا بھی اس کی زد

سے باہر نہ تھے۔ وہ انہیں بھی بری طرح ڈانٹتیں۔ میرا کہیں آنا جانا بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ صرف سیڑھیوں میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ انہی دنوں پانی کی قلت ہوگئی۔ گھروں کے کنوؤں میں پانی کم ہونے لگا۔ کنواں نچلے حصے میں تھا جس پر دو ہینڈ پمپ لگے ہوئے تھے۔ ایک نیچے ایک اوپر، نیچے پانی کھینچا جاتا تو اوپر آنا بند ہو جاتا۔ نیچے والوں سے تعلقات بہت خراب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم اوپر والا حصہ خالی کر دیں تو وہ پورے گھر پر قابض ہو جائیں۔

پینے کے پانی کا مسئلہ تھا۔ ہمارے گھر سے دو چار گھر آگے سرکاری نل تھا جہاں سے سبھی پانی بھرتے تھے۔ وہاں سے تین چار بالٹیاں لانے کی ذمہ داری میری بھی ہوگئی۔ آس پاس کے گھروں کے کئی لڑکے اور لڑکیاں وہاں سے پانی بھرتے تھے۔ ساتھ والی گلی میں ایک تحصیل دار رہتے تھے ان کی لڑکی بھی پانی بھرنے آتی تھی۔ معلوم نہیں کیسے ہم دونوں میں ایک خاموش رابطہ قائم ہوگیا جو تا دیر چلتا رہا۔ ایک دن میں نے ایک خط لکھا اور بالٹی اٹھاتے اٹھاتے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا، لیکن کسی طرح امی کو معلوم ہوگیا۔ اس بار انہوں نے ڈنڈے سے میری مرمت کی۔ باہر جانا بند ہوگیا، پانی لینے وہ خود جانے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تحصیل دار کے گھر جا کر لڑکی کو ڈانٹا اور اُس بے چاری کا نکلنا بھی بند کرا دیا۔ ایک طرف ان کی سختی کا یہ حال تھا کہ مجھے نظر اٹھانے کی ہمت نہ تھی اور دوسری طرف یہ کہ ہانڈی میں سے سب سے پہلے میرے لیے سالن نکالا جاتا۔ کسی کو انڈا نہ ملتا تھا لیکن ہفتہ میں دو ایک بار مجھے ضرور مل جاتا۔ علیا چاچا کی قلیل تنخواہ میں بمشکل دو وقت کی روٹی چلتی، شروع میں ہمارے حصے میں بجلی بھی نہ تھی نیچے والوں نے اپنا میٹر الگ کروا کے ہماری بجلی کٹوا دی تھی۔ ہم لالٹین جلاتے تھے، علیا چاچا نے کچھ پیسے بچا کر میٹر لگوایا تو گھر میں جیسے سورج اتر آیا۔ امی کی possesive محبت میں شدت آتی جا رہی تھی اور میرے مزاج کا چڑچڑا پن اتنا ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پڑھائی سے میری دلچسپی واجبی سی رہ گئی تھی۔ میں ایک بار پھر گھر سے بھاگ کر بغیر ٹکٹ ٹرین میں بیٹھا اور

تنا بہ رد پہنچ گیا۔ والد نے حسب معمول کچھ نہ کہا۔ دو چار دن خوب کھلایا پلایا پھر کسی کے ساتھ واپس پنڈی بھجوا دیا۔ میٹرک کے امتحان سر پر آ گئے۔ میں نے بے دلی سے پرچے دیے اور تھرڈ ڈیژن میں پاس ہوا۔ صرف ایک نمبر سے سیکنڈ ڈویژن رہ گئی۔ اس دوران کشمیریوں کے کلیموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علیا چاچا نے اپنا کلیم داخل کیا لیکن والد نے کلیم داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یہاں کے شہری بن جائیں گے۔ انہیں آخر دم تک یہی آس ہی کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور واپس جائیں گے۔

فسٹ ائیر میں مجھے گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ مل گیا۔ امی کا فلسفہ یہ تھا کہ بچے کو ایک پیسہ بھی جیب خرچ کے لیے نہیں دینا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف وہ پیسہ پیسہ بچا کر میرے لیے کھانے پینے کی اچھی سے اچھی اور میری پسند کی چیز خرید لیتیں۔ سب سے پہلے میں کھانا کھاتا، علیا چاچا گھر میں ہوتے تو پھر ان کا نمبر آتا۔ اس کے بعد بہنیں اور جو بچ جاتا اس پر خود گزارا کرتیں۔ میں نے انہیں اکثر روٹی سے پتیلی صاف کرتے ہی دیکھا۔ معلوم نہیں وہ شروع ہی سے ایسی تھیں یا حالات نے انہیں اتنا سنک کر دیا تھا کہ انہیں ہر چیز کا منفی پہلو ہی نظر آتا، ایک شک مستقلاً ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ میں پیدل کالج جاتا تھا اور کینٹین کو دور سے دیکھتا تھا۔ امی کی شدت پسندی کے ردِعمل میں میرا اکھڑ پن بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بار دو ماہ کی فیس اکٹھی جمع کرانا تھی۔ امی نے اپنی انگوٹھی بیچ کر پیسے اکٹھے کیے۔ میں نے فیس کالج میں جمع کرانے کی بجائے اسے ادھر اُدھر خرچ کر دیا۔ دو ایک مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد میرا نام کٹ گیا۔ کچھ عرصہ معاملہ یوں چھپا رہا کہ میں روزانہ کالج کے لیے گھر سے نکلتا اور ادھر اُدھر مارا مارا پھر کر وقت پر گھر آ جاتا۔ آخر کب تک، امی کو معلوم ہو گیا۔ بہت روئی پیٹیں مگر اتنے مہینوں کی اکٹھی فیس جمع کرانے کی کوئی سبیل نہ بنی۔ میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایک دن کسی بات پر امی نے مجھے خوب مارا میں بازو چھڑا کر نیچے بھاگ آیا اور لیاقت

باغ میں آکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر بعد ایک شخص میرے قریب آیا اور بولا...... ''نوکری کرو گے''

میں نے کہا...... ''جی''

وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔اس کا گھر لیاقت باغ کے سامنے ہی تھا۔گھر جا کر پہلے تو اُس نے مجھے روٹی کھلائی پھر کہنے لگا ...... ''ہمیں بھینس کی دیکھ بھال کے ایک ملازم کی ضرورت ہے، یہ کام کرلو گے''

میں نے کہا...... ''کرلوں گا''

بھینس کی دیکھ بھال میرے بس میں کہاں تھی ۔ دو ہی دن میں میرا حشر ہو گیا۔اس دوران امی بھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپہنچیں اور مجھے ساتھ لے گئیں ۔ چند دن بے کاری میں گزرے ۔ پھر ہمارے ایک عزیز نے جو گنج منڈی میں کریانہ کی دکان کرتے تھے مجھے پاس کی ایک دکان پر تیس روپے ماہوار پر منشی رکھوا دیا۔ یہاں میں نے ڈیڑھ سال کام کیا۔میرا کام کیش بل بنانا، حساب رکھنا اور شام کو ادھار اکٹھا کرنا تھا، ہاتھ میں پیسے آئے تو دنیا بدل گئی ۔ میں ہر ہفتے ایڈوانس لے لیتا۔مہینہ کے آخر میں کچھ بھی نہ بچتا۔امی روتی چیختیں ، یہ شاید کوئی انتقامی جذبہ تھا جوان کی بے پناہ محبت کا ردِّعمل تھا، ایک علیا چاچا تھے وہ ٹرک پر کلینزی کر رہے تھے اور مہینے کے مہینے اپنی ساری تنخواہ امی کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتے تھے۔ان کی عظمت کا احساس اُس وقت مجھے کہاں تھا؟

اسی دوران ہمارے ایک دور کے عزیز پی ڈبلیو ڈی کی ایک برانچ میں ایس ڈی او بن کر آگئے ۔اس برانچ کا کام یہ تھا کہ ہندوؤں کی اوقاف کے تحت جو گھر آتے تھے ۔ان کی مرمت کرائی جاتی ۔ یہاں ورک چارج یعنی دیہاڑی داروں کی ضرورت تھی ۔انہوں نے مجھے بھی ایک اوورسیئر کے ساتھ لگا دیا۔ میرا کام ٹھیکہ دار کے کام کی نگرانی کرنا اور یہ دیکھنا تھا کہ مسالا صحیح

تناسب سے استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہمارا دفتر پلازہ سینما کے پچھواڑے میں تھا۔ یہیں میری ملاقات پہلی بار منشا یاد سے ہوئی۔

میں ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پینڈو جس کے ہاتھ میں ٹین کا بکسہ تھا اندر داخل ہوا۔ یہ منشا یاد تھا۔ اُس نے سول انجینئرنگ کی تھی۔ لیکن دفتر میں اوورسیئر کی جگہ نہ تھی اس لیے اُسے ورکس انسپکٹر کے طور پر پنڈی بھیجا گیا تھا۔ میں نے اُسے بٹھایا، چائے منگوائی۔ معلوم ہوا کہ پنڈی میں اُس کا کوئی آشنا نہیں۔ دو چار دن کے لیے دفتر ہی میں بندوبست ہو گیا۔ اس دوران اُس سے بات چیت چل نکلی۔ اُس نے بتایا کہ وہ افسانے بھی لکھتا ہے، میں نے پوچھا ''یہ افسانہ کیا ہوتا ہے'' اُس نے مجھے اپنی ایک کہانی جو شمع میں چھپی تھی پڑھنے کو دی۔ اُس زمانے میں شمع میں انعامی مقابلہ چل رہا تھا۔ منشا کی ایک کہانی کو سو روپے انعام ملا۔ شام کو وہ دوڑا دوڑا میرے گھر آیا۔ ہم راجا بازار گئے، چائے اور مٹھائی پر جشن منایا گیا۔ منشا نے مجھے رسالہ دیا کہ اس کہانی کو پڑھنا۔ میں نے اُسے کہا یار یہ تم کیا لکھتے ہو۔ جاسوسی کہانیاں لکھا کرو، اُس زمانے میں مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے بڑے مقبول تھے۔ محلوں میں آنہ لائبریریاں قائم تھیں، اس کے علاوہ ٹرنک بازار میں جواب اقبال روڈ بن گیا ہے کتاب گھر کے نام سے ایک بڑی لائبریری تھی، جہاں شام کو شہر بھر کے پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تلاش میں آتے تھے۔ یہ زمانہ کتاب شناسی کا تھا، ٹی وی ابھی معاشرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ لے دے کے ایک ریڈیو تھا، جس کے فرمائشی پروگرام اور ڈرامے بڑے مقبول تھے۔ دفتر اور سکول عام طور پر ایک ڈیڑھ بجے تک بند ہو جاتے تھے۔ لوگ گھروں میں جا کر کھانا کھاتے، آرام کرتے اور شام کو شہر کا شہر بنک روڈ پر نکل آتا۔ بنک روڈ پر گنے ہی کیفے یا کتابوں کی دکانیں تھیں۔ سیاست ابھی گفتگو کا موضوع نہیں بنی تھی، کیفوں میں سماجی مسائل ادبی اور فنی معاملات پر گفتگو ہوتی۔ سات آٹھ بجے گھروں کو واپسی ہوتی تو نو دس

بجے تک جاگنے کے لیے کتاب یا رسالہ ضروری تھا۔ پڑھنے والے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جو مہینے میں دو ایک کتابیں نہ خریدتا ہو۔ کئی لوگ ایسے تھے جو دکانوں پر کھڑے کھڑے ہی کتاب پڑھ لیتے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ جتنے صفحے پڑھے وہاں نشانی لگا گئے۔ اگلے دن گھنٹہ آدھا گھنٹہ وہیں کھڑے ہو کر اگلے صفحات پڑھ ڈالے۔ سلیم خان گمی جو اُن دنوں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھے اکثر اسی طرح کتب بینی کرتے۔ لندن بک ڈپو چوک میں تھا جہاں اب یونائیڈ بیکری بن گئی ہے۔ گمی کی عادت تھی کہ دفتر سے نکل کر وہاں آتے، کوئی کتاب اٹھاتے اور کسی کونے میں کھڑے ہو جاتے۔ لندن بک ڈپو والے دوپہر کو ایک بجے سے تین بجے تک کھانے کا وقفہ کرتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ گمی کسی کونے میں دُبکے ہوئے تھے۔ سیلز مینوں نے سرسری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بند کر کے چلے گئے کچھ دیر بعد گمی کو خیال آیا کہ کھانے کا وقفہ ہونے والا ہے، نکلے تو باہر کا دروازہ بند۔ دو گھنٹے اندر بیٹھے رہے۔ تین بجے مینجر نے دروازہ کھولا تو گمی کو اندر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ذکر ہو رہا تھا کتاب بینی کا تو مجھے اُس زمانے میں جاسوسی ناولوں کا گویا ٹھرک تھا۔ منشا یاد کی کہانیاں مجھے کیا پسند آتیں۔ منشا جب بھی کوئی کہانی لکھتا مجھے تلاش کر کے سناتا اور میں جان چھڑاتا۔ منشا یاد جس گھر کی بیٹھک میں رہتا تھا۔ اُس کا تنازع چل رہا تھا، عدالت سے فیصلہ دوسرے شخص کے حق میں ہو گیا۔ اُس نے پولیس کے ذریعے گھر خالی کرا لیا۔ شام کو میں منشا سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ گلی میں اپنے ٹرنک پر بیٹھا ہوا ہے۔ پاس چارپائی کھڑی ہے۔

میں نے پوچھا...... ''کیا ہوا''

کہنے لگا...... ''پولیس نے مکان خالی کرا لیا۔ میرا سامان بھی نکال کر باہر رکھ دیا ......اب کیا کروں؟''

ہم نے سامان تانگے میں لادا اور میں منشا کو اپنے گھر لے آیا۔ منشا اس سے پہلے بھی کئی

بار ہمارے گھر آ چکا تھا۔ امی اُسے بیٹوں کی طرح ہی پسند کرتی تھیں۔ منشا چار پانچ دن ہمارے گھر رہا۔ پھر قریب ہی موہن پورہ میں اس نے ایک کوارٹر لے لیا۔ شام کو ہماری باقاعدگی سے ملاقات ہوتی۔ میری کوشش ہوتی کہ افسانے پر کوئی گفتگو نہ ہو اور منشا اپنی تازہ کہانی سنانے پر تلا ہوتا۔ ان گرم سردیوں اس کی ٹرانسفر مری ہو گئی اور وقتی طور پر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔

جاسوسی ناول پڑھنے کے ساتھ ساتھ میری ایک اور خصوصی دلچسپی عجیب وغریب روحانی مشقیں کرنا تھیں۔ اس کا ماحول گھر میں موجود تھا۔ امی کو روحانیت سے خاص اُنس تھا۔ وہ اکثر رات کو وظیفے کرتیں اور اکثر ہمیں عجیب وغریب خواب سناتیں، اسراریت تو سری نگر ہی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہاں میں امی اور علیا چاچا کے ساتھ مزاروں پر جاتا تھا۔ جہاں امی دیا جلاتیں، درود پڑھتیں۔ ان مزاروں کی، جو اکثر کھوؤں اور غاروں میں تھے، فضا بہت ہی پراسرار تھی، پھر سری نگر میں ہمارے گھر کا درمیانہ حصہ جہاں امی کے مطابق جرمن متوّر رہتا تھا، اپنے اندر ایک عجب اسرار رکھتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پنڈی آکر ہمارا قیام ایک گوردوارے میں ہوا۔ ہمیں جو حصہ رہنے کے لیے ملا اس میں وہ ہال بھی شامل تھا جس میں گبند اور سنگ مرمر کا ایک چبوترا تھا۔ یہاں بھی ایک اسراریت تھی۔ پورا گھر ہی خصوصاً اوپر والا حصہ بہت پراسرار تھا۔ امی کہتی تھیں۔ اوپر والے کمرے میں کوئی رہتا ہے۔ نہ نظر آنے والی کوئی ہستی۔ اس سارے ماحول نے مجھے عجب طرح کی کیفیات سے دوچار کر دیا۔ میں کسی نامعلوم کو جاننا چاہتا تھا۔ غیر معمولی قوتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسی زمانے میں کسی محبتائی کتاب میں پڑھا کہ اگر روزانہ کچھ دیر چاند پر نظر جمائی جائے تو آنکھوں میں ایک پراسرار قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پرانے پریس کلب کے پیچھے سنسان جگہ اور نیچے لئی تھی۔ لاریوں کے اڈے ابھی وہاں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ میں روز رات کو وہاں جاتا اور چاند کی نظر بندی کرتا۔ کہتے ہیں کہ کوئی چیز طاری کر لی جائے تو وہ واقعی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک رات یوں ہوا کہ مجھے لگا میں چاند کے اندر پہنچ گیا ہوں میرے

چاروں طرف چاند موجود ہے۔ ایک عجیب فرحت بخش احساس تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں ڈر گیا۔ منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں تیزی سے بھاگا۔ پاؤں پھسلا تو ٹلی کے کنارے تک گھسٹتا آیا۔ جوتی وہیں رہ گئی۔ ننگے پاؤں، سانسوں سانس گھر پہنچا۔ امی کا میرے ساتھ کچھ ایسا تعلق تھا کہ بعض اوقات بغیر لفظ ادا کیے وہ سب کچھ سمجھ جاتی تھیں۔ میں ان کے سامنے جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے ڈانٹا پھر کچھ پڑھ کر پانی دم کیا اور مجھے پلا کر کہا کہ آئندہ اس طرح نہ کرنا۔ ایک اور محبتبائی کتاب میں پڑھا کہ اگر ایک خاص عرصہ تک سورج کو دیکھا جائے تو دیکھنے والوں کی آنکھ میں سورج کی توانائی آجاتی ہے وہ جس چیز کو چاہے نظروں سے جلا سکتا ہے۔ میں نے یہ عمل بھی شروع کر دیا۔ چار پانچ دن بعد ہی آنکھیں سوج گئیں اور درد سے چیخیں نکلنے لگیں۔ امی نے اس بار بھی بڑا ڈانٹا اور کئی دن تک وظیفے پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتی رہیں۔

والد لاہور ہی میں تھے، علیا چاچا نے وہاں جا کر بڑا اصرار کیا کہ وہ بھی کلیم داخل کر دیں مگر وہ نہ مانے، ان کا استدلال ایک ہی تھا کہ میں نے یہاں رہنا ہی نہیں، واپس جانا ہے۔ امی کو ان کا یہ رویہ بھی ناپسند تھا۔ میں نے لکھنا تو ابھی شروع نہیں کیا تھا لیکن پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ امی کو میرا کتابیں پڑھنا پسند نہیں تھا۔ والد کی زندگی کے رویوں کی وجہ سے وہ ادب و شعر کے بارے میں بہت ہی منفی خیالات رکھتی تھیں۔ جس وقت ہم پنڈی آئے تھے، نانک پورہ میں ایک سے ایک شاندار گھر خالی پڑا تھا لیکن والد نے ایک کمرے میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا کہنا تھا کہ رہنے کے لیے ایک ہی کمرا کافی ہوتا ہے۔ وہ مزاجاً ہی نہیں عملاً بھی درویش تھے۔ ان کی یہ درویشی امی کو پسند نہیں تھی۔ مزاجاً تو وہ بھی فقیر منش تھیں۔ علیا چاچا کا کلیم منظور ہو گیا اور انہوں نے اُس کے بدلے نمک منڈی میں ایک دکان لے لی۔ ٹرک کی کلینزی سے نجات مل گئی۔ دکان ملنے سے ہمارے گھر کے حالات بدل گئے۔ لیکن والد کے بارے میں امی کی رائے اور خراب ہو گئی۔ اسی دوران پنڈی میں نعمان جان نے قالینوں کی فیکٹری قائم کی۔

والد کو چیف ڈیزائنر کے طور پر بلایا گیا وہ لاہور چھوڑ کر پنڈی آ گئے۔علیا چاچا کے ایک دوست جن کا نام بھی علی محمد تھا۔ 501 سنٹرل ورکشاپ میں کام کرتے تھے،انہوں نے اپنے کسی افسر سے کہہ سن کر مجھے وہاں بطور ایل ڈی سی ملازم کرا دیا۔گھر کے حالات اب یکسر بدل گئے تھے۔ لیکن امی اور والد کے درمیان جو ایک بال آ گیا تھا وہ نہ نکلا ان کے تعلقات ورکنگ ریلیشن شپ تک محدود ہو گئے تھے،ایک وجہ اور بھی تھی ،میری ایک پھوپھی فاطمہ اور چچا فاروق کرشن نگر میں رہتے تھے۔ چچا تو بچوں کو چھوڑ کر لاہور میں تھے۔ دادی بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہتی تھیں ۔والد اکثر والدہ اور بہن کو ملنے وہاں جاتے۔عموماً اکیلے ہی جاتے واپسی پر ان کا موڈ بہت خراب ہوتا۔امی کا خیال تھا کہ فاطمہ پھوپھو ان کے کان بھرتی ہیں ۔وہ جواباً والد سے اور اکھڑے لہجے میں بات کرتیں ،چنانچہ دونوں کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ والد کو نعمان جان کی فیکٹری میں کام کرتے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ وہ شدید بیمار پڑ گئے۔ دمے کے تو وہ پرانے مریض تھے۔اس بار پھیپھڑوں پر بھی حملہ ہوا۔ٹی بی ہسپتال جہاں وہ علاج کرانا چاہتے تھے۔کرشن نگر کے قریب تھا۔دو چار دن وہ ہسپتال گئے معلوم نہیں کیسے، کسی کے اکسانے پر یا انہیں ازخود خیال آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ علاج کے دوران وہ بہن کے گھر ہی رہیں گے،روز آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔امی کو اس فیصلے سے ظاہر ہے بڑا دکھ ہوا لیکن انا کی وہ بھی پکی تھیں کہا...... ''جاتے ہو تو جاؤ مجھے کیا'' علیا چاچا نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے چارے کو دونوں سے ڈانٹ پڑی۔ بہت ہی افسردگی اداسی اور ٹینشن میں والد اپنا مختصر سا سامان لے کر بہن کے گھر منتقل ہو گئے ۔ہم دوسرے تیسرے دن انہیں دیکھنے جاتے۔ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی ہی گئی۔لیکن ایسی بھی صورت نہ تھی کہ وہ اچانک ہمیں چھوڑ جائیں گے۔۴ جون ۱۹۶۰ء کی صبح میں حسب معمول ورکشاپ گیا۔کوئی دس بجے کے لگ بھگ فون آیا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں ۔میں گھر آیا،امی اور ہمارے دوسرے رشتہ دار، ماموں، نیچے دادی خالہ،

ان کے بیٹے نذیر احمد سب میرے منتظر تھے۔ ہم کرشن نگر پہنچے۔ ہماری حیثیت وہاں اجنبی کی سی تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ دادی اور پھوپھو نے انہیں منہ ہی نہیں لگایا: شام کو جنازہ ہوا اور والد کو عید گاہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر کے ہم باہر باہر سے ہی اپنے گھر لوٹ آئے۔ جنازہ اٹھتے ہی امی اور ان کی رشتہ دار خواتین جو نانک پورہ سے ساتھ گئی تھیں باہر نکل آئیں، کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نانک پورہ آ کر ہم نے اپنی پھوڑی بچھائی۔ ددھیال سے ہمارا تعلق ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

501 ورکشاپ میں میری ملازمت یکم جنوری 1959ء کو شروع ہوئی۔ ابتدا میں مجھے ایک ذیلی دفتر میں جو گولڑہ موڑ کے پاس تھا بھیجا گیا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ اُس زمانے میں شروع کے تین مہینے بارشوں اور شدید سردی کے مہینے ہوتے تھے۔ برساتیاں تو کسی کسی کے پاس ہوتی تھیں۔ زیادہ تر چادریں لپیٹ کر ہی بارشوں میں پھرتے تھے۔ علیا چاچا نے مجھے ایک پرانی سائیکل لے دی۔ اُس زمانے میں گاڑیاں تو کسی کسی کے پاس ہوتی تھیں۔ کرنل رینک تک کے لوگ سائیکل استعمال کرتے تھے۔ موٹر سائیکل بھی خال خال ہی تھے۔ گھر سے دفتر پہنچتے گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ دفتر صبح ساڑھے سات بجے شروع ہوتا اور تین بجے چھٹی ہوتی۔ اُس زمانے میں یونین کا تصور ہی نہیں تھا۔ سنا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یونین بنانے کی کوشش کی گئی لیکن سختی سے کچل دی گئی۔ ایک ویلفیئر سیکشن تھا، ماجد الباقری اُس وقت وہاں ویلفیئر آفیسر تھے۔ لیکن اس وقت میری ان سے شناسائی نہ ہوئی۔ ایک سال بعد کوشش کر کے میری ٹرانسفر مین ورکشاپ چکلالہ میں ہوگئی۔ پبلک ٹرانسپورٹ یہاں بھی نہیں تھی چنانچہ وہی سائیکل کا سفر جاری رہا۔ یہاں میری تقرری پر چیز سیکشن میں ٹائم کیپر کے طور پر ہوئی، میرا کام ورکرز کی حاضری لگانا اور ان کی چھٹیوں کا حساب رکھنا تھا۔ یہ سارا کام گھنٹہ دو گھنٹہ میں ختم ہو جاتا۔ میں روزانہ ایک جاسوسی ناول ساتھ لے جاتا اور فارغ وقت میں پڑھتا رہتا۔ اسی سیکشن میں ایک اور شخص بھی کتابیں ساتھ

اور تاریخ وادب صفی کی کتابیں۔ اس کا نام اعجاز حسین تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری گفتگو شروع ہوگئی۔ کبھی کبھار، کتابوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اعجاز راہی کے نام سے افسانے لکھتا ہے۔ منشایاد کی وجہ سے میں افسانے کے نام سے واقف تھا۔ ایک دن اعجاز راہی نے مجھے اپنی ایک کہانی پڑھنے کو دی۔ کہانی پڑھ کر میں نے اسے کہا، ایسی کہانی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ اُس نے کہا تو لکھو، چند دن گزر گئے۔ اُس نے پھر یاد کرایا بلکہ اصرار کیا کہ میں کہانی لکھوں، میں نے ایسے ہی غیر سنجیدگی سے ایک کہانی لکھ کر اسے دی۔ اعجاز راہی نے کہانی کی بڑی تعریف کی اور کہا تم تو افسانہ نگار ہو۔ دو ایک دن بعد شام کو اعجاز راہی کچھ لوگوں کو لے کر میرے گھر آیا ۔۔۔ یہ نثار ناسک، علیم درانی، سبط احمد اور سلیم الظفر تھے۔ میرا تعارف کروایا۔ ہم کشمیری بازار کے ایک چائے خانے میں جا بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سارے لوگ نئے لکھنے والے ہیں۔ میں ان کی برادری میں شامل ہو گیا۔

یہ سارے لوگ شام کو پنڈی ہوٹل میں بیٹھتے تھے، جو راجا بازار کے آخر میں تھا۔ نثار ناسک ان کا سرخیل تھا۔ میں نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔ نثار ناسک کا خیال تھا کہ نئے لکھنے والوں کو اپنی ایک انجمن بنانا چاہیے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس اُس وقت تک معطل تھے۔ 1958ء کے مارشل لاء کے فوراً بعد حلقہ کے اجلاس بند کروا دیے گئے تھے۔ بڑی بحث کے بعد تجویز ہوا کہ انجمن کا نام ''بزم میر'' رکھا جائے۔ نثار ناسک اس کے سیکرٹری اور سلیم الظفر جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ میرا اور اعجاز راہی کا نام مجلس عاملہ میں شامل کیا گیا۔ بزم میر کے اجلاس موتی بازار کے ایک ہوٹل میں ہونے لگے۔ اس دوران میں نے دو تین اور کہانیاں لکھیں اور اختر رشید ناز کے نام سے فلمی پرچوں میں بھیج دیں۔ 'رومان' اُس زمانے میں اچھا فلمی رسالہ تھا۔ اگلے مہینے میری کہانی چھپ گئی اور میں اپنے حلقہ احباب کی رائے میں باضابطہ افسانہ نگار بن گیا۔ اسی دوران میں نے ایک کہانی لکھی جس کا عنوان ''سنگم'' تھا۔ بزم میر کے جلسوں میں

کچھ بزرگ بھی آنے لگے۔ ان میں غلام رسول طارق بھی تھے جو نثار ناسک کے استاد تھے۔ میں نے یہ کہانی بزم کے جلسہ میں پڑھی۔ جلسہ ختم ہوا تو غلام رسول طارق مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا......

''یہ کہانی تم نے خود لکھی ہے''

میں نے کہا...... ''جی''

بولے...... ''اگر واقعی تم نے لکھی ہے تو بہت خوب ،تم میں لکھنے کی بڑی صلاحیت ہے لیکن تربیت کی ضرورت ہے۔

میں کچھ نہ بولا۔

کہنے لگے...... ''کسی دن فرصت ہو تو میرے پاس آنا...... میں دوپہر کا کھانا بوہڑ ہوٹل میں کھاتا ہوں''۔

غلام رسول طارق فرنٹیئر پریس میں مینجر تھے جو میسی گیٹ میں واقع تھا۔ دوپہر کو وہ اپنا گھر سے لایا ہوا کھانا بوہڑ ہوٹل جا کر کھاتے۔ میں ایک دن اُن کے پاس پہنچ گیا۔

کہنے لگے...... ''کل وہ افسانہ ساتھ لے کر آنا''

دوسرے دن میں افسانہ ساتھ لے گیا۔ انہوں نے دو ایک جگہ جملے درست کرائے پھر بولے...... ''کسی اچھے رسالے کو بھیج دو''

میں نے کہا...... ''بہتر''

بولے...... ''کس کو بھیجو گے''

میں نے فوراً کہا...... ''رومان کو بھیج دیتا ہوں''

سخت ناراض ہوئے ، کہنے لگے...... ''اب ان فلمی پرچوں سے باہر نکلو میرا خیال ہے اسے ''ادب لطیف'' کو بھیج دو''

''ادب لطیف'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ادب لطیف'' اس زمانے میں ''نقوش'' کے بعد سب سے اہم رسالہ سمجھا جاتا تھا۔ مرزا ادیب اس کے مدیر تھے۔

بولے ''بالکل، ادب لطیف کو بھیج دو اور ہاں یہ تمہارا نام کیا ہے..... اختر رشید ناز یہ ناز و انداز نہیں چلتا کوئی ڈھنگ کا نام رکھو''

کافی نام زیر غور آئے آخر رشید امجد طے ہوا۔

دوسرے دن میں نے یہ کہانی رشید امجد کے نام سے میرزا ادیب کو بھجوادی۔ مجھے ذرہ بھر بھی خوش فہمی نہ تھی کہ میرزا صاحب جواب دیں گے۔ میں نے کہانی کے نیچے ''چینی کہانی سے ماخوذ'' لکھ دیا کہ اس زمانے میں ترجمے فوراً چھپ جاتے تھے۔

تیسرے ہی دن میرزا صاحب کا خط آگیا۔ انہوں نے کہانی کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ زیر ترتیب شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ میں نے صرف غلام رسول طارق کو یہ خط دکھایا۔

کہنے لگے..... ''اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا، جب تک کہانی چھپ نہ جائے تمہارے آس پاس بڑے حاسد موجود ہیں''

اگلے مہینے ادب لطیف آگیا۔ یہ ستمبر 1960ء کا شمارہ تھا۔ اس میں کہانی شامل تھی۔ میرزا صاحب نے اداریہ میں خصوصیت سے میرا ذکر کیا تھا کہ اگرچہ کہانی کا مرکزی خیال ماخوذ ہے لیکن انداز تحریر ایک اچھے افسانہ نگار کی آمد کی پتہ دیتا ہے۔

اس دوران میں نے ایک اور کہانی لکھی۔ استاد غلام رسول طارق نے مشورہ دیا کہ اسے ''داستان گو'' میں بھیجوں۔ داستان گو کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد پھر شروع ہو گیا تھا۔ اشفاق احمد مدیر تھے۔ انہوں نے بھی کہانی اگلے پرچے میں چھاپ دی۔ ان دونوں کہانیوں نے مجھے یک دم ایک معتبر افسانہ نگار بنا دیا۔

میرے اس آغاز کا سہرا استاد غلام رسول طارق کے سر ہے۔ وہ خود شاعر تھے، کبھی کبھی افسانے بھی لکھتے تھے۔ مشرقی تنقید کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ زبان کے معاملے میں ان کی گرفت بڑی سخت تھی۔ میں نے ان سے جملہ لکھنا سیکھا، افسانے کو سمجھا، میں اپنی ہر کہانی انہیں دکھاتا تھا۔ وہ کہانی سنتے، پھر مجھ سے لے کر پھاڑ دیتے اور کہتے۔ اب اس کہانی کو درمیان سے شروع کر کے دوبارہ لکھو۔ اگلے دن میں لکھ کر لے جاتا۔ وہ یہ مسودہ بھی پھاڑ دیتے اور کہتے اب کہانی کو آخر سے شروع کر کے فلیش بیک میں لکھو۔ یوں انہوں نے مجھے لکھنے کی ایسی مشق کرائی جو آج بھی میرا اثاثہ ہے۔ جملے کے بارے میں وہ بڑے حساس تھے۔ اگر دو تین جملوں کے آخر میں متواتر تھا یا تھی آ جاتا تو میز پر طبلہ بجانا شروع کر دیتے ''تھا تھیا ...... تھا'' ...... ''تھا تھیا...... تھا''۔

رشید امجد کے نام سے میرا آغاز بہت اچھا، بلکہ توقع کے خلاف تھا۔ اختر رشید کا سفر ختم ہوا۔ یہ نام والد نے اپنے جوتشی پنڈت کے حساب کتاب اور پوتھی کے مطابق رکھا تھا۔ جوتشی پنڈت کا خیال تھا کہ یہ نام میری شخصیت کے مطابق ہے لیکن اختر رشید بھی گمان کا مغلوب رہا۔ وہ بھی دو شخصیتوں کے حصار میں تھا۔ ایک اندر، ایک باہر اور اس کے ارد گرد بھی ایک اسرار تھا، تخیل کی ازلتوں میں گم۔ یہ تخیل بھی عجب نعمت ہے۔ یوں تو آدمی کو جذبہ، احساس اور شعور کی نعمتیں بھی ملی ہیں لیکن ان نعمتوں میں دوسرے حیوان بھی شریک ہیں۔ جذبہ سب میں موجود ہے کم یا زیادہ، جانور بھی اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ان کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور شعور بھی کم ہی سہی، ان میں موجود ہے۔ احساس بھی ان کے یہاں ہے لیکن تخیل کی نعمت صرف آدمی کے حصے میں آئی ہے۔ اختر رشید اس تخیل کا اسیر تھا۔ رشید امجد بھی زندگی بھر اس کا اسیر رہا۔ ساری زندگی ایک ان دیکھے کی تلاش، اپنی شناخت میرا مسئلہ رہی ہے۔ اگر غلام رسول طارق نہ ملتے تو شاید اختر رشید ناز فلمی پرچوں میں گم ہو کر رہ جاتا۔ لیکن رشید امجد نے اپنے سفر کا آغاز بہتر

پروقار انداز سے لیا۔

○

بزم میر کی نشستوں کے ساتھ ساتھ شام کی محفلوں میں مختلف ادبی حوالوں سے گفتگو ہوتی تھی۔ اس زمانے میں تین کتابیں اور ان کے دیباچے خاص طور پر گفتگو کا موضوع تھے۔ ایک وزیر آغا کی 'شام اور سائے' اور اس کا دیباچہ، دوسرا جیلانی کامران کی 'استانزے' اور اس کا دیباچہ تیسرے افتخار جالب کی 'ماخذ' اور اس کا دیباچہ۔ 'ماخذ' کا دیباچہ میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث تھا کہ اگرچہ افتخار جالب کی نئی تشکیلات کا محور اردو نظم تھا لیکن انہوں نے اپنے دیباچے میں مثالوں کے لیے افسانے کو چنا تھا۔ نئی تشکیلات کی بازگشت لاہور سے نکل کر پنڈی کی ادبی محفلوں میں پہنچ چکی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندیوں سے اگرچہ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ جلسے بند تھے لیکن ترقی پسند ابھی تک پورے دم خم کے ساتھ موجود تھے، یہ ہم سے سینئر نسل تھی اور کافی حد تک متکبر، ہمارے جلسوں میں آنا تو ایک طرف، وہ نجی محفلوں میں بھی ہمیں منہ لگانے کے لئے تیار نہ تھے۔ استاد غلام رسول طارق اگرچہ طبعاً جدید رویے کے خلاف تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی مجھے اس سے نہیں روکا۔ وہ خود ترقی پسند تھے ایک زمانے میں لیبر یونین کے سیکرٹری بھی رہ چکے تھے۔ ہڑتال کرانے کی پاداش میں نوکری سے نکالے گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پنڈی شاخ کے عہدیدار بھی رہے لیکن اب ترقی پسندوں کے عمومی رویے سے دل برداشتہ تھے۔ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا جو ہر فعال تحریک کے ساتھ آخر آخر ہو جاتا ہے یعنی ان میں بھی پروہت پیدا ہو گئے۔ پابندی کے باوجود ان کے اپنے پرچے تھے جن میں نئے لکھنے والوں خصوصاً جدید رویہ رکھنے والوں کا داخلہ بند تھا، چنانچہ ایسی صورت حال میں جب نئی لسانی تشکیلات کی صدا گونجی تو اکثر لکھنے والے اس کی طرف مائل ہو گئے۔ غیر وابستگی کا نعرہ وجود میں آیا۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے جدیدیت ترقی پسندی کا رد عمل تھی۔ وزیر آغا سے ابھی

میری ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ میں افتخار جالب سے ملنا چاہتا تھا، چنانچہ ایک اتوار لاہور جا پہنچا اور پوچھتے پچھاتے ٹی ہاؤس میں جا نکلا۔ افتخار جالب اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ ایک میز پر براجمان تھے۔ میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ ان سے ملنے پنڈی سے آیا ہوں معلوم نہیں میرا دل رکھنے کو یا مروتاً انہوں نے کہا، میں آپ کے نام سے واقف ہوں، حالانکہ اس وقت تک میرے چار پانچ افسانے ہی چھپے تھے۔ لیکن اچھے پرچوں میں چھپے تھے اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی بات کہاں تک سچ تھی، بہر حال انہوں نے چائے منگوائی ۔نئی لسانی تشکیلات کی بات شروع ہوگئی ۔ میں نے ماخذ کے دیباچے کا حوالہ دیا۔ انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں نے ماخذ پڑھی ہے ۔ میرے ذہن میں کچھ تحفظات تھے ۔ خاص طور پر یہ کہ نئی لسانی تشکیلات کے فریم ورک میں خود ماخذ کی نظمیں، کہاں فٹ ہوتی ہیں کہ ان میں سے اکثر نظموں کے مصرعوں میں چار چار اضافتیں بیک وقت آتی چلی جاتی ہیں ۔ گفتگو طویل ہوگئی ۔ افتخار جالب ہمیں لے کر وائی ایم ۔سی ۔اے کیفے میں آگئے ۔ یہ ٹی ہاؤس سے مال کی طرف مڑتے ہی دائیں طرف ہے۔ یہاں ہم رات گئے تک بیٹھے رہے۔اب مجھے سب لوگوں کے نام تو یاد نہیں لیکن سعادت سعید، فہیم جوزی اور شاید انیس ناگی ان میں شامل تھے ۔ مجھے اسی رات واپس آنا تھا کیونکہ ورکشاپ سے چھٹی کا مفہوم ایک دن کی تنخواہ کٹوانا تھا۔ افتخار جالب سے ملاقات کے بعد میرے پاس ایک ایسا تازہ مواد تھا جو کئی دن موضوع بحث رہا۔ پھر یوں ہونے لگا کہ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد میں لاہور جا کر افتخار جالب کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ ان کے آس پاس بیٹھے لوگوں کی حالت اس مرید کی سی تھی جو مرشد کی ہر بات پر سر ہلانا فخر سمجھتا ہے۔ میرا مزاج قدرے مختلف تھا، پھر یہ کہ میں مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ان سے ملتا تھا اس لیے بے تکلفی سے سوال بھی کر لیتا۔ ان کا کمال یہ تھا کہ میرے ہر سوال کا جواب تفصیل سے مسکراتے ہوئے دیتے۔ افتخار جالب بہت ہی نفیس شخصیت کے مالک ہیں ان کا گھڑا بہت مشہور تھا۔ کہتے ہیں کہ اُن کے مرید کوئی نظم انہیں

دکھاتے تو وہ نظم لے کر گھڑے میں ڈال دیتے۔استاد غلام رسول طارق، کے زیر سایہ خالصتاً کلاسیکی اور فنی تربیت کے ساتھ ساتھ افتخار جالب سے جدید افکار اور جدیدیت کی بحثوں نے میرے تخلیقی سیلف کو جو اٹھان بخشی اس نے بعد میں مجھے بڑا فائدہ پہنچایا۔اسی دوران وزیر آغا سے بھی میری پہلی ملاقات ہوئی۔وہ گرمیاں مری میں گزارتے تھے۔معمول یہ تھا کہ صبح سویرے ٹرین میں سرگودھا سے پنڈی آتے۔سہ پہر تک ریلوے سٹیشن کے فسٹ کلاس ویٹنگ روم، ریستوران میں نشست جماتے۔اس زمانے میں ریلوے سٹیشن کے ریستوران آج کی طرح لاری اڈوں کے فٹ پاتھیے ہوٹل نہیں تھے،ان میں خال خال ہی کوئی مسافر آتا،وہ بھی جس کے پاس فسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوتا۔پہلی بار مجھے اب یاد نہیں کہ کون ساتھ لے گیا تھا۔وزیر آغا سے ملاقات کا تجربہ بڑا خوشگوار رہا۔جدیدیت کے حوالے سے بہت عمدہ گفتگو ہوئی۔دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا اور تین بجے کے لگ بھگ وہ مری روانہ ہو گئے۔اس کے بعد معمول بن گیا کہ وہ جب بھی مری جانے کے لئے سٹیشن پر ٹھیکی لگاتے،میں وہاں پہنچ جاتا۔

بزم میر کی محفلیں پورے جوبن پر تھیں کہ ایک دن منشایاد وہاں پہنچ گیا اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔بولا...... ''یہ تم ہی ہو'' میں نے کہا ''ہاں میں ہی ہوں'' اس وقت تک میرا نام خاصا معتبر ہو گیا تھا اور میں ان ادبی پرچوں میں چھپنے لگا تھا جن کا میرے ساتھ بیٹھنے والے دوسرے نوجوان تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔محفل کے اختتام پر پنڈی ہوٹل میں جدیدیت کے حوالے سے گفتگو چھڑی تو میری باتیں سن کر منشایاد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔اس کے بعد اس سے پرانا رابطہ بحال ہو گیا،وہ مری سے اسلام آباد آن بسا تھا۔نوجوان دوستوں کے ساتھ ساتھ استاد غلام رسول طارق کے توسط سے مجھے بزرگ ادیبوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔اس وقت پنڈی میں کلاسیکی مزاج کے تین اہم شاعر تھے۔استاد غلام رسول طارق،استاد صادق نیازی اور استاد ضبط قریشی،ان تینوں کے شاگردوں کا اپنا اپنا گروہ تھا،تینوں مشرقی تنقید سے تعلق رکھتے تھے،ان

لوگوں میں ، میں واحد افسانہ نگار تھا جوان کی بحثوں میں شریک ہوتا۔ ضبط قریشی ستارہ شناسی کے بھی ماہر تھے۔ اس زمانے میں فوارہ چوک کا دائرہ خالی ہوتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی گھاس کا فرش بنا ہوا تھا۔ رات نو بجے کے بعد اس پر محفل جمتی ، زیادہ بحثیں شعر کی فنی ہیت اور لفظ پر ہوتیں ، بعض اوقات صبح کے چار بج جاتے لیکن بحث ختم نہ ہوتی ۔ دلیل پر دلیل اور شعر پر شعر، اس بحث میں زیادہ نکات فارسی اور کبھی کبھی عربی شعروادب کے ہوتے۔ شام کو گھر سے نکلنے میں اب وہ پابندی تو نہ تھی اور نہ امی اب مجھے مارتی پیٹتی تھیں، ان کی مرضی ومنشا کے برعکس میں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھ ہی دیا تھا۔ جسے انہوں نے طوعاً وکرہاً قبول کرلیا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ ہر رات دیر سے گھر جانے پر ڈانٹ پڑتی۔ میں نے کنڈی کھولنے کا ایک طریقہ سیکھ لیا تھا۔ کنڈی ذرا ڈھیلی تھی ، میں باہر سے دو انگلیاں ڈال کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولتا۔ چپکے سے اندر آتا اور کھانا کھائے بغیر، کہ اس طرح امی کے اٹھ جانے کا خوف ہوتا، چار پائی پر لیٹ جاتا ، لیکن معلوم نہیں انہیں کس طرح پتہ چل جاتا۔ وہ اٹھ جاتیں ، ڈانٹتیں اور زبردستی کھانا کھلاتیں ۔ ایک بار یوں ہوا کہ فوارہ چوک میں بحث ایک نکتہ پر اڑ گئی ۔ دلیلیں ختم ہونے کو ہی نہ آتی تھیں ، ساڑھے چار بج گئے ۔ میں ڈرتے ڈرتے گھر پہنچا، کنڈی کھولی اور چپکے سے چار پائی پر لیٹ گیا۔ امی کی آنکھ حسب معمول کھل گئی ، انہوں نے مجھ سے کہا ’’ پھر بارہ بجا دیے ہیں‘‘ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اندھیرے کی وجہ سے گھڑی پر ان کی نظر نہیں پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتیں پڑوس کی مسجد سے اذان بلند ہوئی ، وہ تو اچھل پڑیں ...... ’’صبح ہوگئی ،تو ساری رات باہر رہا ہے‘‘ میں نے دل ہی دل میں مولوی صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ امی صبح تک چپ نہ ہوئیں۔

اُس زمانے میں پنڈی میں دو اور بزرگ ایسے تھے جنہوں نے کئی نوجوانوں کی ذہنی آبیاری کی اور انہیں وہ فنی رموز سکھائے جس کی بنا پر یہ اپنے دور میں اہم نام بنے۔ ان میں سے ایک انجم رضوانی تھے ، ان کے کئی شاگرد تھے ، ان میں سے جمیل ملک اہم نام ہے۔ میری ان سے

ملاقات نہیں ہوئی البتہ ان کے بیٹے قاضی آفتاب سے اچھے تعلقات رہے کہ وہ پیپلز پارٹی کے سر گرم رکن تھے اور نظریاتی کارکن ۔ان لوگوں میں سے جنہوں نے پارٹی کے لیے بے پناہ قربانیاں دی لیکن کوئی صلہ نہیں مانگا۔ ایک دور میں بڑے فعال تھے اب عرصہ سے بیماری کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔

دوسرے بزرگ حکیم یحییٰ خان شفا تھے۔ ان کے شاگردوں میں احمد ظفر اور قتیل شفائی نامور نام ہیں۔ شفائی ان ہی کی مناسبت سے ہے۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ جامع مسجد کے نیچے مطب کرتے تھے۔ استاد غلام رسول طارق مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ حکیم صاحب فارسی اور عربی پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ شعری اوزان اور بحور پر بھی ان کی رائے بڑی صائب تھی۔ اُس زمانے میں اگر کوئی ان نکات ورموز سے واقف نہ ہوتا تو اسے ادیب سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ غلام رسول طارق نے میرے نہ نہ کرنے کے باوجود مجھے بحور کی مشق کرائی اور شعر کی تقطیع کا طریقہ سکھایا۔ یہ سارے کلاسیکی مزاج رکھتے تھے اور ان کی بحثیں شعر کے فنی نکات، لفظ کے معنوں اور تلفظ سے متعلق ہوتی تھیں۔ استاد غلام رسول طارق صدر میں کام کرتے تھے، سات آٹھ بجے فارغ ہوتے۔ سائیکل پر سیدھے پنڈی ہوٹل آتے، کبھی کبھار میں ان کے پریس پہنچ جاتا، صدر سے پیدل، سائیکل میرے ہاتھ میں اور طارق صاحب کسی موضوع پر علمی گفتگو کر رہے ہیں، پہلا پڑاؤ پنڈی ہوٹل میں، نو بجے کے قریب وہاں سے اٹھتے، میں ان کی سائیکل پکڑ لیتا، باتیں کرتے کرتے پُل پر آجاتے، آگے سرائے بیلی رام کا علاقہ شروع ہو جاتا۔ یہ بازارِ حُسن تھا، ابھی پابندی نہیں لگی تھی۔ پل کراس کرتے ہی جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کا کھیل شروع ہو جاتا۔ بازار کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کے دروازے پر رنگ برنگے ملبوسات اور میک اپ سے لتھڑے چہروں کے ساتھ جوان اور بوڑھی طوائفیں ہر آنے جانے والے کو آوازیں دے دے کر اپنی طرف بلاتیں۔ بازار میں کئی ہوٹل تھے، لیکن وسط میں

ایک ایسا ہوٹل تھا جس کے آگے کھلا چبوترا تھا، ہماری دوسری ٹھیکی یہاں لگتی ۔طارق صاحب کبھی کبھی سائیکل میرے ہاتھ سے لے لیتے اور کہتے جاؤ ذرا یہ سامنے والی سے پوچھ کر آؤ، اس کا ریٹ کیا ہے''۔ان کی دلچسپی صرف اسی حد تک تھی، میں نے کبھی انہیں کوئی غیر اخلاقی حرکت کرتے نہیں دیکھا۔ یہاں سے چائے پی کر ہم رتہ سے رتہ امرال کی طرف نکل جاتے، طارق صاحب یہیں رہتے تھے۔ان کے دروازے تک سائیکل گھسیٹنا میری ذمہ داری تھی۔ یہاں سے میں اکیلا لئی کے راستے، کہ بازار کا راستہ خاصا لمبا تھا، گھر جاتا۔ڈھلوان اتر کر پانی میں پتھر پڑے تھے۔ان پتھروں سے پھونک پھونک کر گزرتے ہوئے کئی بار مجھے جرمن متو کے کڑوں کی آواز سنائی دی۔اس کی سرخ انگارہ آنکھوں نے گھورا۔ میں تیز تیز اور کبھی دوڑتے ہوئے یہاں سے گزر جاتا۔آگے ناولٹی سینما تھا۔پھر میرا گھر، وہی تکنیک سے دو انگلیاں ڈال کر کنڈی کھولنا، امی کی ڈانٹ، صبح سویرے ورکشاپ کی تیاری، تین بجے تک اس پنجرہ میں بند رہنا۔شام کو گھر آکر کچھ پڑھنا اور پھر شب نوردی، غلام رسول طارق دوست تو تھے ہی، ایک مشفق بزرگ بھی تھے، انہوں نے مجھے پڑھنے کی طرف راغب کیا، اس زمانے میں پرائیویٹ امتحان دینے کی پابندی تھی، پہلے منشی فاضل یا ادیب فاضل کرنا پڑتا تھا۔طارق صاحب کے مشورے اور اکسانے پر میں نے ادیب فاضل کا امتحان دیا۔غیر متوقع طور پر پاس ہوگیا۔غیر متوقع یوں کہ تیاری چلتے پھرتے ہی کی تھی۔طارق صاحب بھی میٹرک ہی میں تھے، وہ بھی میرے ساتھ شامل ہوگئے۔

اب ایف ۔اے کی باری آئی ۔اس بار بھی وہ میرے ساتھ رہے، بی ۔اے بھی ہم نے ساتھ ساتھ کیا، یہاں سے ہمارا تعلیمی سفر علیحدہ ہوگیا، وہ پنجابی میں ایم ۔اے کرنا چاہتے تھے، میرا رجحان اردو کی طرف تھا۔گورڈن کالج میں ایم ۔اے کی کلاسیں تین بجے شروع ہوتی تھیں، صفی حیدر دانش صدر شعبہ تھے۔ میں ایک شام ان کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے تو وہ راضی نہ ہوئے کہ کلاسیں شروع ہوئے مہینہ گزر چکا تھا۔ میں مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو جانے انہیں کیا خیال آیا، کہنے

لگا۔ ''چلو آزمائشی طور پر آجاؤ، نہ چل سکے تو نکال دوں گا'' کلاس میں میرے ساتھ جاوید حکیم قریشی، جو بعد میں پیپلز پارٹی راولپنڈی کے پہلے سیکرٹری بنے اور سلطان رشک بھی تھے۔ تیس کی کلاس میں لڑکوں کی تعداد دس بارہ تھی۔ انہی میں عزیز الرحمٰن بھی تھے۔ جو امپیریل سینما کی ساتھ والی گلی میں رہتے تھے۔ جی۔ ایچ۔ کیو میں ملازم تھے۔ وہ میرے دوست بن گئے۔ کلاس میں زیادہ تعداد ان لڑکوں کی تھی جو صبح کے وقت کہیں نہ کہیں ملازمت کرتے تھے۔ یہ لوگ آسانی سے تین بجے کلاس میں پہنچ جاتے، میرا مسئلہ یہ تھا کہ ورکشاپ سے پونے تین بجے چھٹی ہوتی، میں تیز تیز سائیکل چلاتا، ہانپتا کانپتا کلاس میں آتا، پانچ دس منٹ لیٹ ہو جاتا، اتفاق سے پہلا پیریڈ دانش صاحب ہی کا ہوتا، وہ روز ناراضگی کا اظہار کرتے، دو سال میں ان کی نظروں میں رہا اور میرے بارے میں ان کی رائے قطعاً اچھی نہ تھی۔ کلاس ٹیسٹوں میں وہ مجھے سب سے کم نمبر دیتے، اس کی وجہ میرا پنجابی ہونا بھی تھا۔ ہمارے دوسرے اساتذہ میں محمد صدیق چیمہ، مطیع اللہ خان بھی تھے۔ ان میں سے مطیع اللہ خان صاحب بہت ہی مہربان اور شفیق تھے۔ وہ بھی اگرچہ اردو بولنے والے تھے لیکن تمام تر تعصبات سے بالاتر، انہوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ سلطان رشک، حکیم یوسف حسن سے ''نیرنگ خیال'' لے چکا تھا اس نے کالج چوک میں اس کا دفتر بنایا۔ کلاس میں دو گروپ بن گئے، ایک میں سلطان رشک اور دوسرے میں میں، آدھی لڑکیاں اُدھر، آدھی ادھر۔ کلاس ختم ہونے کے بعد ورانڈوں میں دیر تک گپ شپ ہوتی۔ اس پر میں نے ایک نظم لکھی جو 'سیپ' میں چھپی۔

ورانڈوں میں

کتابوں کے بہانے، کئی باتیں

کہ جن کا کوئی مطلب نہیں ہے

مسائل جن کا کوئی حل نہیں ہے

ورانڈے میں گپ شپ کے بعد سلطان رشک تو اپنے گروپ کے لڑکوں کے ساتھ نیرنگ خیال کے دفتر میں چلا جاتا اور ہمارا گروپ میزبان ہوٹل میں جو لیاقت روڈ پر تھا، ڈیرہ جما لیتا۔ سات بجے گھر آتا۔ سائیکل رکھتا، نیچے والوں سے حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ مجھے سائیکل سیڑھیوں سے اٹھا کر اوپر لے جانی پڑتی۔ کھانا تیار ہوتا تو کھا لیتا، ورنہ بھوکے پیٹ پھر شب نوردی شروع ہو جاتی۔ دوپہر کو ورکشاپ کی کینٹین سے آنہ روٹی دال مفت ملتی تھی۔ ایک روٹی اور پھر چائے، چائے کا ہاف سیٹ دو آنے میں ملتا تھا جس میں ہم تین لوگ شیئر کرتے۔ رات گئے تک اسی ایک روٹی پر گزارہ ہوتا، یا پھر چائے پر چائے، لیکن ایک ایسی جنونی کیفیت تھی کہ بھوک کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر اسلم قریشی نے کالج روڈ پر حشمت علی اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی اور پنڈی میں پہلی بار ایم۔اے اردو کی پرائیویٹ کلاسیں شروع ہو گئیں۔ منشا یاد نے میرے ساتھ ہی پرائیویٹ ایف۔اے اور بی۔اے کیا تھا۔ گورڈن کالج میں داخلہ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اسلام آباد سے تین بجے پنڈی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ حشمت علی کالج کی کلاسیں چار بجے شروع ہوتی تھیں۔ اس نے اور ایس۔اے ناز نے وہاں داخلہ لے لیا، کچھ عرصہ طاؤس بانہالی بھی وہاں زیر تعلیم رہا۔ ایم۔اے کا امتحان ہم سب نے اکٹھے ہی دیا۔ میں اور عزیز الرحمٰن کالج سے نکل کر حشمت علی کالج آ جاتے یا 'میزبان' میں منشا کا انتظار کرتے۔ ورکشاپ کے قوانین بہت سخت تھے، پھر میں تھا بھی عارضی، چھٹی نہ ہونے کے برابر تھی، کلاس میں نوٹس لکھا دیے جاتے تھے لیکن میں بعض کتابیں خود پڑھنا چاہتا تھا، خصوصاً ناول والا حصہ۔ لائبریری سے یہ کتابیں ایشو نہیں ہوتی تھیں، وہاں بیٹھ کر ہی پڑھی جا سکتیں تھیں۔ میں نے اس کا طریقہ یہ نکالا کہ صبح پہنچتے ہی اپنا کام ختم کر دیتا اور خاموشی سے مین گیٹ کے پاس پہنچ جاتا، یہاں بڑی سختی تھی۔ گیٹ پاس کے بغیر کسی کو باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جس دن والد کا انتقال ہوا مجھے چھٹی لیتے اور گیٹ پاس بنواتے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ورکشاپ میں فوجی گاڑیاں خصوصا

بڑی گاڑیاں مرمت ہونے کے لیے آتی تھیں۔ایک بڑی تعداد میں روزانہ یہ گاڑیاں اندر آتیں اور باہر نکلتیں۔میں کسی ٹرک کے اندر خاموشی سے لیٹ جاتا۔گاڑی باہر نکلتی اور آگے پل پر لمحہ بھر کے لیے رکتی تو میں خاموشی سے نیچے اتر جاتا۔سائیکل سٹینڈ باہر تھا۔سائیکل لیتا اور سیدھا کالج لائبریری پہنچ جاتا۔گورڈن کالج کی لائبریری اس زمانے میں بہت بڑی تھی اور بہت سی نادر کتابیں وہاں موجود تھیں۔فسانۂ آزاد کی چاروں جلدیں میں نے اسی زمانے میں پڑھیں،طلسم ہوش ربا کی دستیاب جلدیں بھی پڑھ ڈالیں۔

ورکشاپ سے نکلنے کا ایک اور طریقہ بھی تھا جو کبھی کبھی آزمایا جاتا۔بیماری کی چھٹی (sick leave) فوراً مل جاتی۔ورکشاپ میں ایک ڈسپنسری تھی جہاں ایک ڈسپنسر بیٹھتا تھا۔ڈاکٹر دس بجے کے قریب آتا،بخار کی صورت میں ڈسپنسر کو اختیار تھا کہ وہ بیماری کی چھٹی دے دے۔میں ہفتہ میں ایک آدھ دن یہ کرتا کہ ڈسپنسری جانے سے پہلے گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتا اور ایک گھونٹ منہ ہی میں رکھ کر تیزی سے ڈسپنسری کی طرف بھاگتا۔ڈسپنسری اتفاق سے میرے کمرے سے قریب تھی۔ڈسپنسر منہ میں تھرمامیٹر رکھتا تو درجہ حرارت سو ہو جاتا،فوراً چھٹی مل جاتی۔گیٹ پاس بنواتا اور پھر باہر۔اندر،ایک قید تھی۔اس زمانے میں یونین کا تصور تک نہ تھا۔فوجی افسر سویلین سے بہت برا سلوک کرتے تھے۔وہ آقا تھے اور ہم ان کے غلام،اس وقت تو یہ کیفیت صرف فوجی اداروں میں تھی اور اب پورے ملک میں یہ ہی صورت ہے۔گورڈن کالج کے پورے دو سال میری یادوں میں ہمیشہ تازہ رہیں گے۔کلاس کا ماحول گھر کا سا تھا۔جیسے ہمارے ایک ہی کنبہ کے فرد ہوں،چھوٹی موٹی رنجشوں سے قطع نظر مجموعی فضا بڑی رومان انگیز تھی۔لڑکیاں تعداد میں بہت تھیں اور لڑکے آدھے سے بھی کم اس لیے رقابت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ہمارے ساتھ ایک غضنفر شاہ بھی تھے،عمر میں ہم سب سے بڑے،ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔بال آدھے سے زیادہ سفید۔ابھی تک کنوارے تھے۔مزاج کے بہت خوش اخلاق،ایک

لڑکی کے چکر میں، ہم نے ان کی مونچھیں منڈوا دیں اور بالوں کو خضاب لگوا دیا۔ کئی لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ گہری وابستگی تھی لیکن شادی صرف ایک ہی ہو سکی۔ سیشن ختم ہونے کے بعد سب ایسے تتر بتر ہوئے کہ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی۔ باقاعدہ نتیجہ نکلنے سے دو چار دن پہلے غنشا کا فون آیا کہ کچھ گڑبڑ ہے میں نے کریدا تو اس نے بتایا کہ وہ تو سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا ہے اور میری دو پرچوں میں کمپارٹمنٹ ہے۔ اس خبر سے میرا دل بیٹھ گیا۔ میں ان دنوں ورکشاپ چھوڑ چکا تھا اور گوالمنڈی میں ایک سکول میں اردو پڑھا رہا تھا۔ میں نے امی کو نہ بتایا لیکن وہ تو آنکھوں کے اشارے سمجھتی تھیں۔ کہنے لگیں...... ''کیا بات ہے کل سے تم پریشان ہو'' میں نے کہا...... ''نہیں تو'' بولیں...... ''میں تو تمھارے پاس سے گزرنے والی ہوا کے مزاج کو بھی سمجھتی ہوں، بتاؤ کیا بات ہے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ غنشا یاد نے اپنے کسی دوست کے ذریعے یونیورسٹی سے نتیجہ معلوم کرایا ہے۔ میں دو پرچوں میں فیل ہوں۔ بولیں...... ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' میں نے کہا ''آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں'' بولیں...... ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم بہت اچھے نمبروں میں کامیاب ہو گئے ہو''۔ ان کے خواب اکثر سچے ہوتے تھے، خواب دیکھنا ان کی زندگی تھا اور انہی سے یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے۔ میں نے جب میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے کر پڑھنا چھوڑ دیا تو وہ بہت پریشان رہتی تھیں۔ ایک صبح بڑی مطمئن تھیں۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔ ''کیا بات ہے آج بڑی خوش نظر آ رہی ہیں'' بولیں...... ''میں تمہاری پڑھائی کے بارے میں ناامید ہو چکی تھی لیکن رات ایک بزرگ نے خواب میں بتایا کہ تمہارا بیٹا اعلیٰ ترین تعلیم مکمل کرے گا''۔ میں ہنس پڑا، اس واقعہ کے گیارہ سال بعد میں نے ایم۔ اے اور چھتیس سال بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ اس وقت امی کو فوت ہوئے بھی پندرہ سال ہو چکے تھے۔ کاش وہ زندہ ہوتیں؟ بہر حال تین چار دن بعد باقاعدہ رزلٹ آ گیا۔ میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی کالج میں فرسٹ آیا تھا۔ اسی سال پہلی بار پرائیویٹ امیدواروں کو بھی امتحان

دینے کی اجازت ملی تھی۔ انور سدید، طاؤس بانہالی نے پرائیوٹ اور امجد اسلام امجد، جلیل عالی نے اورینٹل کالج سے امتحان دیا تھا۔ انور سدید نے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ چند ماہ بعد مجھے سی بی کالج واہ کینٹ میں لیکچرر کی ملازمت مل گئی۔ علیا چاچا نے جن کا کاروبار ٹھپ ہو رہا تھا اور دکان تقریباً بند ہونے والی تھی، مجھے فوری طور پر دو سوٹ لے کر دیے تاکہ کالج میں مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ میں نے یکم نومبر ۱۹۶۸ء کو کالج جوائن کیا اور ایک ہفتہ بعد ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوگئی اور کالج تین چار ماہ کے لیے بند ہوگئے لیکن تنخواہ ملتی رہی۔

○

بزم میر کے اجلاس کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد ختم ہوگئے۔ حلقۂ ذہن جدید کے نام سے ایک نئی ادبی تنظیم وجود میں آگئی۔ علیم درانی اس کے سیکرٹری اور میں جوائنٹ سیکرٹری نامزد ہوئے۔ مجلس عاملہ میں نثار ناسک، سبط احمد، اعجاز راہی اور سلیم الظفر تھے۔ انھی دنوں ایک اور نوجوان بڑی تندہی کے ساتھ ہمارے حلقہ کے ساتھی بن گئے۔ یہ سلیم کوثر تھے۔ کراچی والے نہیں، ایک عرصہ تک ان کا کلام سلیم کوثر کے نام سے مختلف ادبی رسائل میں چھپتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنا نام سلیم الدین سلیم رکھ لیا۔ ذہن جدید کے اجلاس فوارہ چوک کے ایک ہوٹل میں ہوتے تھے اور جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہاں زیر بحث آنے والے موضوعات بزم میر سے قدرے مختلف تھے۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے فوراً بعد حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس بند ہوگئے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں یہ اجلاس دوبارہ شروع ہوئے۔ آغا بابر سیکرٹری اور ربیعہ فخری جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ حلقے کے یہ اجلاس برٹش کونسل میں ہوتے تھے۔ جہاں آج کل کنٹونمنٹ لائبریری ہے۔ میں پہلی بار غلام رسول طارق کے ساتھ حلقہ میں گیا۔ وہ حلقہ کے پرانے رکن تھے۔ اس زمانے میں حلقہ کا ماحول بڑا مختلف تھا۔ حلقہ کے سینئر ارکان نوجوانوں کے ساتھ بڑی حقارت سے پیش آتے تھے۔ ہمیں اگلی کرسیوں پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی بات کرتے تو

ریکارڈ نہ کی جاتی۔ ماہر رضوی نے اس پر ایک مونولاگ بنایا تھا۔

فرمایا آغا بابر نے

اور جلدی سے لکھا ربیعہ فخری نے

فرمایا یوسف ظفر نے

اور جلدی سے نوٹ کیا ربیعہ فخری نے

فرمایا عزیز ملک نے

اور جلدی سے تحریر کیا ربیعہ فخری نے

اس کے علاوہ کچھ مکھیاں اور مچھر بھی بھنبھنائے

مگر ان کو تحریر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی

میری بڑی خواہش تھی کہ حلقہ میں کوئی افسانہ پڑھوں۔ غلام رسول طارق نے آغا بابر سے کہا کہ اس نوجوان کا نام آئندہ دو ماہی میں شامل کر لیں۔ آغا بابر کہنے لگے۔ ''طارق صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، کیا آپ کو حلقہ کی روایات اور معیار کا علم نہیں۔ دو ماہی پروگرام میں نام کیسے شامل کرلوں۔ ہاں آپ کی سفارش پر یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اپنی دو ایک کہانیاں میرے پاس جمع کرادیں۔ اگر کوئی پروگرام مس ہو گیا تو میں پڑھوادوں گا'' میں نے کہانیاں اس کے پاس جمع کرادیں۔ عرصہ تک کوئی پروگرام خالی نہ گیا۔ اجلاس شروع ہونے سے پہلے میں دعا کرتا یا اللہ آج فلاں صاحب نہ آئیں۔ دیر ہو جاتی لیکن وہ صاحب آ جاتے۔ آخر خدا خدا کر کے ایک دن کوئی صاحب شیڈول کے مطابق نہ آئے۔ آغا بابر نے مجھ پر بڑا احسان کرتے ہوئے رجسٹر سے کہانی نکال کردی۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کئی جگہ تلفظ غلط ہو گیا ایک آدھ جملہ بھی ادھر اُدھر ہو گیا۔ صدر جلسہ نے اظہار کی دعوت دی تو سینئر ارکان میں سے کسی نے کہا ''اس شخص کا تو تلفظ ہی درست نہیں۔ سیکرٹری کو چاہیے کہ آئندہ کسی نئے شخص سے کچھ پڑھوانے سے پہلے چیک کر لے

کہ اسے پڑھنا بھی آتا ہے؟'' اس پر بحث چل نکلی کہ بحث ہونی بھی چاہیے یا نہیں۔ میرے دوست بھی محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے شور مچا دیا۔ آخر گفتگو شروع ہوئی۔ سینئر شرکاء نے میری کھال کھینچ دی۔ میں بڑا مایوس ہوا لیکن پڑھنے کی جھجک ختم ہو گئی۔ اس کے بعد محفوظ نگارشات کے تحت میں نے دو تین افسانے اور پڑھے۔ آغا بابر کو شاید میری استواری پر ترس آ گیا۔ ایک دو ماہی پروگرام میں انہوں نے میرا نام شامل کر لیا۔ اتنی خوشی مجھے کسی رسالے میں چھپنے سے نہیں ہوئی جتنی اس دو ماہی پروگرام میں نام آنے سے ہوئی۔ میں نے حلقہ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میری ساری ادبی تربیت حلقہ کے حوالے سے ہے اور سچی بات ہے یہ جو دو چار الٹے سیدھے لفظ لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے، یہ حلقہ ہی کی دین ہے۔ حلقہ برداشت پیدا کرتا ہے۔ چمڑی ادھڑوا کر بھی خاموش رہنا، ایک بڑی ریاضت کی تیاری ہے جس کی تربیت حلقہ ہی سے ہوتی ہے۔

ہم لوگ اب باقاعدگی سے حلقہ کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ سرور کامران بھی پنڈی آ گئے تھے اور ہماری شام کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہم لوگ حلقہ میں جاتے تو ضرور تھے لیکن وہاں ہمارے ساتھ جو توہین آمیز برتاؤ ہوتا تھا اس سے ہم بڑے دل برداشتہ تھے چنانچہ ہم لوگوں نے ''لکھنے والوں کی انجمن'' کے نام سے ایک نئی ادبی تنظیم قائم کر لی جس کے اجلاس ڈینیز ہائی سکول میں ہونے لگے۔ اس دوران اختر احسن اور کمال مصطفٰے نے پنڈی کلچرل فورم کے نام سے ایک انجمن قائم کی، اس کے اجلاس حیدر روڈ پر ایک ہوٹل میں ہوتے تھے لیکن یہاں بھی وہی بات تھی، یہ دونوں بھی سماجی رتبے کے مارے ہوئے تھے۔ راولپنڈی کی ادبی تاریخ میں ''لکھنے والوں کی انجمن'' کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ نئے رجحانات اور رویوں کے فروغ میں اس کے جلسوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں صرف تخلیقات ہی تنقید کے لئے پیش نہیں ہوتی تھیں بلکہ مختلف اہم کتابوں، موضوعات اور

رویوں پر بھی خصوصی اجلاس ہوتے تھے۔ ''اس نظم میں'' اور ''اس افسانے میں "کے تحت قلمکار کا نام بتائے بغیر تخلیق جلسہ میں پیش ہوتی کھل کر بحث ہوتی۔ جلسے کے آخر میں قلمکار کا نام بتایا جاتا۔ انجمن کے اجلاسوں میں میرے، سرور کامران، بشیر صرفی، اعجاز راہی، شبنم مناروی، بشیر سیفی، نثار ناسک، سلیم الظفر، منشایاد کے ساتھ ساتھ ہم سے ذرا سینئر نسل کے ادباء میں سے احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم بھی باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔

انجمن کے اجلاسوں میں بہت سی اہم کتابوں پر بھی خصوصی اجلاس ہوئے ان میں سے کئی جلسوں کی صدارت کے لیے وزیر آغا سرگودھا سے آئے۔ ان کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج،، پر ایک خصوصی نشست ہوئی۔ یہ کتاب اپنے عہد کی بڑی ہی متنازع کتاب تھی۔ اسی کتاب کے حوالے سے آغا صاحب پر دھرتی پوجا کا بے بنیاد الزام لگایا گیا۔ انجمن کے جلسوں میں ادب کے علاوہ موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ بھی زیر بحث آتے تھے اور مہینہ میں ایک آدھ نشست ان فنون کے لیے مختص تھی، جس کی وجہ سے یہ انجمن صرف ادیبوں کی ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر فنکاروں کا ایک اہم پلیٹ فارم بن گئی۔ اس انجمن کے سیکرٹریوں میں میرے علاوہ اعجاز راہی، سرور کامران، نثار ناسک، بشیر صرفی، شبنم مناروی اور منشایاد شامل ہیں۔ اسلام آباد اب تک پنڈی ہی کا ایک حصہ تصور ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ آبادی کے بڑھ جانے اور پھیلاؤ سے اسلام آباد کا ایک علیحدہ وجود قائم ہونے لگا۔ منشایاد نے انجمن کی ایک ذیلی شاخ وہاں قائم کر دی۔ اس کے اجلاس پہلے جمعہ اور پھر ہفتہ کی شام کو ہونے لگے۔ ہم سب لوگ باقاعدگی سے ان جلسوں میں شریک ہوتے۔ اسلام آباد سے انوار صولت، رخسانہ صولت، ایس۔ اے ناز ان جلسوں میں مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ انجمن کی ان دونوں محفلوں میں معمول کے تنقیدی جلسوں کے علاوہ مہینے میں ایک آدھ بار خصوصی نشست بھی ہوتی تھی۔ وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' پر جو گفتگو ہوئی اور مضامین پڑھے گئے وہ

سجاد نقوی کی مرتب کردہ کتاب ''اردو شاعری کے مزاج پر ایک نظر'' میں شامل ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ہونے والے کئی خصوصی جلسوں کی کارروائیاں متعدد اچھے رسائل میں شائع ہوئیں۔ انجمن کے بعض جلسوں میں کسی ایسے شخص کی تخلیق بھی پیش کی جاتی جو پنڈی میں موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح کا ایک سلسلہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں بھی شروع ہوا۔ صبا اکرام، ادیب سہیل، محمود واجد، شہزاد منظر نے وہاں کئی ادبی جلسوں میں میرے افسانے پڑھے اور ان پر تنقید ہوئی۔ ان دوستوں سے اسی زمانے میں خط و کتابت کے ذریعے شناسائی کا وہ سلسلہ اور تعلق شروع ہوا جو اب تک قائم ہے۔ ان میں سے ادیب سہیل تو کچھ عرصہ ملازمت کے سلسلے میں پنڈی میں بھی رہے۔

انجمن کے جلسوں کے ساتھ ساتھ ہم حلقہ میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ ان میں اب مشتاق قمر اور رشید نثار بھی شامل ہو گئے تھے۔ باقر علیم قدرے تاخیر سے ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ رشید نثار کوئٹہ سے ٹرانسفر ہو کر پنڈی آ چکے تھے۔ حلقہ کی سیاست پر یوسف ظفر، عزیز ملک، صدیق اثر، منیر احمد شیخ چھائے ہوئے تھے۔ ضیا جالندھری اُس زمانے میں کراچی میں تھے۔ مہینے دو مہینے بعد وہ دفتری کام کے سلسلے میں پنڈی آتے تو حلقہ یاترا ضرور کرتے۔ بزرگ دوستوں میں سے منظور عارف واحد شخصیت تھے جو ترقی پسند ہونے کے باوجود باقاعدگی سے حلقہ میں آتے اور شام کو بھی ہمارے ساتھ بیٹھتے۔ شہر میں سینئر ترقی پسندوں میں سے جمیل ملک، احمد ظفر تو حلقہ کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔ افضل پرویز البتہ کبھی کبھار آ نکلتے۔ حلقہ میں بقول ماہر رضوی ہماری باتوں کو مچھر کی بھنبھناہٹ سمجھا جاتا تھا۔ ہماری باتیں نوٹ ہی نہ کی جاتیں۔ آہستہ آہستہ اس کا ردِ عمل ہونے لگا۔ گزشتہ اجلاس کی کارروائی کی توثیق پر لمبا جھگڑا ہو جاتا۔ ہمارے اس رویّے نے ربیعہ فخری کو قدرے چوکنا کر دیا اور وہ ایک آدھ جملہ کاروائی میں شامل کرنے لگ گئیں۔ اجلاس کے دوران بھی صدر کی کوشش ہوتی کہ ہمیں جہاں تک ممکن ہو نظر انداز

کریں، ایک بار ضیا جالندھری آئے ہوئے تھے۔ کسی نظم پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سرور کامران نے کئی دفعہ بولنے کی کوشش کی لیکن صدر کسی اور کی طرف اشارہ کر دیتے۔ ضیا جالندھری نے بھی بات کی۔ سرور کامران بولنے لگے تو صدر نے کہا ''میرا خیال ہے ضیا صاحب کے بعد اب اس موضوع پر بات کرنے کی گنجائش نہیں''۔ سرور کامران نے کہا۔ ''اگر ضیا صاحب کے بعد انسانی پیدائش رک گئی ہے تو پھر ٹھیک ہے'' رفتہ رفتہ ہمارے رویے میں تشدد آنے لگا۔ ہم سات آٹھ لوگ ایک ساتھ اندر داخل ہوتے اور جو چیز پڑھی جاتی اس پر اتنی تنقید کرتے کہ پڑھنے والا قسم کھا کے جاتا کہ دوبارہ حلقے میں نہیں آئے گا۔ ایک بار سید فیضی نے غالب پر نظم پیش کی۔ نظم پڑھنے سے پہلے انہوں نے شاعرانہ تعلّی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اس نظم کو سن کر غالب بھی پھڑک اٹھیں گے۔ غالب تو کیا پھڑکتے لیکن ہم لوگوں نے انہیں ایسا پھڑکایا کہ وہ آدھے جلسے ہی میں غصے سے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے...... ''میں فلاں ہوں اگر دوبارہ حلقے میں آؤں''

اس رویے کا ایک مثبت اثر بھی ہوا، لوگ ہماری بات سننے لگے۔ بدتمیزی اپنی جگہ لیکن ہماری گفتگو ہوتی تھی منطقی اور استدلالی۔ اس پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ آج کے نوجوان کی طرح ہم صرف زبانی باتیں نہیں کرتے تھے۔ کوئی تازہ رسالہ اور کتاب ایسی نہ ہوتی جسے ہم فرداً فرداً نہ پڑھتے اور شام کی محفلوں میں اس پر تفصیلی گفتگو نہ ہوتی۔ ہمارا مطالعہ بھی بڑا اپ ٹو ڈیٹ تھا۔ نئے ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کی بھی شُد بُد تھی۔ چنانچہ جب ہم میں سے کوئی بات کرتا تو تمام تر اختلاف کی باوجود اسے سنا جاتا۔ اب ہم لوگ حلقہ میں پورے طرح داخل ہو چکے تھے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ لکھنے والوں کی انجمن رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی اور بالآخر بند ہو گئی۔ آغا بابر کئی سالوں سے حلقہ کے مستقل سیکرٹری چلے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ربیعہ فخری جوائنٹ سیکرٹری تھیں۔ کچھ ہمارے اعتراضات اور کچھ دوسروں کے محسوس کرنے کی وجہ سے حلقے میں الیکشن کی بات شروع ہو گئی۔ آغا بابر بڑی مشکل سے تیار ہوئے۔ پہلا الیکشن بڑا کانٹے دار

تھا۔ آغا بابر خود تو کھڑے نہ ہوئے انھوں نے اپنی طرف سے کرم حیدری کو سیکرٹری اور پروفیسر ارزش کو جوائنٹ سیکرٹری کھڑا کیا۔ دوسری طرف سے تابش صدیقی اور آمیع آہوجہ کھڑے ہوئے۔ آمیع آہوجہ کراچی سے پنڈی آگئے تھے۔ کرم حیدری اور ارزش دونوں ہی شریف آدمی تھے لیکن ادبی سیاست کی وجہ سے الیکشن ہار گئے اور حلقہ کو آغا بابر کی صاحبیت سے نجات مل گئی۔

ہم لوگ حلقہ میں فعال تو بہت تھے لیکن الیکشن جیتنے کا موقع نہ تھا کہ ہم میں سے صرف میں ہی حلقہ کا رکن تھا، وہ بھی مجھے معلوم نہیں کیسے بن گیا۔ نثار ناسک ان دنوں ایک ہفت روزہ سے وابستہ تھا اور اس میں ہفتہ وار ادبی کالم لکھتا تھا۔ اس نے اپنے ایک کالم میں لکھا کہ ہم ''ان بوڑھے ادیبوں کی قبروں پر جوتوں سمیت چڑھ جائیں گے اور انہیں روند ڈالیں گے''۔ حلقہ میں جب بھی رکنیت سازی کا مرحلہ آتا یہ کالم آڑے آجاتا۔ اس زمانے میں توصیف تبسم بھی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انہوں نے خاص طور پر نئے لوگوں کے رکن بننے پر پابندی لگوائی۔ اگلے سال الیکشن کا مرحلہ آیا تو دو واضح گروپ سامنے آگئے۔ ایک طرف یوسف ظفر اور عزیز ملک تھے اور دوسری طرف نئے لکھنے والے۔ یوسف ظفر بڑے جذباتی شخص تھے۔ وہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ''میں فلاں ہوں اگر ان لوگوں کو حلقے میں آنے دوں''۔ الیکشن تو ہم لوگ ہار گئے لیکن مجلس عاملہ میں ہمارے دوست آگئے چنانچہ سب لوگ رکن بن گئے۔ اس کے بعد حلقہ کا پانسہ پلٹ گیا۔ سینئر لوگوں میں سے فتح محمد ملک آخری سیکرٹری تھے۔ اس کے بعد شبنم مناروی، سرور کامران، مظہر الاسلام، قمر جاوید، اعجاز راہی، ضمیر نفیس اور میں حلقہ کے سیکرٹری ہوئے۔ یہ نظریاتی آویزش کا بدترین دور تھا۔ پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کی سیاست نے سارے ملک کو دائیں اور بائیں کے خانوں میں بانٹ دیا تھا۔ ادیب بھی اس سے نہ بچے۔ حلقہ بھی اس تقسیم کی زد میں آگیا۔ احسان اکبر، جلیل عالی ایک گروپ اور ہم دوسرا گروپ بن گئے۔ الطاف احمد قریشی جو مساوات کے چیف رپورٹر رہ چکے تھے، مساوات کی ملازمت چھوڑ کر فیملی

پلاننگ میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشن بن کر پنڈی آ چکے تھے اور ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ حلقہ کے ہر الیکشن میں برسہابرس یہ نظریاتی آویزش جاری رہی لیکن ہم ہر بار الیکشن جیت جاتے، البتہ ایک بات ہے کسی گروپ نے کبھی حلقہ کا بائیکاٹ نہیں کیا۔ الیکشن کے فوراً بعد معمول کے جلسے شروع ہو جاتے۔ یہ حلقہ کی تربیت تھی کہ جلسہ کے دوران ایک دوسرے کی کھال کھینچ دو لیکن بعد میں چائے اکٹھی پینی ہے۔ کاش حلقہ کی یہ روایت ہمارے سیاستدانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ ہارنے والا گروپ پورا سال کوئی گڑ بڑ نہ کرتا۔ سب ایک ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ نظریاتی آویزش ختم ہوئی تو حلقہ کے الیکشن کی شدت میں بھی کمی ہوتی گئی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کوئی سیکرٹری بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ حلقہ کا یہ زمانہ اس کی تاریخ کا بدترین دور ہے۔ اس دور میں کوئی قابلِ ذکر ادیب حلقہ میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بے وزن اشعار تنقید کے لئے پیش ہوتے۔ باقاعدہ پروگرام بننا ختم ہو گیا۔ آخر نہ رہا گیا اور ہم لوگوں نے دوبارہ حلقہ میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان تین چار سالوں میں ہم میں سے شاید ہی کوئی حلقہ میں گیا ہو۔ ایک طرح دیکھا جائے تو لڑ کر، بلکہ دھونس کے ساتھ میں نے حلقہ کا رجسٹر چھینا اور سعید احمد سے درخواست کی کہ وہ حلقہ کا انتظام سنبھالیں۔ سعید احمد، داؤد رضوان، شعیب خالق، اختر عثمان، اشرف سلیم، جہانگیر عمران، تابش کمال، عابد سیال اور جوہر حیات نے بڑی محنت سے حلقے کو نئی زندگی دی۔

O

میرے دوستوں میں تین شخص ایسے ہیں جنہیں امی بہت پسند کرتی تھیں۔ یہ اعجاز راہی، منشایاد اور عزیز الرحمٰن ہیں۔ اعجاز راہی کی والدہ بچپن میں فوت ہو چکی تھیں، امی کی صورت مل گئیں۔ منشایاد کی اپنی والدہ بھی بچپن میں ہی مر چکی تھیں۔ عزیز الرحمٰن اگرچہ خود ادیب نہ تھا لیکن ادب کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ میرے ساتھ اس کے تعلقات کا یہ حال تھا کہ حلقہ کا رکن نہ ہونے کے باوجود وہ ہماری پوری سیاست میں شامل تھا۔ دستاویز کا ڈیکلریشن اسی کے نام پر لیا

گیا تھا۔ ان تینوں کو پسند کرنے کی وجہ ان کا پینڈو پن تھا۔ امی خود سادہ تھیں، سادگی کو پسند کرتی تھیں۔ یہ تینوں انہیں بڑے اچھے لگتے تھے۔ ان سے میرے ملنے پر انہیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ منشایاد کے گھر میں دو دو دن رہتا۔ وہ کبھی نہ روکتیں۔ بس انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں منشایاد کے ساتھ ہوں۔ اعجاز راہی سے میرا تعلق ورکشاپ میں جاسوسی کتابوں کے تبادلے سے شروع ہوا۔ مجھے لکھنے کی تحریک اسی نے دی اور وہی مجھے ادبی حلقوں میں لے کر آیا۔ اعجاز راہی لال کرتی میں اور میں کشمیری بازار میں رہتا تھا۔ دن کا بڑا حصہ ہم ورکشاپ میں ساتھ ہوتے لیکن اس کے باوجود شام کو ملنا لازمی تھا۔ اتوار ایک ساتھ گزرتی۔ وہ شام کو شہر آجاتا۔ اس زمانے میں ہم پنڈی ہوٹل سے نکل کر پولی ویل میں بیٹھنے لگے تھے، جو فوارہ چوک میں تھا۔ نو بجے کے قریب اٹھتے تو میں اعجاز راہی کو چھوڑنے صدر تک آتا۔ باتیں کرتے کرتے ہم مال روڈ تک جا پہنچتے۔ اعجاز راہی کہتا ..... "یار تم تو بہت دور نکل آئے ہو، چلو تھوڑی دور میں تمہیں چھوڑ دوں" ہم باتیں کرتے مڑتے اور صدر پہنچ جاتے اب میں کہتا ..... "یار تم بہت دور نکل آئے ہو، چلو تمہیں ذرا آگے کر آؤں"

اسی طرح دو دو تین بار ہم ایک دوسرے کو آگے پیچھے کرتے رہتے۔ ہماری باتیں ختم ہونے ہی میں نہ آتیں۔ ہم دنیا بھر میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ دنیا بھر میں تو ہم خیر کیا انقلاب لاتے، اپنی زندگی میں بھی کوئی بڑی تبدیلی نہ لاسکے۔ ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح گزر گئی۔ لیکن ہم خواب دیکھنے والے تھے۔ جن کی بے تاب تمنائیں اظہار کے لئے مچل مچل رہی تھیں۔ ہم نے ورکشاپ آگے پیچھے ہی چھوڑی۔ میں سکول میں چلا گیا اور اعجاز راہی نے جی ٹی ایس میں شمولیت کر لی اور کنڈیکٹر بن گیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات بھابھی نرگس سے ہوئی۔ عشق کا شعلہ دونوں طرف بھڑک اٹھا۔ اعجاز راہی کے والد ابھی حیات تھے۔ لیکن گھر میں بڑے بھائی ربانی کی آمریت تھی۔ یہ لوگ خالص پٹھان تھے اور نرگس بھابھی اردو بولنے والی۔ بڑی مشکل

آن پڑی۔ بھابھی کے رشتہ دار بھی ایک کنڈ یلٹر سے انہیں بیاہنے کے لئے رضامند نہ تھے۔تلوار کی دھار کا یہ سفر لمبے عرصہ تک چلتا رہا۔بالآخر دونوں فریقوں کو ہار ماننا پڑی ملک ربانی نے طوعاً وکرہاً اس رشتہ کو قبول کیا۔ ہمارے دوستوں میں سے اس وقت تک منشا یاد، سمیع آہوجہ اور نثار ناسک ہی شادی شدہ تھے۔ان میں اعجاز راہی کا اضافہ ہو گیا۔

شادی کے فوراً بعد اعجاز راہی کے معمول میں کچھ دن تو فرق پڑا، پھر وہی شب نوردی شروع ہو گئی۔شروع شروع میں ہم ''وو گیز'' میں بیٹھتے تھے۔ یہ پنڈی کا کافی ہاؤس تھا۔ یہاں آنے والوں میں آغا بابر، ممتاز مفتی، منیر احمد شیخ، مختار صدیقی اور کئی لوگ تھے۔شام کی باقاعدہ نشستیں ہوتیں۔بعض شخصیات عجیب وغریب تھیں۔ان میں سے ایک ریاض قادر تھے۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بیوی سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور سارا دن وو گیز ہی میں گزارتے تھے۔کام کاج کوئی نہیں تھا۔آرائے بازار میں اے پی پی کے دفتر کے برابر میں ایک فلیٹ لیا ہوا تھا۔ان کے گرد نوجوانوں کا ایک جمگھٹا رہتا۔سب کو چائے پلاتے، کھانا بھی چل جاتا۔ان کی پرچی چلتی تھی۔لیڈی عبدالقادر دو ایک مہینے کے بعد آتیں۔ باہر گاڑی ہی میں بیٹھی رہتیں۔وو گیز کا منیجر بلوایا جاتا اور جتنی رقم ریاض قادر کے کھاتے میں ہوتی وہ ادا کر دی جاتی، کچھ فالتو بھی دے جاتیں۔ ریاض قادر باہر جا کر ماں سے ملتے۔گاڑی کے باہر سے ہی سلام دعا ہوتی، لیڈی قادر کچھ رقم انہیں بھی دے جاتی۔ ریاض قادر گنجے تھے اور یہ ان کی چڑ بھی تھی۔کوئی بھی ان کے سر کی طرف دیکھتا یا گھورتا تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ وو گیز کا ہال بہت چھوٹا تھا کبھی کبھی باہر کے لوگ بھی چائے پینے آجاتے اور ہماری میزوں پر ہی بیٹھ جاتے۔ایک بار یوں ہوا کہ ایک شخص جس نے پی کیپ پہنی ہوئی تھی، چائے پینے آ گیا۔کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ میں سلیم الدین سلیم اور ریاض قادر ایک میز پر تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ وہ شخص وہاں آ بیٹھا، چائے کا آرڈر دیا اور ریاض قادر کو گھورنے لگا، مسلسل گھورتا رہا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال

تھی۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ ریاض قادر کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھیں لیکن وہ بار بار اس شخص کی طرف دیکھتے، چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، آخر چیخ کر بولے "کیا دیکھ رہے ہیں آپ، یہاں میں گنجا ہوں"۔ اس شخص نے کوئی بات نہ کی خاموشی سے ٹوپی اتار دی، وہ بھی گنجا تھا۔ ایک اور صاحب بھی وو گیز میں آتے تھے ان کا نام ڈاکٹر عینی اخلاقی تھا۔ ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھے۔ شاعری کا شوق تھا۔ الٹے سیدھے شعر کہتے تھے۔۔ انہیں شرط لگا کر جیتنے کا شوق تھا۔ جب ہمارا کھانے پینے کا موڈ ہوتا تو ان سے کوئی الٹی سیدھی شرط لگا لیتے اور پھر جان بوجھ کر ہار جاتے، ڈاکٹر صاحب بڑے فخر سے چاروں طرف دیکھتے اور آواز لگاتے "بہاؤ الدین"۔ بہاؤ الدین وو گیز کا بیرا تھا۔ ایک ایک ادیب کا مزاج شناسا۔ اسے معلوم ہو جاتا کہ کس کی جیب میں پیسے ہیں اور کون خالی جیب ہے لیکن چائے کی طلب رکھتا ہے، وہ چپکے سے چائے کا پیالہ سامنے رکھ کر آنکھ دباتا۔ ادیبوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ اور پدرانہ تھا۔

ایوب خان کا مارشل لاء اپنے جوبن پر تھا۔ الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب اپنی ذہانتوں کے ذریعے اس کی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔ شہاب نے گلڈ کے ذریعے ادیبوں کو اور الطاف گوہر نے لفافوں کے ذریعے صحافیوں کو طرح طرح کی مراعات کا عادی بنانا شروع کر دیا تھا۔ کچہری کے پاس بی این آر کا دفتر تھا (Bureu of National Reconstration)۔ اس دفتر میں الطاف گوہر نے بہت سے ادیب جمع کر لیے تھے ان میں حفیظ جالندھری، ممتاز مفتی، مختار صدیقی، منیر احمد شیخ، سید فیضی، تابش صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں کا کام مارشل لاء کے لیے جواز فراہم کرنا، مارشل لاء کے مخالفین کی ہسٹری شیٹ بنانا، ان کی خامیاں تلاش کرنا تھا۔ اعجاز راہی کے بہنوئی حسین راجہ وہاں پی اے تھے۔ مجیب الرحمن کے چھ نکات بھی یہیں تیار ہوئے تھے۔ ایک بار حسین راجہ نے بتایا کہ الطاف گوہر کا فون آیا کہ سہروردی کے خلاف الزامات تلاش کیے جائیں، ہم ساری رات اخبارات کی فائلیں نکال

کر مواد جمع کرتے رہے۔ الطاف گوہر نے صبح نو بجے وہاں آنا تھا۔ صبح سویرے خبر ملی کہ سہروردی انتقال کر گئے ہیں۔ اسی ادارے کے تحت پاکستان نیشنل کونسل برائے یک جہتی کا قیام بھی مارشل لاء کو ادبی وصحافیانہ تقویت پہنچانا تھا۔ مارشل لاء میں مختلف ایجنسیاں ادبی حلقوں کو بھی مانیٹر کرتی تھیں، کئی باہر کے لوگ آتے اور کئی ادیبوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتیں کہ وہ پے رول پر ہیں۔ ووگیز میں بھی دو ایک شخص ایسے تھے۔ جن کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ کون ہیں، کیا لکھتے ہیں، لیکن وہ باقاعدگی سے آتے تھے اور بڑی توجہ سے ادیبوں کی گفتگو سنتے۔ ووگیز کے مالک فوت ہو گئے تو یہ ٹھکانہ اجڑ گیا۔ ادیبوں کا ٹی ہاؤس شالیمار میں منتقل ہو گیا، جو جی پی او کے برابر میں تھا۔

شالیمار میں یوں تو ادیبوں کے علاوہ بہت سے صحافی بھی آتے تھے۔ ان میں سے سعود ساحر اور نواز رضا تو ایک زمانے میں ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ لیکن الطاف احمد قریشی کے آنے سے پاکستان ٹائمز کے صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی روزانہ آنے لگی۔ ان میں مسعود اللہ خان، سلیم عاصمی وغیرہ شامل تھے۔ سلیم عاصمی نے سرور روڈ پر گھر بنایا تھا۔ ان کی بیگم سی بی سکول مال روڈ میں پڑھاتی تھیں۔ بہت ہی کلچرڈ اور ملن سار خاتون تھیں۔ ان کے لان میں ہم رات گئے تک خوش گپیاں کرتے، کوئی شراب پیتا، کوئی چائے پیتا، ان کی سروس میں فرق نہ پڑتا۔ مسعود اللہ خان ابھی کنوارے تھے اور خدشہ تھا کہ وہ انٹرنیشنل کنواروں میں شامل ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے شادی کر کے یہ موقع ضائع کر دیا۔ ان صحافتی دوستوں کے آنے سے گفتگو کا موضوعاتی دائرہ بڑھ گیا۔ ان میں سے اکثر ادب کے بھی باذوق قاری تھے۔ مسعود اللہ خان تو باقاعدگی سے حلقہ میں بھی آتے تھے اور تخلیقات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی رائے بڑی جچی تلی اور فنی مہارت سے شناسائی کا پتہ دیتی تھی۔

اعجاز راہی مجھ سے ذرا پہلے ہی ورکشاپ چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ جی ٹی ایس میں

چلا گیا۔ ورکشاپ کی نوکری کے دوران مزدور سرگرمیوں کا تو کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جی ٹی ایس میں جا کر وہ ان میں اتنا ملوث ہوا کہ کچھ عرصہ کے لیے اس کی ادبی سرگرمیاں خاصی کم ہو گئیں۔ اعجاز راہی جی ٹی ایس میں تقریباً دس سال رہا، وہ وہاں کی یونین کا رکن اور بعد میں عہدیدار بھی بن گیا۔ اس کا رابطہ شہر کی دوسری مزدور یونینوں سے بھی ہو گیا۔ اعجاز کے توسط سے میں بھی ان سے متعارف ہوتا رہا اور کسی نہ کسی حد تک دور دورے میں بھی ان سرگرمیوں میں شریک رہا۔ اس دوران بی ڈی نظام اپنے عروج سے اپنے زوال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اعجاز راہی پنڈ دادن خان ٹرانسفر ہو گیا۔ اسی زمانے میں الیکشن کا ڈونگا پڑا۔ مادرِ ملت متحدہ محاذ کی امیدوار بن کر سامنے آئیں لیکن ڈی ڈی نظام کی وجہ سے ہار گئیں۔ مشرقی پاکستان نے ان کا ساتھ دیا لیکن مغربی پاکستانی ممبروں نے حسب روایت حکومتِ وقت کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اعجاز راہی پنڈ دادن خان سے ایک دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ ہم سارا دن پولنگ بوتھوں کے چکر لگاتے رہے، جانے کیوں ایک امید سی تھی کہ مادرِ ملت جیت جائیں گی۔ رات کو اعجاز راہی میرے ہاں ہی رہا۔ ہم اوپر والے کمرے میں ریڈیو پر نتائج سن رہے تھے۔ دس بجے ایوب خان کے جیتنے کی مبارک بادیں شروع ہو گئیں۔ امی کھانا رکھ گئی تھیں اور نیچے سے کئی بار آوازیں بھی دے چکی تھیں کہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن ہمیں ہوش نہ تھا۔ بتی بجھی ہوئی تھی۔ دس بجے پہلی مبارک باد نشر ہوئی تو ہم نے ریڈیو بند کر دیا اور دیر تک اندھیرے میں خاموش بیٹھے روتے رہے۔ ساری رات روتے رہے۔ امید کا ایک ننھا سا دیا بھی بجھ گیا۔ اگلے دن گوہر ایوب نے کراچی میں، جہاں مادرِ ملت کا زور تھا۔ فتح کا جلوس نکالا، کتوں کے گلوں میں تصویریں لٹکائی گئیں، بے شمار لڑکیوں کو اٹھا لیا گیا۔ ظلم و ستم کی ایک کالی آندھی نے کراچی کو خصوصاً اور پورے ملک کو عموماً اپنے حصار میں لے لیا۔ مکافاتِ عمل دیکھئے کہ تین سال بعد ہی انہی کتوں کے گلے میں ایوب خان کی تصویریں تھیں اور گلی گلی "ایوب کتا" مردہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔

اگلی صبح اعجاز راہی ایک لفظ بولے بغیر واپس چلا گیا۔ ہم ساری رات جاگتے رہے تھے۔ صبح وہ اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے گلی میں آئے، اس نے ہاتھ ہلایا اور آگے نکل گیا۔ میں کچھ دیر گلی میں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا پھر چپ چاپ اوپر آ گیا۔ امی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکی تھیں بولیں ..... ''اعجاز کیوں چلا گیا، ناشتا بھی نہیں کیا'' میں نے کہا ''اسے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا''

دو تین مہینوں بعد اعجاز کی ٹرانسفر مری ہو گئی۔ یہ گرمیوں کا سیزن تھا۔ میں دو تین بار اس کے پاس گیا۔ وہاں سلیم شوالوی اور لطیف کاشمیری سے ملاقات ہوئی۔ اعجاز تین چار مہینے بعد پنڈی آ گیا۔ مزدور سرگرمیاں اب انڈر گراؤنڈ سے نکل کر سطح پر آنے لگی تھیں۔ میں ابھی ورکشاپ ہی میں تھا کہ ستمبر ۶۵ء کی جنگ شروع ہو گئی۔ ایوب خان کی تقریر میں نے ورکشاپ ہی میں سنی۔ ہر جرنیل مصیبت کے وقت قوم کو یاد کرتا ہے اور اس کے لیے قربانی دینے کا عہد دہراتا ہے اور پھر میدان جنگ میں صلح کی شرائط تسلیم کر لیتا ہے۔

۶۵ء کی جنگ ایک نیا تجربہ تھا۔ سر شام شہر کا شہر اندھیرے کی بغل میں ڈوب جاتا۔ کیفے بند ہو گئے۔ میں اور علیم درانی اکیلے شہر کی سڑکوں پر گشت کرتے، کئی بار پولیس ہمیں روکتی اور پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیتی۔ جنگ کے سترہ دن عجب طرح کا ہولناک خواب ہے۔ ہمارا ریڈیو بڑھ چڑھ کر خبریں نشر کرتا لیکن جب اکھنور کے محاذ پر جنرل اختر کی بجائے جنرل یحییٰ کو لگایا گیا تو چہ میگوئیاں شروع ہوئیں جو تاشقند معاہدے پر ختم ہو گئیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں حقائق اب مستند کتابوں میں چھپ گئے ہیں۔ ایوب حکومت نے اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے دس سالہ جشن کا پروگرام بنایا جس کا سارا فائل ورک بی این آر نے کیا۔ شاید اس کا آئیڈیا بھی الطاف گوہر اور شہاب نے دیا ہو۔ اعجاز راہی کے دفتر میں ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر ارباب محمد نیاز تھے۔ بنیادی طور پر ترقی پسند، مزدوروں سے

گہری ہمدردی رکھنے والے۔ وہ یونین کی نئی سرگرمیوں کو نظر انداز کر جاتے، ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ لکھنے والوں کی انجمن کے پہلے جلسے کی صدارت بھی انھوں نے کی تھی۔

یہ جلسہ ایک مشاعرہ تھا جو ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں ہوا۔ الطاف پرواز مہمان خصوصی اور منشور عارف سٹیج سیکرٹری تھے۔ یہ شاید آخری مشاعرہ تھا جو انجمن کے پلیٹ فارم پر ہوا۔ اس کے بعد انجمن کے پروگراموں کی نوعیت اور مقصد ہی بدل گیا۔ پی آئی اے کے مشہور یونین لیڈر اور منشور کے مدیر طفیل عباس نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ پنڈی تک بڑھا دیا۔ یہاں ان کے چھوٹے بھائی زکی عباس پی آئی اے میں تھے۔ وہ قومی مزدور محاذ کے صدر بنے۔ چوہدری عطاء محمد خارجی امور کے انچارج تھے۔ دوسرے لوگوں میں چوہدری اسلم جو آج کل ایڈووکیٹ ہیں اور محمد اختر، وہ بھی وکالت کر رہے ہیں شامل تھے۔

اعجاز راہی بھی اپنی یونین کی طرف سے اس محاذ کے لیے نامزد ہوا۔ قومی مزدور محاذ کا ایک سٹڈی سرکل بھی تھا۔ اعجاز راہی مجھے بھی وہاں لے گیا۔ میں ترقی پسند خیالات ضرور رکھتا تھا لیکن سٹڈی سرکل میں جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں جس پہلے اجلاس میں شریک ہوا وہ زکی عباس کے گھر تھا۔ زکی عباس ظفر الحق روڈ پر رہتے تھے۔ اجلاس میں جو باتیں ہوئیں وہ میرے لئے نئی نہ تھیں۔ درمیان میں ایک تجزیہ پڑھا گیا۔ یہ تجزیہ ایک رجسٹر میں درج تھا۔ موٹا رجسٹر تھا، دس بارہ صفحے پڑھ کر اس پر بحث ہوئی۔ اگلی نشست چودھری اسلم کے ہاں ہوئی، پھر اعجاز راہی کے یہاں، پھر میری باری آ گئی۔ دستور تھا کہ نشست باری باری ہر رکن کے گھر ہوگی۔ ان لوگوں کا نشست میں آنے کا عجب پراسرار طریقہ تھا۔ سارے ایک ساتھ نہیں آتے تھے، وقفہ وقفہ سے آتے، پراسرار طریقے سے ادھر ادھر دیکھتے اور جلدی سے اندر آ جاتے۔ انھیں ڈر تھا کہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ہمارے ادیبوں، دانشوروں اور سیاستدانوں کو یہ بڑی حسرت ہے کہ وہ پکڑے جائیں اور اخبار میں نام آ جائے۔ خیر ایک ایک کر کے سارے پہنچ گئے۔ رجسٹر

کھولا گیا اور پڑھا جانے لگا میں اب تک اس کے کافی حصے سن چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ ایک خفیہ تجزیہ ہے، ایک خفیہ ڈاکومنٹ۔ اس بار میں نہ رہ سکا۔ میں نے کہا ''اس میں خفیہ بات کیا ہے اس طرح کے تجزیے تو اب ہر ریڑھی، ہر دکان کے تھڑے پر ہو رہے ہیں''۔

زکی عباس بولے ''کامریڈ تمھیں نہیں معلوم، حکومت ایسے تجزیے کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی''۔ میں نے کہا ''آپ اگلی اتوار میرے ساتھ حلقہ میں چلیں'' میں اگلی اتوار انھیں حلقہ میں لے گیا۔ وہاں ایوب حکومت اور موجودہ نظام کے خلاف ایسی ایسی باتیں ہو رہی تھیں کہ زکی عباس حیران رہ گئے۔ اکثر ترقی پسندوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی کھوہ میں آنکھیں بند کیے بیٹھے مارکس کی کتابوں کا ورد کر رہے ہیں انھیں خبر ہی نہیں کہ باہر کیا کچھ ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے اصحابِ کہف لگتے ہیں۔

بہر حال اب متحدہ مزدور محاذ کے قدرے پڑھے لکھے لوگ حلقہ میں بھی آنے لگے۔ ان کے آنے سے بحث میں شدت آ گئی۔ ۱۹۶۸ء کی تحریک اور سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر تو آگے آئے گا، پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ بھٹو سے ہمیں بڑی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن سال بھر بعد ہی یہ خواب ٹوٹنے لگے۔ اس دوران متحدہ مزدور محاذ کا سٹڈی سرکل بھی چلتا رہا، جہاں خارجی اور داخلی معاملات پر تجزیے پیش کیے جاتے اور بحث ہوتی۔ کراچی میں مزدوروں پر گولی چلی تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں بھٹو کا پر جوش حامی تھا۔ لیکن مجھے لگا کہ میں پھر بیوقوف بن گیا ہوں۔ میں نے کہانی لکھی ''بے پانی کی بارش'' یہ کہانی میرے پہلے مجموعے ''بے زار آدم کے بیٹے'' (۱۹۷۳ء) میں شامل ہے۔ اس کہانی کا انجام یہ تھا کہ مرکزی کردار اپنی جیب سے سکے نکال کر دور پھینکتے ہوئے کہتا ہے کہ اس بار میرے سکے پھر کھوٹے نکلے۔ کہانی حلقہ میں پڑھی تو زوردار بحث ہوئی۔ پیپلز پارٹی کے مخالفین نے بڑی تعریف کی۔ نظریاتی دوستوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ میرے کامریڈ ساتھی بھی اجلاس میں موجود تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو زکی عباس مجھے ایک

طرف لے گئے بولے'' کامریڈ کہانی تو ٹھیک ہے لیکن اس کا انجام ٹھیک نہیں'' میں نے پوچھا ''انجام کیوں ٹھیک نہیں''۔ بولے'' آخر میں سارے سکے پھینک دینے کا مطلب مکمل مایوسی ہے جو مارکسی نقطۂ نظر سے درست نہیں''

میں نے کہا '' دیکھو کامریڈ یہ افسانہ ہے اور اس کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں'' میں کافی عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ قومی مزدور محاذ کے ساتھ میرا چلنا اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ادیب شاعر کی ایک عادت ہے ہر شے کی تہہ میں اتر کر دیکھنا، حلقہ کی تربیت بھی یہی تھی کہ شخص نہ دیکھو کام دیکھو اور کام کو اس کے وسیع تر پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ ان کی نجی اور باہری زندگی میں بڑا تضاد ہے۔ دوسروں کو یہ ڈی کلاس ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور ان کی اپنی زندگیاں ہر آسائش سے پُر ہیں۔ چودھری عطا دواؤں کا ہول سیل کام کیا کرتے تھے، اچھے گھر میں رہتے۔ ایک بار انھوں نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ ڈائننگ ٹیبل پر نوکروں نے کھانا لگایا۔ چودھری صاحب کہنے لگے'' دیکھیں نا نوکر تو آج کی ضرورت ہیں لیکن میرا رویہ ان کے ساتھ آقا اور نوکر کا نہیں۔ یہ اپنا کام کرتے ہیں میں اپنا، لیکن ہم مل کر کھانا کھاتے ہیں'' یہ چودھری صاحب کی مجرم ضمیری تھی ورنہ ان سے کسی نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اکثر ترقی پسندوں کا یہی حال تھا۔ احمد داؤد نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ عبداللہ ملک سے ملنے ان کی کوٹھی گیا۔ اس زمانے میں وہ احتساب نکال رہے تھے۔ آزاد کوثری احتساب کا کام کرتے تھے اور باہر والے کمرے میں دفتر تھا۔ عبداللہ ملک نے احمد داؤد کو کھانے پر روک لیا۔ کھانا کھانے لگے تو احمد داؤد نے کہا'' کوثری کو بھی بلا لیں'' عبداللہ ملک بولے'' میں نوکروں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا''۔

ترقی پسندوں کے اسی ظاہری اور اندرونی تضاد نے تحریک میں برکت نہیں پیدا ہونے دی۔ بات اپنے وقت سے پہلے آ گئی ہے لیکن اس تسلسل میں بیان کر دوں کہ احتساب ضیا مارشل

لاء کے دور میں نکلا۔اس کے دو شمارے چھپے۔عبداللہ ملک نے ہر لکھنے والے سے کہا کہ وہ پرچہ خریدے کیونکہ یہ پرچہ بازار میں تو بکے گا نہیں اور یہ مارشل لاء کے خلاف ایک جہاد ہے۔ میرے،منشاء،داؤد اور اعجاز کے افسانے دوسرے شمارے میں شامل تھے۔احمد داؤد نے پرچے منگوائے اور ہم سب کو قیمتاً دیے،ایک طرف تو مارشل لاء کے خلاف لکھ کر ہم نے اپنی نوکریوں کا رسک لیا تو دوسری طرف رسالے کی قیمت ادا کی۔

عبداللہ ملک نے بعد میں سارا رسالہ روسی ایمبیسی کو بیچ دیا۔ان سے مدد لی کہ مارشل لاء کے دور میں یہ خدمت سرانجام دی ہے اور بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ظہیر کاشمیری جیسے چند مخلص ترقی پسندوں کو چھوڑ کر یہ منافقانہ رویہ اکثر ترقی پسندوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔نئی نسل میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔۱۹۶۸ء میں یہی رویہ ناوابستگی کے نعرے کی صورت نئی لسانی تشکیلات کا حصہ بنا اور ۱۹۶۸ء کی تحریک کے حوالے سے جب نظریاتی فکر کا ایک نیا دور شروع ہوا اور اکثر نئے لوگ اس کا اعتراف کرنے لگے تو ترقی پسندی کی بجائے نوترقی پسندی کا آغاز ہوا۔

۱۹۷۳ء میں، میں قومی مزدور محاذ کے سٹڈی سرکل سے جدا ہو گیا۔اس کی بنیادی وجہ وہ نظریاتی اختلافات اور طریقۂ کار تھا جو عرصہ سے مجھے برگشتہ کیے جا رہا تھا،دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ۱۹۷۳ء میں اعجاز راہی جی ٹی ایس چھوڑ کر پی آئی اے میں چلا گیا اور اس کی پوسٹنگ پشاور ہو گئی۔رابطہ کا یہ ذریعہ ٹوٹ جانے سے جو رسمی سا تعلق تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

اعجاز راہی کے بعد جس شخص سے میری رفاقت کا دورانیہ بہت طویل ہے وہ منشایاد ہے۔منشایاد سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ابھی میں نے لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔مری سے واپسی پر جب اس نے مجھے ادبی حلقوں میں اتنا فعال دیکھا تو لازماً اسے حیرت ہوئی،لیکن ہمارے پرانے تعلقات پھر استوار ہو گئے۔منشایاد ابھی تک فلمی پرچوں کے سحر میں گرفتار تھا،یہاں شہرت تو بہت تھی لیکن وقتی،منشاء کو اس کا چسکا پڑ گیا تھا۔یہ چسکا ہمیشہ اس میں

موجود رہا۔ پنتالیس چھیالیس سال کی اس طویل رفاقت میں میرے اور اس کے درمیان ورکنگ ریلیشن کبھی ختم نہیں ہوئے۔ قسم اٹھا کے تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی غیر حاضری میں اختلاف نہ کرتا ہو گا لیکن میری اور اس کی آنکھوں میں ایک دیہاتی شرم ایسی ہے کہ ہم نے کبھی منہ پر ایک دوسرے سے بدلحاظی نہیں کی اور اگر کچھ لوگ ہمارے درمیان نہ آتے تو وقتی طور پر کبھی کبھی جو بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی وہ بھی نہ ہوتی۔

اسلام آباد آ کر منشا یاد پنڈی کے ادبی حلقوں اور شام کی محفلوں میں باقاعدگی سے آنے لگا۔ اس کے پاس سکوٹر تھا۔ پنڈی ہوٹل کے بعد جب ہم نے وو گیز اور پھر شالیمار میں بیٹھنا شروع کیا تو وہ تقریباً ہر شام وہاں موجود ہوتا۔ اکثر اتواریں میں اس کے گھر گزارتا۔ اس وقت وہ میلوڈی کے سامنے سرکاری گھر میں رہتا تھا۔ ایس اے ناز کا گھر پچھلی گلی میں تھا۔ میں ہفتہ کی شام وہاں پہنچ جاتا۔ ساری رات گراموفون ریکارڈ سنتے، منشا یاد نے کوئی تازہ کہانی لکھی ہوتی تو اس پر بحث کرتے۔ صبح کا ناشتا، پھر دوپہر کا کھانا کھا کر میں وہاں سے چلتا، کبھی شام بھی ہو جاتی اور ہم سکوٹر پر سیدھے حلقہ کے جلسہ میں پہنچتے۔ عجیب بات تھی کہ امی خوشی سے مجھے کہیں جانے نہیں دیتی تھیں اور رات باہر رہنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، لیکن منشا یاد کے گھر جانے کی اجازت تھی۔ منشا کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ لتا اس کا کریز تھا۔ ہر بہلی کو وہ میری طرف آتا۔ ہم راجا بازار جاتے اور منشا یاد وہاں سے نئے ریکارڈ خرید تا۔ ہم اسے توا کہتے تھے۔ پھر ہم راجا بازار میں کسی گانے والے ہوٹل میں بیٹھ جاتے، فرمائشی چٹیں لکھ کر بھیجتے، چائے پیتے اور دیر تک پسند کے گانے سنتے۔ اس وقت عام شخص میں بھی موسیقی کا اعلیٰ ذوق تھا۔ اب تو میڈیا نے اسے ایسا بگاڑا ہے کہ مہدی حسن اور فریدہ خانم ہوٹ ہو جاتے ہیں اور ٹھمر کنے والا لونڈا داد سمیٹتا ہے۔

راجا بازار میں لحافوں کی ایک دکان تھی۔ اس کے مالک ایک سفید ریش تھے، انہیں سینما ہال میں رقص کرنے کا جنون تھا۔ اس دور میں واحد تفریح سینما ہی تھا۔ جب بھی کوئی نئی فلم لگتی یہ بزرگ

وہاں پہنچ جاتے، جیسے ہی کوئی گانا شروع ہوتا وہ اپنی جگہ سے اٹھتے، سفید داڑھی، سفید شملہ، رقص کرتے کرتے ایک والہانہ پن ان پر طاری ہو جاتا، کبھی کبھی سٹیج پر بھی چڑھ جاتے۔ اس زمانے میں وہ ہر نئی فلم کے ساتھ ایک خصوصی دلچسپی تھے۔ لوگ خوش ہوتے، یہ بڑا رواداری کا زمانہ تھا۔ کسی نے اعتراض نہ کیا کہ داڑھی رکھ کر سینما میں رقص کیوں کرتے ہو۔ میں اور منشا جب بھی نئے ریکارڈ لینے جاتے ان کے پاس چند لمحے رک کر نئی ورائٹی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے کہ ان کو ایک ایک نئے آنے والے ریکارڈ کی خبر ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بسنت منائی ضرور جاتی تھی لیکن آج کل کی طرح بسنت کا ہوکا نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ ہمارے اپنے تہوار موجود تھے۔ مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع میں کئی موسمی میلے لگتے تھے۔ مارچ کے آخر میں میلہ چراغاں اور اپریل کے شروع میں عرس بری امام اور ملک کے دیگر علاقوں میں بھی یہی صورت حال تھی اس لیے بسنت بھی ایک عام تہوار تھا لیکن جب ہم نے اپنے سارے میلوں کو اوقاف کے حوالے کر کے وہاں قوالیاں شروع کرا دیں تو بسنت کی اہمیت اچانک بڑھ گئی اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ مذہبی حلقوں کی تمام تر مخالفت کے باوجود بسنت منانے کا رجحان بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ کھڑکیاں اور روشندان بند کر دیے جائیں تو ہوا اپنے راستے کسی اور صورت میں ڈھونڈ لیتی ہے۔

ان بڑے میاں کا رقص نہ صرف ان کی اپنی ذات کے لیے بلکہ دوسروں کو لیے بھی حظ آفرینی کا ایک انمول لمحہ تھا۔ اور دیکھا جائے تو یہ رقص ایک طرح کا کتھارسس بھی تھا، جونہی یہ بڑے میاں رقص کے لیے کھڑے ہوتے پورا ہال تالیاں بجانے لگتا۔ مولانا روم نے بھی اسی طرح اپنا کتھارسس کیا تھا، روایت ہے کہ جب ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا اور مجذوب بن کر بازاروں میں پھرنے لگے تو ایک بازار سے گزرتے ہوئے ان پر وجد کی ایک والہانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ہوا یوں کہ اس بازار میں صلاح الدین زرکوب سونا کوٹ رہا

تھا۔ مولانا نے یہ ردھم سنا تو اس پر رقص شروع کر دیا۔ پھر یہ معمول ہو گیا کہ جیسے ہی مولانا آتے صلاح الدین زرکوبی شروع کر دیتا۔ اس مجذوبانہ رقص نے مولانا کو دوبارہ نارمل کر دیا۔

اس زمانے میں رقص کی یہ محفلیں خواص کے لیے تو بالاخانوں اور حویلیوں میں منعقد ہوتی تھیں لیکن سال میں ایک آدھ بار عوام بھی ان سے لطف اندوز ہو جاتے تھے۔ یہ مواقع موسمی تہوار اور میلے ہوتے تھے۔ اپریل میں یہاں بری شاہ امام کا عرس ہوتا تھا جس میں شرکت کے لیے پنجاب بھر کی رقاصائیں آتی تھیں۔ بری امام جانے سے پہلے وہ شاہ چن چراغ میں حاضری دیتیں کہ مشہور تھا کہ وہ بری شاہ کے مرشد ہیں۔ شاہ چن چراغ کا احاطہ اور دیواریں صبح ہی سے بھرنے لگتیں۔ میں بھی ان دنوں باقاعدگی سے وہاں جاتا تھا۔ ایک گروہ آتا سلام کرتا۔ رقص شروع ہوتا اور سلام کر کے بری امام کی طرف روانہ ہو جاتا۔ جہاں جانے کے لیے ان دنوں زیادہ تر تانگے استعمال ہوتے تھے۔ بری امام میں تو باقاعدہ ویلیں دی جاتیں اور وہاں یہ طوائفیں مختلف ڈیروں سے منسلک ہو جاتیں لیکن شاہ چن چراغ میں ان کا رقص خالصتاً عقیدت کا اظہار تھا۔ یہاں میں نے کئی فلمی رقاصاؤں کو بھی رقص کرتے اور اپنے فن کا جادو جگاتے دیکھا۔ بعد میں دو ایک بار مجھے بری امام میں بھی اس کا موقع ملا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں ایک کاروباری جذبہ ہوتا تھا لیکن یہاں ایک خلوص، دونوں میں جو فرق ہے وہی دونوں جگہ کے رقص میں بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

اُس زمانے میں کتھارسس کے اور بھی کئی ذریعے تھے۔ عید پر جو میلے لگتے تھیٹر ان کا لازمی جزو تھے۔ ان تھیٹروں میں اعلیٰ درجہ کے فن کا مظاہرہ تو یقیناً نہیں ہوتا تھا لیکن چھیڑ چھاڑ، سیٹیاں، تیسرے درجے کے غیر اخلاقی لطیفے اور رقص دیکھنے والوں کا کتھارسس کر دیتے تھے۔ یہ کتھارسس کا لفظ میں بار بار اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اُس زمانے میں ارسطو کا المیہ گفتگو کا اکثر موضوع ہوتا تھا اور ارسطو کتھارسس کو ذہن کی صحت کے لیے ضرور قرار دیتا ہے۔ میں

نے اسی زمانے میں کسی یونانی حکیم کا یہ قول بھی پڑھا تھا کہ کبھی کبھی شراب پی کر سڑک پر بڑکیں بھی مارنا چاہیے کہ اس سے اندر کی بہت سی خباثت باہر نکل جاتی ہے۔ حکیم سولن نے، جو یونانی سنیٹر تھے طوائفوں کے حق میں بڑی عمدہ بات کہی تھی۔ اُس نے سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، ایک ریڈ لائٹ ایریا بہت ضروری ہے تا کہ کوئی شخص بدمست ہو کر اپنے پڑوسی کے گھر میں چھلانگ نہ لگا دے۔ یہ زمانہ اس حوالے سے بہت کھلا تھا۔ شاید اسی لیے اُس وقت معاشرے میں برداشت اور رواداری بھی بہت تھی۔

تقسیم سے پہلے ہمارے چیلنج بڑے تھے۔ مسلمانوں کو برصغیر میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور دوسرے گروہوں سے برسر پیکار رہنا پڑتا تھا۔ یہ بڑی تہذیبوں اور بڑے نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ جس سے معاشرے میں ایک cross ventilation کا عمل جاری تھا۔ تقسیم کے بعد ہمارا معاشرہ آہستہ آہستہ اتنا بند ہوتا گیا کہ اس نے تالاب کی صورت اختیار کر لی، جہاں پانی کھڑا ہو کر گدلا اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ تقسیم سے پہلے اپنی تہذیبی بقا کے لیے ہمیں معاشرے میں موجود دوسری بڑی تہذیبوں سے متصادم ہونا پڑتا تھا لیکن تقسیم کے بعد ہمارا یہ ٹکراؤ اتنی نچلی سطح پر آ گیا کہ فرقہ پرستی کی صورت اختیار کر گیا۔ ہم شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی اور دیوبندی کی اصطلاحوں میں مقید ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنی اناؤں کو تسکین دینے لگے ہیں۔ یہی صورت ماضی کے ساتھ ہمارے رشتے کی ہوئی۔ اقبال نے ماضی کو ایک قوت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جس سے وہ حال کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ شرر نے ماضی میں پناہ کی راہ نکال لی لیکن یہ اُس وقت کے سیاسی حالات کا تقاضا تھا۔ مسلمان نوجوان مغربی حکمران کے ثقافتی، مذہبی حملوں سے ایک طرح کے احساس کمتری میں مبتلا ہوئے جا رہے تھے ایسے میں پدرم سلطان بود کے نعرے نے انہیں ایک داخلی قوت عطا کی، لیکن ہمارے دور میں ماضی پرستی پھر ایک رومان کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ خیموں، گھوڑوں، جھولداریوں، طنابوں،

کنیزوں اور راہداریوں کا ذکر کر کے جس انفرادیت کا ڈھنڈورا پیٹا جار ہا ہے وہ ایک طرح کی مریضانہ رومانیت ہے ۔میں ایسے شاعروں کو اصطبل کا شاعر کہتا ہوں کہ ان کی شاعری میں گھوڑے ،ان کی لید اور ہنہناہٹ تو ہے ،اپنا عصر نہیں۔

قرۃ العین حیدر پنڈی آئیں تو فتح محمد ملک نے ان کے اعزاز میں اپنے گھر بہت سے دوستوں کو مدعو کیا۔ ان کا ناول ''گردش رنگ چمن'' اور سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' ان دنوں ادبی محفلوں میں موضوع گفتگو تھے۔کہا یہ جار ہا تھا کہ قرۃ العین حیدر، اقبال کی طرف لوٹ رہی ہیں اور ان کی یہ واپسی '' آگ کا دریا '' سے ایک مختلف تخلیقی سفر ہے۔ محفل میں اختر امان نے ان سے یہ سوال کر دیا۔قرۃ العین غصہ میں آ گئیں بولیں ...... ''برا نہ منائیں آپ لوگ ایک بند معاشرے میں رہتے ہیں اس لیے آپ کی سوچ ایک نقطے سے ادھر اُدھر نہیں ہوتی ۔میرا تعلق ایک کھلے معاشرے سے ہے جہاں بڑی کراسنگ ہوتی ہے ۔بطور فنکار میرے یہاں کوئی مراجعت یا رجائیت نہیں یہ ناول کا تقاضا ہے ۔اگر میں جین مت کے حوالے سے کوئی ناول لکھوں گی تو آپ محسوس کریں گے کہ میں جینی ہو گئی ہوں ۔رہا معاملہ کار جہاں دراز کا تو بہر حال میرا ایک تہذیبی اور فکری تشخص ہے۔میں اپنی بات کروں گی تو اس کا اظہار ہو گا لیکن میرے تخلیقی عمل میں رویہ اور رجحان موضوع کی مناسبت سے ہوتا ہے۔''گردش رنگ چمن'' اور'' چاندنی بیگم'' کی کہانیاں جس ماحول ،فکر اور تہذیب کا تقاضا کرتی تھیں میں نے فنی طور پر اس کو پیش کیا ہے ،ایک مختلف موضوع میں میرا طریقہ وہی ہو گا جس کا تقاضا کہانی کے کردار ماحول اور واقعات کریں گے''۔

پاکستانی معاشرت میں منافقت کے رویے ضیاء الحق کے دور میں شروع ہوئے ۔اس کی اپنی زندگی میں بھی تضاد ایک طرف ،موصوف سیاسی جماعتوں ،خصوصاً پیپلز پارٹی کو قابو میں کرنے کے لیے مسجدوں کے نیم خواندہ اور نیم سیاسی تربیت یافتہ لوگوں میں مقبول ہونے کے

لیے مذہب کو بطور نعرہ استعمال کر کے اس کی کچی پکی تفسیر کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی نجی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں میں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک کے راوی منیر احمد شیخ اور دوسرے کے ضیا جالندھری ہیں۔

منیر احمد شیخ جرمنی میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس اتاشی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اُس وقت کے پاکستانی سفیر نے وہاں دو چار ثقافتی پروگرام ایسے کرائے جو بظاہر حکومت وقت کی ثقافتی پالیسی کے خلاف تھے۔ سفیر کی بیگم نے بھی ان پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک حوالے سے تو یہ اچھی بات تھی کہ بھارتی ثقافتی یلغار کو توڑنے کے لیے پاکستانی ثقافت کو اجاگر کیا گیا۔ جرمنی کے کئی اخباروں نے تصاویر شائع کیں۔ کسی نے سفیر سے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ضیاء الحق ان چیزوں کے خلاف ہیں۔ سفیر نے کہا۔ میں نے بات کر لی ہے۔ ضیاء الحق کا کہنا ہے کہ باہر جو مرضی کرو، بس پاکستانی اخباروں میں اس طرح کی کوئی تصویر نہ چھپے۔

دوسرے واقعہ کے راوی ضیا جالندھری ہیں جو اُس زمانے میں ٹیلی ویژن کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک موقع پر سیاسی جوڑ کے بعد ایک اہم اعلان ہونا تھا۔ ضیاء الحق اسمبلی میں اپنے چیمبر میں تھے۔ ٹیلی وژن آن تھا لیکن آواز بند کر دی گئی تھی۔

سیکرٹری اطلاعات جنرل مجیب نے ہدایات دی تھیں کہ ٹیلی ویژن آن رہے اور اسی دوران قومی نغمے وغیرہ نشر کیے جاتے رہیں۔ پاکستان میں جب کبھی ٹیلی ویژن سے قومی نغمے یا نعتیں مسلسل نشر ہونے لگیں تو لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ قوم کے خطرے میں ہونے کا کوئی اعلان ہونے والا ہے۔ جوڑ توڑ طویل ہو گیا۔ نغمے ختم ہو گئے تو نعتوں اور حمدوں کا دور شروع ہوا۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے ضیا جالندھری کو جو خود بھی اسمبلی بلڈنگ میں موجود تھے اطلاع دی کہ یہ سٹاک بھی ختم ہونے والا ہے۔ اب کیا کریں۔ ضیا نے کہا اس کے بعد ہلکی پھلکی موسیقی شروع کر دیں۔ ضیاء الحق اپنے چیمبر میں مختلف لوگوں سے بات کر رہے تھے کہ ان کی نظر ٹیلی ویژن پر پڑی، منی بیگم

بجھ گا رہی تھیں۔ جنرل مجیب بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ ضیا نے انگلی سے سکرین کی طرف اشارہ کیا اور پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

جنرل مجیب تیزی سے باہر آئے اور ضیا جالندھری کو خوب ڈانٹ پلائی کہ تمہاری وجہ سے ضیا صاحب ناراض ہو گئے ہیں۔ یہ منی بیگم کہاں سے آ گئی جب کہ کہا گیا تھا کہ صرف قومی نغمے نشر ہوں، فون کر کے دوبارہ قومی نغمے شروع کرائے گئے۔ ضیا کہتے ہیں کہ تین چار دن بعد جنرل مجیب اچانک میرے کمرے میں آ گئے۔ یہ خلاف معمول تھا ورنہ وہ ہمیشہ مجھے ہی طلب کرتے تھے۔ آتے ہی انہوں نے کہا ''ضیا صاحب سوری! اس دن غلط فہمی ہو گئی''

ضیا نے سوال طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا......

''ضیاء الحق نے ابھی فون کیا ہے کہ مجیب وہ منی بیگم والی کیسٹ تم نے ابھی تک نہیں بھجوائی حالانکہ میں نے اُس دن اشارے سے تمہیں کہا بھی تھا''۔

ضیا کو برا کہنے والے تو ان گنت تھے۔ لیکن اسی دور میں اس کی تعریف وتوصیف کرنے والے بھی موجود تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے جنگ راولپنڈی میں احسان دانش کا جو قصیدہ چھپا تھا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے.........

یہ ضیاء الحق عجب تقریر کی ہے اس نے رات
ہو گئے دنیا پہ ظاہر جس سے اس کے سب صفات
پیش اس نے کر دیا اسلام کا یکسر نچوڑ
سننے والوں میں تھے اس کے کم سے کم نوے کروڑ
جس طرح زندان شب سے چھوٹتی ہے روشنی
اس کے لفظوں سے برابر پھوٹتی ہے روشنی
جو ملاقاتی ملا اس نے کہا صد مرحبا

دشمنوں سے آئی سنے، میں صدائے واہ وا
کہہ رہے تھے اپنے گھر جا کروڑوں آدمی
کر دیا ہم کو ضیا نے روشناس آدمی

ہو سکتا ہے یہ کوئی مجبوری نہ ہو واقعی دل کی آواز ہو۔ لیکن میں نے کئی ادیبوں شاعروں کو اس طرح کی تعریف وتوصیف کے بعد خلعت مانگتے بھی دیکھا۔ اہل قلم کانفرنس میں جن لوگوں کو دعوت نامے نہیں ملتے تھے ان کی گڑگڑاہٹ دیکھنے لائق ہوتی تھی اور اس میں کچھ بڑے نام بھی شامل ہیں۔ فخر زمان سے پہلے طریقہ تھا کہ اہل قلم کانفرس کے مدعوئین میں سے ایک منتخب تعداد کو ایوان صدر میں صدر کی دعوت میں بلایا جاتا۔ دعوت نامے آخری سیشن سے پہلے کانفرنس ہال میں پہنچ جاتے۔ ادیب شاعر جس طرح ان دعوت ناموں پر جھپٹتے، وہ منظر بھی دیکھنے لائق ہوتا۔ اس چھینا جھپٹی میں کئی دعوت نامے پھٹ جاتے، بڑے بڑے اہم ادیبوں کو دھکے کھاتے اور دوسروں کو دھکے دیتے دیکھا۔ فخر زمان جس زمانے میں چیئرمین تھے۔ اس سال اہل قلم کانفرس ہوئی تو اکیڈمی کے افسران نے حسب روایت اپنی مرضی کے نام بھجوا کر ایوان صدر سے دعوت نامے منگوا لیے۔ فخر زمان کو پہلے معلوم ہوا تو انہوں نے اعلان کیا کہ کانفرنس میں شریک ہر شخص ایوان صدر میں مدعو ہے۔ یہی صورت بیگوں کی بھی ہوتی تھی۔ ایک بیگ لینے کے لیے بڑے بڑے نام اکادمی کے افسروں کے پیچھے پھرتے۔ کچھ کو ڈیلیگیٹ اور کچھ کو عام مدعوئین بنا کر اکیڈمی کے افسروں نے اپنی ایک مناپلی بنائی ہوئی تھی۔ فخر زمان نے اسے بھی ختم کیا اور اعلان کیا کہ سب مندوبین ہیں۔ ایوان صدر کے دروازے میں کھڑے ہو گئے اور کسی ادیب کی سیکورٹی چیک نہ ہونے دی۔ یہ یقیناً ادیبوں کی عزت افزائی اور ان کی اہمیت کا اعتراف تھا۔

ہفتہ کی رات میرے علاوہ بھی کئی لوگ رات گئے تک منشا کی بیٹھک میں موجود ہوتے۔ ان میں ایس اے ناز تو اسلام آباد ہی سے آتے، پنڈی سے کبھی کبھی میرے ساتھ غلام

سرور اور اعجاز راہی بھی چلے جاتے۔ بھابھی بہت ہی اعلیٰ ظرف خاتون ہیں۔ انہوں نے ہماری دھماچوکڑی کا کبھی برا نہ منایا۔ کھانا تو ہم خیر وہاں کھاتے ہی تھے۔ رات گئے تک چائے ملتی رہتی۔ کبھی کبھی ہم پر ایک عجب طرح کی وحشت طاری ہوتی۔ بتیاں بجھا لیتے اور ریکارڈ سنتے رہتے۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم، گھنٹوں ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ منشا بھی تھکایا ہوا تھا اور میں تو خیر ہر دور ہی میں گھائل رہا ہوں۔ ہمارے دکھ اپنے اپنے تھے لیکن ایک اشتراک بھی تھا۔ اُس زمانے میں منشا ایک ناول لکھ رہا تھا۔ شاید یہ ادھورا ہی رہ گیا، ایک رات اُس نے مجھے مظہر الاسلام، اعجاز راہی اور غلام سرور کو یہ ناول سننے کی دعوت دی۔ کھانا کھا کر ناول پڑھنے کا آغاز ہوا۔ اعجاز راہی اونگھ گیا۔ منشا یاد نے پڑھتے پڑھتے اعجاز کو دیکھا تو رک گیا۔ اُسے جگایا اور پوچھا تم کب سے سو رہے ہو، اعجاز نے کہا۔ بس ابھی اونگھ گیا تھا۔ منشا نے اُس سے گزشتہ صفحات کے بارے میں کوئی سوال کیا، اعجاز جواب نہ دے سکا۔ منشا کہنے لگا میرا اندازہ ہے کہ تم نے کم از کم تیس صفحات نہیں سنے، میں دوبارہ شروع کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اعجاز کو پھر اونگھ آ گئی، مظہر الاسلام نے زور سے اس کے کندے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگا...... ''خبردار اب سوئے''۔

منشا یاد نے اسلام آباد میں '' لکھنے والوں کی انجمن'' قائم کی تو ہر جمعہ کو وہاں جانا ضروری ہو گیا۔ درمیان میں بھی میں کبھی کبھی اُس کے یہاں پہنچ جاتا۔ آخری بس دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ میں نو بجے اٹھنے کی تکرار شروع کر دیتا۔ منشا بس تھوڑی دیر تھوڑی دیر کہتے دس بجوا دیتا۔ آخری بس نکل جاتی تو منشا سکوٹر پر مجھے چھوڑنے کمیٹی چوک تک آتا۔ حلقہ کے الیکشنوں کے دنوں میں ہم لوگ بارہ بارہ ایک ایک بجے تک چوکوں میں کھڑے انتخابات کا لائحہ عمل مرتب کرتے تو منشا ہمارے ساتھ ہوتا کبھی کبھی رات دو بجے تک ہمارے ساتھ رہتا۔

افسانہ لکھنے کے حوالے سے میرے اور منشا کے درمیان کبھی حسد کی فضا قائم نہ ہوئی کہ

ہم دونوں مختلف انداز اور مختلف مزاج کے لکھنے والے ہیں۔ پنڈی کا ادبی ماحول گھریلو ماحول جیسا تھا، ابھی ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ ہماری ادبی بحثوں اور تخلیقات کا چرچا پوری اردو دنیا میں تھا۔

مظہر الاسلام سے میری پہلی ملاقات سلیم الدین سلیم جو اُس زمانے میں سلیم کوثر تھا، نے کرائی۔ مظہر، سلطان رشک اور رفعت سلطان کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا اور اس کا ایک افسانہ تالاب نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں شائع ہو چکا تھا۔ سلیم ایک دن اُسے ہماری میز پر لے آیا اور کہنے لگا...... ''یار یہ ہے تو افسانہ نگار لیکن شاعروں میں پھنس گیا ہے''

اُس کے بعد مظہر ہمارے ساتھ بیٹھنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے بہت قریب ہو گیا۔ شام کا کھانا ہم عموماً باہر کھاتے۔ اتوار کو دوپہر کا کھانا اُس کے گھر لازمی تھا۔ اُس کی والدہ بہت نفیس اور ملنسار خاتون تھیں۔ کئی بار ہمارے گھر بھی آئیں، امی بھی اُن کے گھر گئیں۔ مظہر کا بھائی عاصم محمود ان دنوں پولی ٹیکنیک میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ پھر وہ سعودی عرب چلا گیا۔ واپسی پر دونوں بھائیوں میں ایسی ان بن ہوئی کہ بول چال بھی بند ہو گئی۔ عاصم نے اپنا پریس اور مکتبہ دوست پبلی کیشنز کے نام سے کھول لیا۔ ان دونوں بھائیوں کی ماں ایک تھی سوتیلی ماں میں سے ایک بھائی اورنگزیب مجھے یاد ہے، بہنوں میں سے ایک بہن کی شادی شفقت تنویر مرزا سے ہوئی ہے۔ جو پنجابی کے اعلیٰ درجے کے شاعر اور نقاد ہیں۔ مظہر الاسلام کے مزاج میں ایک عجب طرح کی شدت تھی اور محبت کا ملکیتی احساس، یعنی وہ اپنے دوست سے یہ توقع کرتا تھا کہ وہ سانس بھی اس کی مرضی سے لے۔ حلقہ کی سیاست میں وہ بڑا سرگرم تھا۔ داؤد کے بعد سب سے زیادہ جس شخص کے ساتھ میرا وقت گزرا وہ مظہر ہے۔

○

حلقہ کی محفلوں میں شروع شروع میں تو نئے رویوں پر کڑی تنقید ہوئی بلکہ ناپسندیدگی

کا اظہار کیا گیا۔ حلقہ کے پرانے اراکین نئے موضوعات اور تکنیکی رویوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور بعض اوقات تنقید کا عجیب وغریب نمونہ سامنے آتا تھا۔ مثلاً آدھا وقت اس پر گزر جاتا کہ یہ نظم ہے یا نہیں، یہ افسانہ ہے یا نہیں، بعض حضرات لکھنوی طرز کی لسانی غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ جاتے، تلفظ پر گرفت ہوتی، اس کا بہر حال مثبت اثر بھی ہوا اور وہ یہ کہ ہر نیا لکھنے والا حلقہ میں محتاط ہو کر تخلیق پیش کرتا تھا تا کہ کم از کم فنی اعتراض تو نہ ہو یا لسانی غلطیاں تو نہ نکالی جائیں۔ جدیدیت ایک طوفان کی طرح پھیل رہی تھی اور ایسی صورت حال میں افراط وتفریط ناگزیر ہوتی ہے۔ سو ہوا بھی یہی کہ جدیدیت کے شوق میں ''دھوپ سے دانتوں کو منجن کرنا'' اور ''آنکھوں کی پلیٹ میں رس گلے سجانا'' جیسے امیجز وجود میں آئے یہ ایک ردعمل بھی تھا۔ اُس رویے کا جو خاص طور پر ترقی پسند حضرات کی طرف سے ہوا۔ میری رائے میں جدیدیت ایک تحریک نہیں، رویہ ہے، ہر عہد کے نئے لوگ اپنے عہد میں جدید ہوتے ہیں جیسے میرؔ اپنے عہد میں غالبؔ اپنے عہد میں۔ اس لیے ترقی پسند تحریک کے ساتھ اس کی کوئی مخالفت نہ تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں بھی ترقی پسندوں کا یہی رویہ تھا کہ یہ اینٹی ترقی پسند فورم ہے ممکن ہے ابتدا میں اس طرح کی کوئی صورت بنی ہو لیکن اگر حلقہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو لاہور اور دہلی دونوں ہی جگہ بہت سے ترقی پسند حلقہ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۶۰ء کی جدیدیت ابتدا میں غیر وابستگی کی بات ضرور کرتی تھی لیکن خود کو اعلانیہ غیر وابستہ کہنے والوں کا مجموعی رویہ ترقی پسندانہ تھا۔ انہیں ترقی پسند فکر سے نہیں ترقی پسندوں کے شخصی رویے پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں نے جس پاپائیت کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ پاپائیت اب خود ان میں پیدا ہو چکی تھی اور نئے لکھنے والوں کے ساتھ یہ وہی رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، جو ایک زمانے میں ان کے ساتھ برتا گیا تھا۔ ۶۰ء سے ۷۰ء کی دہائی دروں بینی کا دور ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع کیا اور اس کی جڑیں معاشرے کی نچلی سطح تک پھیلا دیں،

دوسری طرف حلقہ سے متعلق بعض لکھنے والوں نے نفسیات و جنسیات کے نئے رویوں کو دریافت کرنے کی سعی کی لیکن باطن کی غواصی، جس کا ایک تعلق تصوف کی روایت سے تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں ایک نئے طریقے سے ادب کا موضوع بنی، دوسری ذات یعنی The other کی تلاش نے دروں بینی کے ایک ایسے رویے کا آغاز کیا جس نے ادب کو علامات واستعارات کے نئے نظام سے متعارف کرایا۔ یہ رویہ نظم اور افسانے میں زیادہ کھل کر سامنے آیا۔ غزل اپنے مزاج اور مضبوط فنی ڈھانچے اور روایت کی وجہ سے براہِ راست تو اس سے متاثر نہ ہوئی لیکن موضوعاتی طور پر اُس نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔

○

''نیا ادب'' میں ایک جگہ میں نے لکھا تھا......

''ادبی دستاویز کسی دور کا وہ صحیفہ ہے جس سے اُس دور کے لوگوں کے ذہنی رجحانات، جذباتی رویوں، معاشرتی سلوک، مصلحت پسندیوں اور عقلی وفکری حدود اربعوں کی تشخیص اور پہچان ہوتی ہے۔ باقی تمام علوم ان تمام مسائل سے بحث کرتے ہیں جن کا ادب اظہار کرتا ہے۔ ہر دور کے ادیب کے لیے لازمی ہے کہ وہ اشیا اور ضروریات کو اپنے دور کے سیاق وسباق میں دیکھے اور انہیں معنی عطا کرے''۔

نظریہ سازی اس حوالے سے تو ایک اہم ضرورت ہے کہ اس کے بغیر ادیب کی پہچان نہیں ہوتی اور یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ کس سمت اور کس جگہ کھڑا ہے۔ لیکن نظریہ سازی ادب میں اُس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک اس کا تخلیقی اظہار سامنے نہ آئے۔ نئے ادبی رویوں کو بھی ایک طرح کی نظریہ سازی ہی کہا جاسکتا ہے اور نئی تخلیقات نے اس پر تصدیق کی مہر بھی لگا دی لیکن ہمارے یہاں بہت سی نظریہ سازی ایسی بھی ہے جس کا اظہار تخلیقی سطح پر نہ ہوسکا۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد نیا دور گروپ نے جب پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا اور اس

کے خط وخال متعین کرنے کی کوشش کی تو تمام تر استدلالی قوت کے باوجود تخلیقی سطح پر اس کا کوئی بھرپور اظہار نہ ہو سکا۔ خود صمد شاہین اور ممتاز شیریں کے یہاں اس کے اثرات دکھائی نہ دیے چنانچہ پاکستانی ادب کی تحریک تحریک تو کیا بنتی صرف تنقیدی مضامین کا حصہ بن کر رہ گئی۔ اسی طرح اسلامی ادب کی بات کرنے والے بھی دوسرے درجے کے ادیب تو پیدا کر سکے لیکن ایک بھی اچھا لکھنے والا ان سے متاثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک اگرچہ اپنی تحریکی صورت میں باہر سے آئی تھی، ایک زبردست اور فعال تحریک بن گئی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ تحریک صرف تنقیدی مضامین تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ لکھنے والوں کی ایک کمٹمنٹ بھی تھی۔ تو اندازہ ہوا کہ نظریہ سازی وابستگی کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نئے ادبی رویوں اور ساٹھ کی دہائی کے نئے حوالے اسی لیے روایت کا حصہ بن گئے کہ یہ نئے لوگ اپنے خیالات سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اس کا اظہار بھی کھلم کھلا کرتے تھے۔ اگر تنقید پہلے لکھی جائے تو اس کے تحت لکھا جانے والا ادب ہمیشہ کمزور اور تجربہ و جذبہ سے عاری ہوگا۔ ساٹھ کی دہائی میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو نئے ادب کی شہرت اور گلیمر کی وجہ سے صرف نئی تنقید پڑھ کر نیا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابلاغ کے زیادہ تر مسائل ان ہی لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں ایسے لوگوں کے بارے میں لکھا تھا ''یہ سبز گھاس دیکھ کر ہنہنانے والے گھوڑے ہیں جو صرف سبزے پر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں''۔

لکھنے والے کو آزادی ہے وہ جو چاہے لکھے، لیکن یہ ضروری ہے کہ جو کچھ وہ لکھے اس سے اس کی وابستگی خلوص کی بنیاد پر ہو، فیشن کی سطح پر نہ ہو۔ نئے ادب کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ شروع شروع میں ہر طرف سے اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں، پھر ایک وقت آیا کہ ہر کوئی خود کو نیا ثابت کرنے کے لیے الٹے سیدھے استعارے اور علامتیں بنانے لگا اور بعض اوقات تو مضحکہ خیزی کی صورت بھی پیدا ہوگئی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نئے ادب کی فکری روایت اور مزاج سے

آشنا نہیں تھے۔ ان کی تبدیلی تنقیدی مضامین کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جینوئن فنکار تنقید سے پہلے وجود میں آتا ہے۔ اور تنقید بعد میں اس کا محاکمہ کرتی ہے۔ اپنے ایک مضمون ''افسانے کے نئے موضوعات'' میں، میں نے کہا تھا......

''فنکار کون ہوتا ہے اس کا جواب تنقید کی کتابیں نہیں زمانہ دیتا ہے۔ تنقید کی کتابیں تو خود اس کی منتظر رہتی ہیں''

ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں مارشل لاء کے خلاف ایک احساس تو موجود تھا لیکن مادرِ ملت کے الیکشن ہارنے اور تاشقند معاہدے تک اس کی کوئی نمایاں صورت ظاہر نہ ہوئی تھی۔

۶۰ء کی جدیدیت کے جواز میں مارشل لاء کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ ایک حد تک مارشل لاء کا جبر بھی ایک وجہ ہوسکتا ہے لیکن میری رائے میں یہ جدید رویے ایک فطری ارتقا کی بنیاد تھے۔ تبدیلیوں کا احساس تو تیس کی دہائی کے بعد ہی ہو گیا تھا جب میراجی اور راشد نے نئی نظم کا ڈول ڈالا، افسانے میں عزیز احمد، کرشن چندر اور منٹو کے یہاں کہیں کہیں روایت سے ہٹ کر نئی تکنیک کا استعمال بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ کسی نہ کسی سطح پر روایت میں تبدیلی کا احساس پروان چڑھ رہا تھا۔ شاید اس کے لیے جس منطقی جواز اور عصری فریم کی ضرورت تھی وہ ساٹھ کی دہائی میں میسر آ گیا۔

۶۸ء کی عوامی تحریک بھی ایک دم وجود میں نہیں آئی تھی۔ چاہے اسے کسی ایجنسی کی تائید حاصل ہو لیکن یہ عوام کی نفرت کا ایک کھلا اظہار تھی۔ قائداعظم کے بعد ہمارا معاشرہ کسی ہیرو سے محروم تھا۔ ۶۸ء میں لوگوں کو یہ ہیرو مل گیا۔ اس کے ساتھ جو سفر خارج سے داخل کی طرف شروع ہوا تھا اس کا رخ دوبارہ خارج کی طرف ہو گیا۔ ہمارے ادیب نے آگے بڑھ کر عوام کی راہنمائی بہت کم کی ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر شاید دو ایک نام ایسے ملیں گے جو ہراول دستے میں رہے ہوں ورنہ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہمارا ادیب لوگوں کے پیچھے چلتا رہا ہے۔ اُسے عموماً لوگوں

کے ذریعے تبدیلیوں کی اطلاع ملتی ہے۔ اس بار بھی یہی ہوا، عوامی جلوس سڑکوں پر آئے تو ادیب بھی ذات کی تنگنائے سے نکل کر باہر آ گیا۔ ترقی پسندی ایک بار پھر نمایاں ہوئی لیکن اس بار تحریک کے طور پر نہیں بلکہ ایک رویہ کے طور پر اسے قبول کیا گیا۔

اسلام کو نعرہ بنانے والوں نے اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں ہر دور میں اہم کردار ادا کیا ہے اور طے شدہ معاملات کو متنازع بنا کر قومی یک جہتی کو نقصان پہنچایا ہے، شہاب اور ندائے ملت نے صحافت کے نام پر دونوں طرف سے اتنا گند اچھالا کہ بڑے بڑوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ نئے لکھنے والوں کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کدھر جائیں۔ ترقی پسندی کی حمایت کریں تو استعاراتی و علامتی انداز کا کیا جواز پیش کریں۔ افتخار جالب نے بیک قلم اپنے گذشتہ نظریات سے انحراف کرتے ہوئے ''استعارے کی شاعری، منافقت کی شاعری'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو ہفت روزہ شہاب میں شائع ہوا۔ اس مضمون نے نئے لکھنے والوں کو ایک عجب طرح کے تذبذب کا شکار کر دیا، نئے ادیب خود کو عوام سے تو جوڑنا چاہتے تھے لیکن معاملہ یہ تھا کہ جس علامتی انداز و تکنیک میں وہ لکھ رہے ہیں اس کا جواز کیا ہے۔ اس پر حلقہ میں بھی اور شام کی نشستوں میں بھی طویل بحثیں ہوئیں۔ ہمارا استدلال یہ تھا کہ ادب ایک فنی معاملہ ہے اور جہاں فن آئے گا وہاں ابلاغ کی عمومی سطح کی بات نہیں کی جا سکتی۔ نیا ادیب بات تو عوام کی کر رہا ہے لیکن لکھتا وہ اپنے انداز میں ہے، ابلاغ کی بحثیں جو ساٹھ کی ابتدائی دہائی میں شروع ہوئی تھیں، پھر شروع ہو گئیں۔ میرا جی نے کہا تھا ''ابلاغ ایک اضافی اصطلاح'' ہے یہ بات اپنی جگہ اتنی درست ہے کہ اسے ہر عہد کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خود غالب پر اپنے عہد میں ابلاغ نہ ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ نئے ادیبوں کی اکثریت نے افتخار جالب کے نئے خیالات سے اتفاق نہ کیا۔ ترقی پسندی کا ایک نیا دور شروع ہوا لیکن یہ ۱۹۳۶ء والی ترقی پسندی نہ تھی اس لیے اسے نو ترقی پسندی کا نام دیا گیا۔

ابلاغ کے سلسلے میں یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ادب کے سب قاری ایک ذہنی سطح نہیں رکھتے۔ ذوق اور غالب کے قاری الگ الگ ہیں۔ اگر غالب ذوق کے قاری کے پیچھے چلتے تو

چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

جیسے مصرعے کہتے۔ وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ.......

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس لیے ابلاغ کی بحث کرتے ہوئے ادیب کو محتاط رہنا چاہتے۔ اسی دوران ادبی محاذ کے علاوہ سٹڈی سرکل بھی پوری طرح فعال تھے اور روشن فکر کے نام پر ان سرکلوں میں طویل بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ ادیبوں کو بھی اپنا پیروکار بنانا چاہتے تھے لیکن حلقہ کی تربیت ایسی ہے کہ کوئی بات بغیر استدلال اور بحث مباحثہ کے قابل قبول نہیں ہوتی، ڈاکٹر عزیز الحق ان دنوں بڑے فعال تھے اور لاہور کے علاوہ پنڈی میں بھی ان کے پیروکار موجود تھے۔ سمیع آہوجہ ان سے بڑا متاثر تھا۔ ڈاکٹر صاحب سمیع آہوجہ کے ساتھ پنڈی کے حلقہ میں بھی آئے۔ اس زمانے میں ہسپتال روڈ پر شیراز کیفے ہوا کرتا تھا۔ جس کی چھت پر بیٹھنے کی بڑی اچھی جگہ تھی۔ یہاں کئی دن مسلسل عزیز الحق کے ساتھ ہماری نشستیں ہوئیں۔ ان میں میرے علاوہ سرور کامران، اعجاز راہی اور مظہر الاسلام بھی شامل تھے۔ عزیز الحق چاہتے تھے کہ ادب کا دائرہ مزدوروں تک پھیلایا جائے اور اس کے لیے ان کا فلسفہ یہ تھا کہ ادیب کو اپنے آپ کو ڈی کلاس کرنا چاہیے۔ لاہور میں ان کے اس طرح کے کئی پیروکار تھے، ان میں سے ایک ہارون الرشید بھی تھے جو فلسفہ میں ایم اے کر کے کوٹ لکھپت میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پنڈی کے لوگ ترقی پسندی کے باوجود ادب کی اعلیٰ اقدار پر یقین رکھتے تھے چنانچہ عزیز الحق سے چار دن کی یہ میٹنگ ناکام ہی رہی۔ وہ ہمیں قائل نہ کر سکے نہ ہم ان سے اپنی بات منوا سکے۔ سمیع آہوجہ نے بعد میں بتایا کہ

عزیز الحق یہاں سے خوش نہیں گئے ۔ان کی رائے میں پنڈی کے ادیب رجعت پسند ہیں ۔چند دن بعد میں لاہور گیا تو ٹی ہاؤس میں عزیز الحق سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اسی رات ان کے سٹڈی سرکل کی میٹنگ تھی ۔وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے ،لاہور کا کوئی پوش ایریا تھا۔شاید گلبرگ اور اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ رابعہ سنبل کا گھر تھا۔وہی رابعہ سنبل جس کے شوہر نے بعد میں عزیز الحق کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی ۔اس محفل میں شاہد محمود ندیم بھی تھے ،پنڈی میں ،میں طویل عرصہ تک سٹڈی سرکلوں میں شریک ہوتا رہا تھا اس لیے یہاں کی گفتگو میرے لیے نئی نہ تھی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ،وہی رٹیں رٹیں ،پوتھی میں سے نکالی ہوئی باتیں۔ ہاں ایک بات نئی تھی وہ تھا گلیمر ،کئی فیشن ایبل خواتین بھی شریک محفل تھیں اور پنڈی کے مقابلے میں مجموعی فضا بڑی خوشگوار تھی۔

ہمارے اکثر ترقی پسند مغربی ماڈرن ازم کو ترقی پسندی سمجھتے ہیں ۔ان کے نزدیک بلاوجہ مذہب کی مخالفت کرنا اور مخلوط محفلوں میں شریک ہو کر شراب نوشی کرنا ترقی پسندی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ترقی پسند اسی ''افیون محفل'' کے شیدائی ہیں ۔یہی حال آزادی نسواں کے علمبرداروں کا ہے۔ان کے نزدیک عورت کی آزادی کا مطلب صرف یورپ کی عورت کی آزادی کے تصور تک محدود ہے جہاں مرد نے عورت کو سٹیج پر چڑھا کر اس کے کپڑے اتروالیے ہیں۔

لاہور کے اس سٹڈی سرکل میں مجھے کچھ ایسی ہی صورت دکھائی دی۔ میں بڑا مایوس ہوا اور پنڈی آ کر میں نے اس کی جو تصویر کھینچی وہ کوئی بہت اچھی نہ تھی ۔سٹڈی سرکلوں کو چلانے والے اور ان میں جانے والے اکثر لوگ بنیادی طور پر ادیب نہیں تھے اس لیے ادب کی جمالیاتی اقدار اور فنی رچاؤ کا انہیں نہ تو ادراک تھا نہ اسے محسوس کرنے کی صلاحیت ان میں تھی ۔وہ ادب اور پروپیگنڈے میں فرق نہیں کر سکتے تھے اور اپنے اس جنون میں لینن کا یہ قول بھی بھول گئے تھے کہ دنیا کا ہر بڑا ادب پروپیگنڈا ہوتا ہے لیکن ہر پروپیگنڈا ادب نہیں ہوتا۔ گورکی کی "ماں" کی

مثال تو ہر جگہ دی جاتی ہے لیکن اس کا پس منظر کوئی نہیں بیان کرتا۔ آہستہ آہستہ یہ گروپ اتنا طاقتور ہوگیا کہ اس نے لاہور کے حلقہ پر قبضہ کرلیا۔ ایک لڈو صاحب ہوتے تھے، مزدور لیڈر قسم کی کوئی چیز اس زمانے میں وہ حلقہ کے سب سے بڑے اور معتبر نقاد گنے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں، لاہور گیا تو حلقہ کے جلسے میں چلا گیا جو وائی ایم سی اے کے ایک کمرے میں ہوتا تھا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن شناسا صورتیں کم ہی تھیں ۔ سیکرٹری نے مہمان سمجھ کر مجھے صدر بنا دیا۔ کارروائی کے بعد افسانہ پڑھا گیا۔ ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے مزدوروں کے مسائل اور موجودہ حکومت کے رویے پر گفتگو شروع کر دی ۔ میں تو پنڈی کے حلقہ کا عادی تھا جہاں بہرحال گفتگو کا حوالہ ادبی ہوتا تھا۔ میں نے انہیں فوراً ٹوکا اور توجہ دلائی کہ گفتگو افسانے کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ اس پر شور مچ گیا۔ بہت سے نوجوان غصہ سے چلانے لگے کہ انہیں بولنے دیا جائے، معلوم ہوا کہ یہی لڈو صاحب ہیں۔ اس محفل میں عزیز الحق بھی تھے۔ بعد میں میں نے ان سے پوچھا کہ کیا سب ٹھیک ہے۔ انہوں نے واضح جواب نہ دیا بولے'' حالات ایسے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے......''

پنڈی کے حلقہ کی بہرحال یہ خوبی رہی ہے کہ انتہا پسندی کے اس زمانے میں بھی ادبی اقدار کو پائمال نہیں کیا گیا۔ الطاف احمد قریشی جس زمانے میں حلقہ کے سیکرٹری تھے کچھ ایسے پروگرام ضرور ہوئے جن میں ایسے موضوعات پر گفتگو ہوئی جن کا ادب سے براہ راست تعلق نہ تھا، لیکن اس حوالے سے کہ ادب پوری زندگی گی کا احاطہ کرتا ہے، یہ ایسی غیر متعلق بات نہ تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ مخالفت میں بولنے والوں کو کسی نے نہ تو محفل سے نکالا اور نہ کوئی اور بدمزگی ہوئی۔ اسی زمانے میں ادب اور سیاست کے عنوان سے ایک مذاکرہ ہوا جس کی صدارت فیض صاحب نے کی۔ شاہد محمود ندیم اور میں نے ابتدائیے پڑھے۔ شاہد محمود ندیم نے گفتگو کے دوران ایسے ادیبوں پر کڑی تنقید کی جو اُن کے بقول عوامی دھارے سے الگ رہ رہے تھے فیض سب

سے آخر میں بولے اور ایک بات بڑی کمال کی کہی، کہنے لگے ''موضوع جو بھی ہو ادب سلیقے کے ساتھ اظہار کا نام ہے"

ساٹھ کی دہائی ان بحثوں سے خالی ہے وجہ یہ کہ اس دہائی کا ادیب اور دانشور دروں بینی کا شکار تھا لیکن ستر میں جو نسل سامنے آئی اس کے مسائل اور تھے دوسرے یہ کہ جدید ادب کا ایک ماڈل اس کے سامنے تھا ساٹھ کی یہ دہائی میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چھوٹی سی ملازمت سے کلرکی اور پھر کلرکی سے نکل کر سکول کی تدریس اور پھر یکم نومبر ۱۹۶۸ء کو میں بطور لیکچرار کالج میں آ گیا۔ اس سال دو ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جن سے رفاقت کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ ان میں سے ایک احمد داؤد اور دوسرا غلام سرور ہے۔

○

غلام سرور سے اس سے پہلے میری کوئی ملاقات نہ تھی حالانکہ وہ موہن پورہ میں رہتا تھا اور گورڈن کالج میں اسی زمانے میں تاریخ میں ایم اے کر رہا تھا جس زمانے میں، میں اردو کی کلاس میں تھا۔ ہماری کلاسیں ایک ہی بلاک میں ایک ہی وقت ہوتی تھیں، لیکن ہماری ملاقات نہ ہوئی۔ غلام سرور سی بی کالج واہ میں مجھ سے ایک سال پہلے آیا تھا۔ میں گیا تو قدرتاً ایک ہی محلّہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے، دوسرے یہ کہ ہم دونوں روزانہ پنڈی سے واہ جاتے تھے اور صبح ایک ہی بس میں فوارہ چوک سے سوار ہوتے اور واپسی پر بھی ایک ساتھ ہی آتے۔ سرور کے والد حاجی محمد حسین ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند، بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور گھر کے سامنے والی مسجد کی انتظامی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ سرور کی عمومی دلچسپیاں تو خاصی مختلف تھیں لیکن شام کو بیٹھنے اور ہوٹلنگ کے حوالے سے وہ ہم سب کے بہت قریب ہو گیا۔ اس کے دوسرے دوستوں میں سے جاوید اشرف جسے ہم پیار سے کدو شاہ کہتے تھے، اکثر شالیمار بھی آتے۔ جاوید اشرف، مظفر علی سید کے عزیز بھی ہیں۔ اور ادب کا اچھا

ذوق رکھتے ہیں ۔کالج سے آنے کے بعد شام تک اور کبھی رات کو فلم دیکھنے کے حوالے سے ہمارا ساتھ ہو جاتا۔ اُس کے پاس سکوٹر تھا کبھی کبھی ہم اس سکوٹر پر واہ بھی جاتے۔ میں پیچھے بیٹھ کر اپنے بازو اس کے کندھوں پر رکھ دیتا۔ سرور کی عادت تھی کہ کوئی اچھا چہرہ سامنے آتا تو وہ میرے زانوں پر ہاتھ مارتا ''ٹوٹا''۔ شادی کے بعد ایک بار اس کی بیوی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ سرور کو یاد نہیں رہا اُس نے حسب معمول اس کے زانوں پر ہاتھ مارا اور کہا۔''اوئے ٹوٹا''۔

ایک بار ہم دونوں سکوٹر پر کالج گئے، واپسی پر اسلم مارکیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے سرور نے حسب عادت میرے زانوں پر ہاتھ مارا، واقعی حسن کا ایک مجسمہ ہمارے سامنے تھا۔ ہم دونوں پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ سکوٹر فٹ پاتھ پر چڑھ کر الٹ گیا، میں گھسٹتا ہوا، دور چلا گیا، سرور سکوٹر کے نیچے دب گیا۔ ہماری کہنیاں چھیلی گئیں۔ اتفاق سے ایک فوجی آیوڈین کی بوتل اور روئی لیے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ہمارے زخم صاف کیے اور ان پر آیوڈین لگا دی، کئی دنوں تک ہم درد سے بلبلاتے رہے اور سکوٹر کو ہاتھ نہ لگایا، لیکن پھر وہی معمول شروع ہو گئے۔

سرور کے سکوٹر کی ڈگی ہمارا سٹور تھا ہم اس میں بیئر کی بوتلیں بھر لیتے۔ شالیمار کے ساتھ خان برادرز کی شراب کی دوکان تھی جہاں سے مری بروری کی بیئر پانچ روپے نو آنے میں ملتی تھی۔ ہم برف کا ایک ٹکڑا لے لیتے اور اسے ٹاٹ میں لپیٹ کر اس میں بوتلیں رکھ دیتے اور ڈگی بند کر کے اسلام آباد کی طرف نکل جاتے۔ اسلام آباد کی آبادی اس زمانے میں آب پارہ تک ہی محدود تھی۔ ایف سکس کی سپر مارکیٹ اور سیکریٹریٹ آخری منزل تھی۔ کبھی کنول جھیل پر، کبھی شکر پڑیاں کی ڈھلوانوں پر، کبھی چاند ستارے والے چوک میں اور کبھی روز گارڈن کے کسی اکیلے کنج میں دراز بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے زندگی بھر کی باتیں ہوتیں۔ اُس زمانے میں شراب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ واہ آفیسر کلب میں بھی بار موجود تھا۔ ہمارے ساتھی پروفیسر ریاض ملک اور عبدالغفار بھی پینے کے رسیا تھے۔ اسلم مارکیٹ میں ایک فلیٹ میں رہتے تھے، کبھی کبھی ان کی

دعوت پر ہم واہ ہی میں رک جاتے ، کبھی کلب میں اور کبھی فلیٹ میں رات گئے تک محفل جمی رہتی ۔ اُس زمانے میں کلب میں ایک ایسا شخص سیکرٹری منتخب ہوا جس کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا اس نے اعلان کر دیا کہ بار کو بند کر دیا جائے گا ۔ اس پر کافی ردو کد ہوئی ، طے یہ ہوا کہ کلب کے اراکین کی اکثریت جو فیصلہ کرے گی اس پر عمل ہوگا ۔ لیکن جھگڑا یہ آن پڑا کہ شراب کے حامی خفیہ بیلٹ اور مخالفین ہاتھ کھڑا کر کے رائے کا اظہار چاہتے تھے ۔

یہ منافقت تو ہماری ساری سماجی و تہذیبی زندگی میں رچی بسی ہے ۔ بعض چیزیں نہ چاہتے ہوئے بھی ہم صرف اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ خارجی دباؤ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات صرف چند بڑ بولے لوگوں کا غلط فیصلہ اکثریت صرف مروت یا جرات کی کمی کی وجہ قبول کر لیتی ہے ۔ نیشنل سنٹر اس زمانے میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا گڑھ تھا ۔ نظریاتی آویزش بھی عروج پر تھی ۔ ایم ایس ایف کا تو وجود بھی نہیں تھا البتہ جمعیت طلبا اور پی ایس ایف مدِ مقابل تھیں اور اکثر تقاریب میں ان کے درمیان گرما گرمی ہو جاتی تھی ۔ انہی دنوں نیشنل سنٹر میں ایک ثقافتی تقریب ہوئی جس میں رقص بھی شامل تھا ۔ میں اور غلام سرور سب سے آگے بیٹھے ہوئے تھے ۔ تقریب کی منتظمین نے یہ عجب بات کی کہ پیشہ ور رقاصاؤں کو لے آئے ۔ رقص شروع ہوا تو جمعیت کے طلبا کھڑے ہو گئے اور کہا کہ وہ یہ رقص نہیں ہونے دیں گے ۔ جواباً منتظمین نے انہیں باہر نکالنے کی کوشش کی ۔ ہال میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی ۔ میں اور غلام سرور کرسیوں کے نیچے سے بچتے بچاتے باہر نکلے ۔ اندر وہ کرسیاں چلیں کہ الاماں ۔

اس زمانے میں نیشنل سنٹر کی ڈائریکٹر نفیسہ احمد تھیں ۔ طلبا کی ایک تنظیم نے کوئی تقریب کی تو انہیں صدر بنا دیا ۔ تقریب ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ مخالف گروپ کا ایک لڑکا کھڑا ہو گیا اور اس نے کوئی اعتراض کیا ۔ سٹیج سیکرٹری نے جواباً کچھ کہا جس کے نتیجے میں ہال میں سے

کسی نے گالی نکالی۔ نفیسہ احمد کھڑی ہو گئیں اور بولیں "ہائے، اگر آپ نے یہ گالی گلوچ ہی کرنا تھا تو مجھے کس لیے بلایا تھا"۔ سٹیج سیکرٹری بولا "ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ کسی جاہل نے اس طرح گالی بکی، آپ تشریف رکھیں، اب اگر کسی نے گڑبڑ کی تو ہم اس ماں کو...... کر دیں گے" اس طرح کے لطیفے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھرپور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے دن تھے۔ نوجوان کلاشنکوفوں اور ہیروئن سے نا آشنا تھے۔ سکولوں کالجوں میں ادبی انجمنیں قائم تھیں اور جوان قابلیت اس طرح کی سرگرمیوں میں شامل تھی۔ لڑائی جھگڑے اور نظریاتی اختلاف ضرور تھے لیکن ایک دائرے میں۔ لڑکیاں بھی ان محفلوں میں شریک ہوتی تھیں۔ مذاق بھی ہوتے تھے لیکن آج کی طرح جنس پرستی نہیں تھی اسلام نعرہ نہیں تھا، دل کی آواز تھا اس کا احترام تھا۔ ضیاء الحق نے اسے نعرہ بنایا اور عملاً معاشرے میں بدترین فرقہ پرستی کو فروغ ہوا۔

○

میری طرح سرور کو بھی گھومنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس میں احمد داؤد ہمارے ساتھ شریک ہو گیا، چنانچہ ہم تینوں ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی اپنے پٹھو کمروں پر باندھتے، کینوس کے جوتے پہنتے اور کہیں نہ کہیں نکل جاتے۔ ان سالوں میں ہم کاغان، گلگت، چترال، نیلم ویلی اور سوات گئے۔ سوات کا سفر تو یادگار ہے۔ یہ سفر ہم نے سکوٹروں پر کیا۔ ایک سکوٹر پر میں اور غلام سرور اور دوسرے پر ریاض ملک اور عبدالغفار۔

ایک سال ہم نے چترال اور کافرستان جانے کا پروگرام بنایا، اعجاز راہی ان دنوں پشاور میں تھا اور دیر کی بسیں وہیں سے چلتی تھیں، ہم دو دن پہلے پشاور جا پہنچے۔ اعجاز نے بھابھی نرگس کو اپنے کسی اور رشتہ دار کے گھر بھجوا دیا۔ رات گئے تک ہم گپیں لگاتے رہے۔ اعجاز صبح سویرے دفتر نکل گیا۔ ہم اٹھے، نہانے کا خیال آیا، غسل خانہ ایک اور جانے کی جلدی، چنانچہ ہم تینوں صحن ہی میں نہانے لگے۔ باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ ماشکی نے دروازہ کھولا اور چیخ مار کر

مشک وہیں پھینک بھاگ گیا، صحن میں تین ننگ دھڑنگ اچھل کود میں مصروف۔ دوسرے دن اس نے اعجاز راہی سے شکایت کی بلکہ پانی لے کر ہی نہیں آیا۔ پشاور سے ہم دیر پہنچے اور رات کو وہیں قیام کیا۔ وہاں لواری ٹاپ تک ایک ٹرک پر بیٹھ کر گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ لواری ٹاپ سے آگے سفر پیدل کیا جائے۔ سینیٹر ظفر قریشی نے ہمیں کچھ لوگوں کے نام رقعے لکھ دیے تھے جن کے گاؤں راستے میں پڑتے تھے۔ ظفر قریشی اعجاز راہی کے دوست تھے اور اس حوالے سے مجھے بھی جانتے تھے۔ پیپلز پارٹی کے راہنماؤں میں سے دو اشخاص نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ ان میں سے ایک ظفر قریشی اور دوسرے احمد وحید اختر تھے۔ بھٹو بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ یہ دونوں وہ حضرات ہیں جنہوں نے جائز مراعات بھی نہیں لیں۔ دونوں کو شاعری سے شغف تھا۔

لواری ٹاپ سے ہم نیچے اتر رہے تھے اور زور زور سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ لواری ٹاپ سے راستہ عجب طرح کے موڑوں کی صورت میں نیچے اترتا ہے۔ تین چار موڑ کاٹنے کے بعد اچانک آٹھ دس فوجی سامنے آ گئے۔ ہم انہیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ آگے ایک میجر تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر آگے بڑھے اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔ ''دیر سے پنجابی کی آوازیں آ رہی تھیں، ہم لوگ خیموں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اتنے عرصہ بعد پنجابی سنی ہے۔'' یہ انجینئرنگ کور کے لوگ تھے جنہوں نے سڑک بنانے کے سلسلے میں یہاں کیمپ لگایا ہوا تھا۔ ہم ان کے اصرار پر رات وہیں رہے، صبح پھر سفر شروع ہوا۔ راستے میں قیام کرتے دروش پہنچے۔ اُس زمانے میں کافرستان کے راستے کچے تھے اور عموماً لوگ پیدل ہی وہاں جایا کرتے تھے۔ رات ہم نے ایک گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ وہاں ایک جرمن سیاح لیوش کوٹ بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیا، پہاڑ کی سیدھی چڑھائی کے بعد بالکل ڈھلوان، صبح پانچ بجے کے چلے ہم کوئی دو بجے کافرستان پہنچے۔

کافرستان کے لوگوں کا اپنا ایک ثقافتی و تہذیبی رجحان ہے۔ اب تو ان میں سے بہت

سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہمیں وہاں بتایا گیا کہ یونیسکو نے مزید لوگوں کے مسلمان ہونے پر پابندی لگادی ہے کہ اس طرح کافر کلچر ختم ہونے کا اندیشہ ہے۔ کافروں میں قدیم مصریوں کی طرح مردے کے ساتھ اس کا اثاثہ دفن کرنے کا رواج ہے لیکن اب یہ رواج ختم ہوتا جارہا ہے کہ جو کافر مسلمان ہو چکے تھے وہ قبر کھود کر سامان نکال لیتے تھے۔ کافر عورتوں کی خوبصورتی کے چرچے کہانیوں میں پڑھے تھے لیکن وہاں جا کر دیکھا تو ان کے پاس کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہا، ایک عجیب طرح کی بیزاری کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ نہانے کا رواج سال میں ایک ہی بار ہے جب ان کا جشن ہوتا ہے۔ بودھ لک کی روایت شاید کسی زمانے میں موجود ہو لیکن اب تو وہاں بھی ریڈیو اور ڈالڈا پہنچ چکے تھے۔

شمالی علاقوں میں فروٹ کی بہتات ہے۔ خرمانیاں، سیب اور شہتوت اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ کھانے والا کوئی نہیں۔ سڑک کے راستے بھیجیں تو کئی دن لگ جاتے ہیں، ہوائی جہاز سے ممکن نہیں، نتیجہ یہ کہ بہت زیادہ فروٹ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران میں نے وہاں کئی مقامی تاجروں سے گفتگو کی اور پوچھا کہ آپ پھل محفوظ کرنے کے کارخانے کیوں نہیں لگاتے۔ بولے ہمارے پاس سرمایہ نہیں اور حکومت اس طرف توجہ ہی نہیں دیتی۔ ہمارا ملک بنیادی طور پر زرعی ہے اگر ہم زراعت کو صنعت بنا لیتے تو شاید نہ قرضے لینا پڑتے نہ دوسروں کے سامنے گردن جھکانا پڑتی۔ ہمارے آس پاس ایران اور خلیج میں اکثر ممالک گوشت دودھ سبزیاں ہالینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ سے منگواتے ہیں اگر ہمارا کوالٹی کنٹرول صحیح ہو اور ہم یہ سب چیزیں یہاں پیدا کریں تو ان ممالک کو آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت ہوں۔ ہم خود خشک دودھ باہر سے منگواتے ہیں، بے شمار زمینیں بنجر پڑی ہیں اگر اس پر مرغبانی، گوشت کے جانور پالنے، دودھ اور دیگر اشیا کی صنعتیں لگائی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ میرا خیال ہے امریکہ ہمیں یہ صنعتیں لگانے سے منع بھی نہیں کرے گا۔ یہ جملہ یوں ذہن میں آیا کہ ہمارے ہاں ہر کام امریکہ کی مرضی سے

مشروط ہے۔ ہم نے اپنے طور پر ایسا سمجھ لیا ہے۔ شمالی علاقوں میں میوہ جات کو محفوظ کرنے کی صنعت لگ جائے تو اس کے کئی فائدے ہوں، سب سے بڑا تو یہی کہ یہاں کا مزدور کراچی اور لاہور نہ جائے۔ اس کے وہاں جانے سے جو لسانی جھگڑا کھڑا ہوتا ہے، ہم اس سے بھی بچ جائیں اور خود ان علاقوں میں روزگار کے مواقع مہیا ہو جائیں۔ دروش سے بمبریت اور پھر چترال جاتے ہوئے ہم نے سیب کے برابر خرمانیوں کو سڑک کے کنارے سڑتے گلتے دیکھا۔

دیر کی نسبت چترال میں مجھے اپنائیت کا احساس زیادہ ہوا۔ دیر میں لوگ ہمیں پاکستانی کہتے تھے لیکن چترال میں اس طرح کا رویہ نہ تھا۔ یہی احساس مجھے شمالی علاقوں میں بھی ہوا۔ گلگت کی نسبت سکردو جاتے ہوئے بس میں ایک طالب علم کے ساتھ طویل مباحثہ ہوا اس نے ہمیں پاکستانی کہا۔ میں نے کہا...... ''کیا تم پاکستانی نہیں'' اس نے فوراً کہا'' بالکل نہیں ہم تو تمہاری کالونی ہیں'' میں نے کہا'' کیسے'' بولا'' اپنے علاقے میں جیسے بھی ہیں تمہارے نمائندے حکومت کرتے ہیں اور یہاں ہمیں اپنا نمائندہ چننے کا بھی اختیار نہیں''

غلام سرور کے والد حاجی محمد حسین ہماری شام گردی سے بڑے نالاں تھے اور اکثر امی کے پاس آ کر ہم دونوں کی شکایت کیا کرتے تھے۔ سرور کے سکوٹر پر ہم نے واہ کے آس پاس کا بھی سارا علاقہ دیکھا۔ ایک بار ٹیکسلا کے کھنڈرات سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں بدھ کے مجسمے فروخت کرنے والا ایک شخص مل گیا۔ یہ بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ ایک شخص چادر کی بکل لپیٹے اچانک کسی سمت سے نمودار ہو گا۔ آپ کے پاس آ کر بڑے ہی رازدارانہ انداز سے کہے گا ''صاحب بدھ کا مجسمہ اصلی، اسی کھنڈر سے دریافت ہوا ہے......''

پھر وہ بغل سے مٹی میں لتھڑا بدھ کا سر نکالے گا۔ چادر سے اسے صاف کرے گا۔

''صاب صرف پانچ سو روپے انٹیک ہے صاب انٹیک''

اگر آپ اچھے بارگین کرنے والے ہوئے تو پانچ روپے میں مل جائے گا۔ ٹیکسلا کے

آس پاس ایسے ماہر کاریگر موجود ہیں جو بجری ریت اور سیمنٹ سے یہ مجسمے تیار کرتے ہیں، پھر انہیں زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور کچھ دنوں بعد نکال کر ایسے لوگوں کے ہاتھوں، جنہیں انٹیک خریدنے کا شوق تو ہوتا ہے لیکن وہ اس کے بارے میں جانتے کچھ نہیں، اچھے خاصے داموں پر بیچ دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ مجھے ایک بار ایسے بہت سے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ٹیکسلا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھ اصل چیزیں بھی لگ جاتی ہیں اور وہ جانتے بھی ہیں کہ ان کا خریدار کہاں ہے۔ ٹیکسلا کے ان کاریگروں کی فنی تربیت کا کوئی انتظام نہیں، بلکہ الٹا پولیس انہیں مجسمہ بنانے کے جرم میں پکڑ لیتی ہے۔ اگر ایسے کاریگروں کو باقاعدہ تربیت دی جائے اور یہ مجسمے خالص پتھر سے بنائے جائیں تو زرمبادلہ کمانے کا ایک بہت ہی اچھا ذریعہ میسر آ سکتا ہے۔ ایک بار سرور کے ساتھ ان کھنڈروں میں پھرتے ہوئے مجھے بھی ایک ایسا شخص ملا۔ بات پانچ سوسے پانچ روپوں تک آ کر ختم ہوئی، میں نے پندرہ روپے میں بدھ کے تین سر خریدے اور گھر لے آیا۔ الماری میں رکھ دیے دوسرے تیسرے دن امی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے گھر سر پر اٹھالیا کہنے لگیں اس گھر میں یہ بت رہیں گے یا میں، مجھے یہ تینوں مجسمے منصور قیصر کو تحفہ میں دینے پڑے۔

حاجی صاحب کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ سرور کی تنخواہ کتنی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اکثر مجھ سے استفسار کرتے رہتے تھے اور میں سرور کی ہدایت کے مطابق انہیں آگاہ کرتا رہتا تھا۔ ایک شام نیچے کا دروازہ کھٹکا۔ نیچے اترا تو حاجی صاحب گلی میں کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہینڈل والی لاٹھی تھی، کوئی بات کیے بغیر انہوں لاٹھی کا ہینڈل میری گردن میں ڈالا اور چیختے ہوئے بولے...... ''غلط بیانی کرتے ہو'' میں گھبرا گیا'' حاجی صاحب کیا ہوا''

بولے۔..... ''تو نے مجھے بتایا تھا کہ اسے ڈھائی سو ملتے ہیں آج اس کی پے سلپ میرے ہاتھ لگ گئی اس پر تو ساڑھے تین سو لکھا ہوا ہے......''

مجھے اچانک بات سوجھ گئی میں نے کہا۔ ''حاجی صاحب سو روپے تو arrear کے ہیں، کچھ عرصہ پہلے تنخواہ میں سے کٹوتی ہوگئی تھی''۔

حاجی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اس دوران لاٹھی کا پھندا میری گردن میں رہا، پھر بولے۔ ''جھوٹ تو نہیں بول رہے''۔

میں نے کہا'' حاجی صاحب بھلا آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں''۔

انہوں نے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور لاٹھی کھینچ لی۔ دوسرے دن میں نے سرور کو بڑی گالیاں دیں۔ اس طرح کے استفسار امی بھی اس سے کرتی رہتی تھیں۔

سرور سے میری ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی، اس کے بعد کچھ ایسا سلسلہ چلا کہ ہمارے سارے معاملات آگے پیچھے یا ایک ساتھ ہی چلتے رہے۔ واہ سے ایک سال کے وقفہ سے پنڈی آئے ہماری شادیوں میں ایک یا دو مہینے کا وقفہ پڑا۔ وہ جب بھابھی نازی کو دیکھنے گیا تو مجھے ساتھ لے گیا۔ میں جب رخسانہ کو دیکھنے گیا تو اسے ساتھ لے گیا۔ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو وہ بیٹی کا باپ بنا تو ۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو میں بھی بیٹی کا باپ بن گیا۔ ہماری ترقیاں بھی ایک ساتھ ہوئیں۔ ایک ہی تاریخ کو ہم اسسٹنٹ پروفیسر، پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ایک ہی تاریخ کو پروفیسر بنے۔ گھر کے پلاٹوں کی جستجو بھی ہم اکٹھے ہی کرتے رہے اور اب ہمارے گھروں کی دیواریں بھی ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔

احمد داؤد دوستوں میں سے میرے سب سے زیادہ قریب رہا ہے، چھوٹے بھائی کی طرح لیکن مجھے معلوم ہے کہ اندر سے وہ مجھ سے اتنا ہی چڑتا بھی تھا اور آخر آخر میں تو وہ میرے اچھے خاصے مخالفین میں شامل تھا۔ احمد داؤد سے میری ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ ایک شام نیچے کا دروازہ کھٹکا، نیچے آیا تو دو نوجوان کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا...... ''آپ کا نام رشید امجد ہے'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بولا......''میں احمد داؤد ہوں اور یہ یوسف ناز'' یوسف ناز نے بعد میں یوسف چوہدری کے نام سے بہت عمدہ کہانیاں لکھیں۔لمحہ بھر خاموشی رہی پھر احمد داؤد کہنے لگا......''ہم اوراق باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔میں موہن پورہ میں رہتا ہوں اور یہاں سے گزرتے ہوئے لیٹر بکس پر آپکا نام دیکھتا تھا ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے''۔

میں نے کہا......''آپ لوگ بھی کچھ لکھتے ہیں''۔

بولے ''ہاں......افسانہ''

یہ گفتگو کھڑے کھڑے ہی ہوئی پھر ہم کشمیری بازار میں ایک چائے خانے میں جا بیٹھے۔معلوم ہوا کہ دونوں ایف اے کے طالب علم ہیں۔مارشل لاء کے خلاف ہیں اور جلسے جلوسوں میں سرگرم ہیں۔اگلے دن یہ لوگ مجھے ایک ہوٹل میں لے گئے جو خورشید سینما کے بالکل سامنے تھا۔یہاں ان کے اور کئی دوست باقاعدگی سے شام کو اکٹھے ہوتے تھے۔

یوسف چوہدری بعد میں لندن چلے گئے اور طویل عرصہ وہاں رہ کر واپس آئے اور انہوں نے کئی خوبصورت کہانیاں لکھیں۔آہستہ آہستہ احمد داؤد میرے بہت قریب ہوتا گیا۔شام کو وہ پہلے میری طرف آتا،امی کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا،میں اتنی دیر میں تیار ہو جاتا،پھر ہم شالیمار کے لئے نکل پڑتے،عموماً موہن پورہ،سٹی صدر روڈ اور سیڑھیوں کے پُل سے ہوتے ہوئے صدر جی ٹی ایس چوک میں آ نکلتے اور وہاں سے پھرتے پھراتے شالیمار میں آجاتے۔رات کو ہمارا معمول تھا کہ ہم شالیمار سے نکل کر ایک ٹھیکی جی ٹی ایس کے باہر تھڑا ہوٹل پر لگاتے،وہاں سے پیدل چلتے مری روڈ اور کوہاٹی بازار تک آتے،راستے میں مظہرالاسلام کمیٹی چوک،الطاف احمد قریشی کوہاٹی بازار سے آگے اور منظور عارف،میں اور احمد داؤد،جامع مسجد روڈ پر آ نکلتے۔چوک امام باڑہ سے منظور عارف عیدگاہ کی طرف مڑ جاتے اور میں اور داؤد راجا بازار سے ہوتے کشمیری بازار آن نکلتے،جہاں داؤد مجھے گلی کی نکڑ پر چھوڑ کر آگے چلا جاتا۔یہ معمول

برسوں رہا۔ سارے راستے ادبی موضوعات پر بحث ہوتی۔ ۷۷ء کے بعد اس گفتگو کا زیادہ حوالہ سیاسی ہو گیا۔ بھٹو کے ٹرائل کے دنوں میں اکثر گفتگو کیس کے قانونی نکات اور عدالت میں وکلا کے دلائل سے متعلق ہوتی ، اتوار کا دن داؤد عموماً ہمارے گھر گزارتا۔ اس کا معمول تھا کہ تیسرے، چوتھے دن علی الصبح دروازہ کھٹکھٹاتا، میں اوپر سے پوچھتا...... ''کون......''

داؤد کہتا...... ''تین روپے ہیں''

''ہیں'' میں جواب دیتا

''تو جلدی سے آجاؤ ناشتا کریں''

جس دن میں کہتا...... ''تین روپے تو نہیں''

وہ نیچے سے گالی دیتا پھر کہتا...... ''چلو آجاؤ میرے پاس ہیں''

گلی سے نکلتے ہی کشمیری بازار میں سری پائیوں کی کئی دکانیں تھیں، ایک دکان ہماری پسندیدہ تھی۔ ہم وہاں جا بیٹھتے۔ پائے کا ناشتہ کرتے اخبار پڑھتے اور وہیں سے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ داؤد اس زمانے میں بے کار تھا۔

جیلانی کامران گورنمنٹ کالج اصغر مال میں پرنسپل بن کر آئے تو داؤد کو این ڈی وی پی کے تحت وہاں کام مل گیا۔ اُسے پروفیسر واسع کے ساتھ امتحانات کے شعبہ میں لگا دیا گیا۔ جیلانی کامران نے آتے ہی ادبی سرگرمیوں کا ڈول ڈالا اور تجویز دی کہ حلقہ سے ذرا مختلف ایک محفل بنائی جائے جس میں ذرا سنجیدہ اور فلسفیانہ مسائل پر گفتگو ہو۔ مجھے اس کا سیکرٹری نامزد کیا گیا۔ پہلی محفل میرے ہی گھر ہوئی۔ اس محفل میں جیلانی صاحب نے کالج کے کچھ پروفیسروں کو بھی مدعو کیا موضوع تھا ''وحی کی حیثیت''۔ ہم نے جیلانی صاحب کو بہت سمجھایا کہ پنڈی کا ماحول ایسا نہیں، یہ لاہور نہیں لیکن جیلانی صاحب نہ مانے اور انہوں نے بعض ایسے پروفیسروں کو بھی بلا لیا جن کا جماعت سے تعلق سب کو معلوم تھا۔ موضوع بڑا نازک تھا، ظاہر ہے گفتگو میں بعض ایسے

پہلو بھی زیر بحث آئے جو روا داری اور برداشت کا تقاضا کرتے تھے، بس پھر کیا تھا اگلے دن شہر کی دیواروں پر جیلانی کامران کے خلاف قادیانیت کا جرم عائد کر کے فتوے لگا دیئے گئے۔ ہم لوگ بھی لپیٹ میں آ گئے۔ سرور کامران خاص طور پر اس کا نشانہ بنا کہ وہ گورنمنٹ کالج میں تھا اور سب جانتے تھے کہ جیلانی کامران اس کے عزیز ہیں۔

احمد داؤد ایک ذہین شخص تھا، اس کو نئی چیزوں کو جاننے کا جنون تھا، لیکن ساتھ ہی ایک جلد بازی اور عجلت بھی تھی۔ میں اسے کہتا تھا کہ تم دو منٹ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ کتنی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہوتی، وہ ایک دم اٹھ کر محفل سے غائب ہو جاتا، اور پھر اچانک آ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا۔ عشق کا زخم خوردہ تھا، یہ واقعہ میری ملاقات سے پہلے کا ہے۔ سامنے والے گھر میں کوئی لڑکی رہتی تھی، داؤد اُس کی زلف کا اسیر ہو گیا۔ خالص چھا چھی ہونا رکاوٹ بن گیا۔ داؤد کے اندر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ایک اکھڑ پن اور بدتمیزی اس کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ یوں بھی اپنے خاندان میں وہ واحد پڑھا لکھا شخص تھا۔ ایف اے میں تعلیم ادھوری رہ گئی لیکن بعد میں اُس نے ایم اے کر لیا۔ اُس کا تخلیقی سیلف بڑا زبردست تھا۔ اُس کے شروع کے سارے افسانے میں نے لفظاً لفظاً دیکھے ہیں اور شروع شروع میں میں نے ہی انہیں مختلف پرچوں کو بھجوایا۔ ہمارے حلقہ میں مجھے چھوڑ کر شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس کے ساتھ اُس نے بدتمیزی نہ کی ہو، یہ اس کا مزاج تھا، لیکن پھر وہ اپنے رویے کی معافی بھی مانگ لیتا۔

داؤد کی والدہ بہت ہی نیک اور سادہ خاتون تھیں، انہیں گلہ تھا کہ بیٹا ان کی بات نہیں سمجھتا۔ داؤد اسی گھر میں علیحدہ ہو گیا۔ اس کی بعض ضدیں عجب طرح کی تھیں، ایک اتوار کی دوپہر دروازہ کھٹکا۔ دیکھا تو داؤد تھا۔ میں نے کہا آ جاؤ۔ اوپر آ گیا موڈ بہت خراب تھا، ہم کھانا کھانے لگے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ رخسانہ نے پوچھا ''داؤد بھائی موڈ کیوں خراب ہے''

بولا...... ''امی سے لڑائی ہوگئی ہے''

''کیوں''

بولا'' بھنڈیاں پکا رہے تھے۔ میں نے امی سے کہا کہ اس میں ادرک ڈال دیں، وہ بولیں بھنڈیوں میں ادرک نہیں ڈالتے میں نے کہا کیوں نہیں ڈالتے''۔ وہ بولیں '' بس نہیں ڈالتے''میں نے کہا '' یہ کوئی وجہ ہے کہ نہیں ڈالتے، بس اسی پر لڑائی ہوگئی''۔

میں نے اس دوران موٹر سائیکل لے لیا تھا، نیچے والوں سے تعلقات بہت خراب تھے میری انا نے گوارا نہ کیا کہ موٹر سائیکل وہاں کھڑا کروں چنانچہ میں اپنا موٹر سائیکل داؤد کے گھر کھڑا کرتا تھا۔ ڈیوڑھی کھلی ہوئی تھی مجھ سے کوئی پردہ بھی نہیں کرتا تھا اس لیے میرا جب جی چاہتا، میں موٹر سائیکل وہاں کھڑا کر دیتا اور لے آتا، ویسے عموماً موٹر سائیکل سارا دن ہمارے گھر کے نیچے گلی میں رہتا۔ رات کو میں اُسے وہاں چھوڑنے جاتا اور علی الصبح وہاں سے نکال لاتا۔ بعد میں ناولٹی سینما میں رات کی پارکنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے موٹر سائیکل وہاں رکھنا شروع کر دیا۔ موٹر سائیکل رکھنے کے عرصہ میں اکثر صبح سویرے میری اُس سے علیک سلیک ہو جاتی وہ عموماً صحن میں کھڑا دانت برش کر رہا ہوتا۔ ایک آدھی بات ہوتی اور میں موٹر سائیکل نکال کر اپنی راہ لیتا۔

آہستہ آہستہ اس کے رویے میں فرق پڑنے لگا۔ ہوا یہ کہ مرزا حامد بیگ نے جو اس زمانے میں مری میں تھا، پنڈی آنا شروع کر دیا۔ وہ رات کو داؤد کی بیٹھک میں سوتا اور صبح سویرے مری چلا جاتا۔ اُس نے داؤد کو پٹی پڑھائی کہ اگر وہ میرے ساتھ اسی طرح چپکا رہا تو اس کی انفرادیت ختم ہو جائیگی۔ یہ داؤد کا بہت ہی کمزور پہلو تھا۔ اور اسے اس کا احساس بھی تھا۔ عموماً جب وہ کسی محفل میں افسانہ پڑھتا تو کسی نہ کسی حوالے سے اسلوب کے ضمن میں میرا نام ضرور آ جاتا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تو موجود تھی، مرزا حامد بیگ نے اس کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ اس میں دو تین پہلو اور بھی تھے، ایک یہ کہ پاکستان نیشنل کونسل میں ملازمت کی وجہ سے اس کے تعلقات کا

دائرہ خاصا مختلف ہوگیا۔ دوسرے وہ اسلام آباد میں منتقل ہوگیا، تیسرے یہ کہ میرے تعلقات کے دائرے میں بھی تبدیلیاں آگئیں، الطاف احمد قریشی واپس لاہور چلا گیا، مظہرالاسلام سے رابطہ ٹوٹ گیا اور سمیع آہوجہ بھی لاہور منتقل ہوگیا، اعجاز راہی پشاور، سو میرے احباب کا حلقہ یکسر بدل گیا۔ مرنے سے دو دن پہلے وہ اچانک مجھے ملا کہنے لگا...... ''یار تمہیں ملنے اور بیٹھ کر باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا، میں نے کہا آج کچھ بھی ہو جائے میں تمہیں مل کر ہی جاؤں گا''۔

ہم ایک چائے خانے میں بیٹھ، دیر تک نئی پرانی باتیں کرتے رہے اب اُس کی توجہ ڈرامے اور ڈاکومنٹری فلموں کی طرف زیادہ ہوگئی تھی۔ میں نے اُسے احساس دلایا کہ افسانے سے اس کا رشتہ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اُس نے اعتراف کیا، واقعی اُس نے عرصہ سے کہانی نہیں لکھی۔ اس دوران کچھ گلے شکوے بھی ہوئے۔ اُس نے کلاسیک کے دو شمارے نکالے تھے جن میں میری کہانی شامل نہ تھی، اس ملاقات میں جانے کیوں اُسے کلاسیک یاد آگیا، کہنے لگا، بس ہو گیا، خیر اب میں ایک کام کر رہا ہوں، میں تمہارے افسانے ''سمندر قطرہ سمندر'' پر بی بی سی کے لیے ایک ڈاکومنٹری بنانا چاہتا ہوں، تمہیں ٹھیک ٹھاک پیسے مل جائیں گے۔ میں نے بھابھی بچوں کا حال پوچھا، طے ہوا کہ اب ملنے کی کوئی سبیل نکالی جائے، وہ بیوی بچوں کو لے کر میری طرف آئے یا میں سب کے ساتھ اُس کی طرف جاؤں۔ تیسرے دن صبح، ابھی میں ناشتا کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ صبح اکثر فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے لیکن اُس دن، معلوم نہیں فون اٹھاتے ہوئے میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے تھے۔ میں نے کہا......

''ہیلو''

حسن عباس رضا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا...... ''داؤد چلا گیا''

میں نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں چلا گیا۔

حلقہ کی سیاست کا عروج تھا کہ سمیع آہوجہ کراچی سے آکر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کے آنے سے ہمیں ایک اخلاقی قوت ملی وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے آغا بابر، ضیا جالندھری وغیرہ سے پرانے تعلقات تھے۔ شروع شروع میں سمیع انہیں لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، لیکن پانی اپنی ڈھلوان کی طرف ہی جاتا ہے، سمیع نے شالیمار میں آنا شروع کر دیا۔ تابش صدیقی کے ساتھ اُس نے جوائنٹ سیکرٹری کا الیکشن بھی لڑا اور جیت گیا۔ سمیع ان دنوں ہری پور میں کہیں کام کرتا تھا اور اتوار کی صبح کو پنڈی آتا تھا۔ سمیع کے مزاج میں ہر بات کو مبالغے بلکہ غلو کے ساتھ کرنے کی ایسی عادت ہے کہ مخاطب کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ سمیع اکثر اتوار کی شام دیر سے پہنچتا۔ حاضرین اعتراض کرتے کہ کارروائی وقت پر شروع نہیں ہوتی ایک دن میں نے اُسے کہا...... ''یار تم وقت پر آ جایا کرو''۔

سمیع آہوجہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا...... ''آج تو میں نے وقت پر پہنچ ہی جانا تھا مگر جہاز لیٹ ہو گیا''۔ مجھے اگلے دن خیال آیا کہ ہری پور سے کونسا جہاز آتا ہے۔

سمیع کو جدیدحسیت اور خصوصاً نئے افسانے کا عمدہ ذوق ہے۔ ہم میں سے کوئی افسانہ لکھتا تو شام کو دوستوں کو سناتا۔ سمیع آہوجہ ایسے ایسے باریک نکات پر بحث کرتا کہ مزہ آ جاتا۔ میرے جب اُس سے تعلقات بہت قریبی ہوئے تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ عاصمہ بھابھی بہت ہی نفیس، بردبار اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ ہم ان کے گھر جا کر دھماچوکڑی مچاتے، مجال ہے کہ ان کے ابروؤں پر بل بھی آتا۔ اتوار کے دن عموماً میں، داؤد، اعجاز، سرور کامران اور ایک آدھ اور اس کے گھر دھاوا بول دیتے۔ سردیوں میں مولیوں والے پراٹھوں کی فرمائش کر دیتے۔ بھابھی پکاتی جاتیں اور ہم کھاتے جاتے۔ اس عمل میں دو دو گھنٹے گزر جاتے۔ ہم لوگ بہت کھاتے تھے۔ اُس زمانے میں مشہور تھا کہ اگر کسی نے اپنا بھٹہ بٹھانا ہو تو چار آدمیوں کو کھانے پر بلا لے، یہ میں، مظہر، داؤد اور نذیر عامر تھے۔ ایک بار نثار ناسک نے ہمیں صبح پائیوں کے ناشتے

کی دعوت دی ہم پہنچ گئے ۔ پیالے اور نان آنے شروع ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد نثار ناسک روہانسا ہو کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''اگر آئندہ میں تم لوگوں کو بلاؤں تو میں ''فلاں'' ہوں''

سمیع آہوجہ نظریات کے معاملے میں بڑا کٹر تھا، بلکہ کج بحثی کی حد تک کٹر، جس بات پر اڑ جاتا یا جو بات اُس کے ذہن میں آجاتی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہو جائے۔ اس زمانے میں ہم نظریاتی وابستگی سے بڑا بدکتے تھے۔ اپنے آپ کو ترقی پسند تو کہتے تھے لیکن ساتھ ہی سکہ بند ترقی پسندوں کی کھل کر مخالفت بھی کرتے تھے، اس کی وجہ میں بیان کر ہی چکا ہوں کہ ان کے شخصی رویے میں منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایوبی مارشل لاء میں اجمل خٹک، گل خان نصیر اور مینگل کو گرفتار کر لیا گیا۔ گلڈ کو تو توفیق نہ ہوئی کہ کوئی قرارداد پاس کرتی۔ ہم نے ایک قرارداد لکھی جس میں ان لوگوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے قلم کی آزادی اور رائے کی آزادی کے احترام کی اہمیت کا احساس دلایا گیا۔ اتفاق سے یہ اتوار کا دن تھا۔ قرارداد میں نے لکھی اس پر سرور کامران، اعجاز راہی، احمد داؤد، مظہر اسلام اور سمیع آہوجہ نے دستخط کئے۔ ہم نے یہ قرارداد حلقہ کے جلسہ میں گھما دی۔ حاضرین کی اکثریت نے اسے حلقہ کے جلسے کے دستخطوں والا کاغذ سمجھا اور دستخط کر دئے۔ قرارداد میرے پاس پہنچی تو توقع سے کہیں زیادہ دستخط ہو چکے تھے۔ حلقہ سے نکل کر ہم نے اس کی کاپیاں کیں۔ اُس زمانے میں فوٹو کاپی کی سہولت نہیں تھی، اور مختلف اخباروں کے دفاتر میں پہنچا آئے۔ ایک کاپی اے پی پی کو بھی، جس کا دفتر مال روڈ پر تھا دے دی۔ ہم لوگ تو اُس کے بعد شب نوردی پر نکل گئے۔ سنا ہے کہ بعد میں کسی نے ذکر کیا کہ قرارداد کی نوعیت کیا تھی۔ میں تقریباً بارہ بجے گھر پہنچا تو پانچ چھ حضرات دروازے پر کھڑے تھے کہ قرارداد سے ان کا نام نکال دیا جائے انہوں نے بغیر پڑھے دستخط کر دئے ہیں۔ ان میں کئی سکہ بند ترقی پسند بھی تھے۔

سمیع آہوجہ کی خوبی یہ تھی کہ وہ جو بات کرتا تھا علی اعلان کرتا تھا اور اُسے اس کی پرواہ

نہ ہوتی تھی کہ کوئی ناراض ہوگا یا خوش۔ سمیع کے گھر ہماری دھما چوکڑی اکثر رات گئے تک جاری رہتی ۔ بھابھی جب بھی کوئی اچھی چیز پکاتیں ہمیں بلا بلا کر کھلاتیں ۔ مجھے ان پر رشک آتا تھا، اتنے کھلے دل کی عورت میں نے بہت کم دیکھی ہے۔ سمیع آہوجہ بنیادی طور پر کولنگ انجینئرنگ سے متعلق تھا۔ پنڈی میں اس کا میدان خاصا محدود تھا۔ معلوم نہیں اُسے کیسے خیال آیا، یا کیا صورت بنی کہ ایک دن اچانک اُس نے اعلان کیا کہ وہ ایران جا رہا ہے، یہ شاہ کا زمانہ تھا، ساواک کا بدترین دور۔ سمیع کے جانے سے ہمیں ایک بڑے خلا کا احساس ہوا۔ وہ ایسا دوست تھا جو مصیبت کے وقت آپ کے آگے بازو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہم نے سمیع کو بڑی بریفنگ دی کہ ایران میں کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔ لیکن سمیع تو سمیع تھا۔ وہ ہر پھیرے میں یہاں سے لینن اور ماؤ کی کتابوں کے فارسی ترجمے لے جاتا۔ آبادان میں جہاں وہ ملازمت کرتا تھا اُس نے چھوٹا موٹا سٹڈی سرکل بھی قائم کر لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان میں رہ کر بھی شاہ کے خلاف بات کرنا جرم تھا اور معلوم نہیں کیسے ایجنسیوں کو اس کی خبر ہو جاتی تھی، مشہور تھا کہ ساواک کے ایجنٹ یہاں بھی موجود ہیں۔ سمیع نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ صبح سویرے تہران کی ایک مارکیٹ میں ایک خاکروب جھاڑو لگا رہا تھا۔ اکثر دکانیں ابھی بند تھیں۔ خاکروب کو جانے کیا سوجھی کہ جھاڑو لگاتے لگاتے اُس نے نعرہ بلند کیا...... ''شہنشاہ آریا مہر'' قریب سے کسی نے سیٹی بجادی۔ دس منٹ کے اندر اس پورے علاقے کو پولیس نے گھیر لیا۔ ساواک والے آگئے اور انہوں نے دوکانداروں سے مطالبہ کیا کہ سیٹی بجانے والے کو پیش کیا جائے ورنہ پورے علاقے کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

سمیع آہوجہ کا سٹڈی سرکل ساواک کی نظروں میں آگیا۔ ابتدا یوں ہوئی کہ لینن کا کوئی فارسی ترجمہ اُن کے ہاتھ آگیا۔ ایران میں ایسی کتابوں پر سخت پابندی تھی۔ انکوائری شروع ہوئی کہ یہ کتاب کہاں سے آئی ۔ ساواک کا ہاتھ سمیع آہوجہ تک پہنچ گیا۔ سمیع آہوجہ غائب ہو

گیا۔ مہینوں یا سال سے زیادہ۔ اس کی کوئی خبر نہ ملی ۔ بھابھی اپنی جگہ پریشان ۔ معلوم نہیں کس طرح سمیع آہوجہ نے کسی کو کہہ سن کر مجھے ایک خط بھجوایا جس میں مختصراً یہ ساری کہانی بیان کی ۔ اب ہم کیا کریں، ہم میں سے کوئی بھی اتنا اہم اور بڑے عہدے پر نہیں تھا کہ اُس کے لئے براہ راست کچھ کر سکے۔ مجھے ضیا جالندھری کا خیال آیا جو اُس زمانے میں کراچی میں تھے میں نے انہیں ساری صورت لکھ کر بھیجی ۔ضیا نے فارن آفس سے رابطہ کیا، سمیع کے پکڑے جانے کی تصدیق تو ہوگئی ۔مگر اب کیا کیا جائے ۔ طے ہوا کہ سمیع کے والد سے اپیل کرائی جائے میں اُن کے پاس پہنچا، وہ دوسری طرف کے متشدد تھے، بولے، ''میری طرف سے اُسے پھانسی لگا دیں، میں کسی ملحد کے لیے اپیل کر کے اپنے اللہ کو ناراض نہیں کر سکتا''۔

آخر ہم نے عاصمہ بھابھی کی طرف سے اپیل لکھی، کچھ اور دوستوں سے درخواست کی، سمیع کی رہائی ہوگئی، واپس آیا تو پہچانا نہ جاتا تھا۔ ساواک نے مار مار کر اگلے دانت توڑ دئے تھے۔

سمیع رہا ہو گیا۔ مگر ہماری کم بختی آ گئی۔ اُس کے پاس ساواک کے ظلم وستم اور اپنی مہمات کی وہ نہ ختم ہونے والی داستان تھی ، جسے سن سن کر ہم اُدھ موئے ہوگئے ۔ دوسرا ہتھیار سہگل تھا۔ سمیع آتے ہوئے ایران سے سہگل کا پورا سیٹ لایا تھا۔ اب اُسے یہ جنون کہ اُسے ہمیں سنوانا ہے ۔ رات کو محفل شروع ہوتی ۔ بیئر کا کریٹ منگوالیا جاتا ۔ بھابھی کھانا بنا کر اپنے بھائی کے گھر چلی جاتیں ۔ سہگل شروع ہوتا اور درمیان میں ساواک کے ظلم کی کہانیاں اور بئیر کی بوتلیں ۔ اگر کسی کی آنکھ لگ جاتی تو سنے ہوئے ریکارڈ اور کہانیاں دوبارہ سننا پڑتیں۔

مظہر الاسلام کو اونگھنے کی بڑی عادت تھی ۔ اُس کی وجہ سے ہمیں کئی ریکارڈ دوبارہ سننے پڑتے ۔ چنانچہ احمد داؤد اُس کے ساتھ بیٹھتا، جیسے ہی مظہر اونگھنے لگتا، داؤد اُس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتا۔ اُس زمانے میں سہگل سن سن کر ہمارا یہ حال تھا کہ ہم گفتگو بھی سہگل کے گائے ہوئے بھجنوں کے مصرعوں میں کرتے تھے۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''بے زار آدم کے بیٹے'' سمیع

ہی نے مرتب کیا، اپنی جیب سے پیسے لگائے اور چھپوایا، یاد رہے کہ اُس وقت تک اس کی اپنی کوئی کتاب نہیں چھپی تھی۔ اب ہماری شالیمار کی نشستیں پھر سمیع کے دلائل اور گونج دار آواز سے گھمبیر ہو گئی تھیں۔

۷۷ کی پی این اے تحریک میں سمیع آہوجہ اچانک بھٹو کے خلاف ہو گیا اور پی این اے کے جلوسوں میں جانے لگا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ سمیع آہوجہ ایک جلوس میں نعرے لگا تا جا رہا ہے۔ شام کو میں نے پوچھا ''یار تم ان مولویوں کے ساتھ کہاں جا پھنسے ہو'' سمیع نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ سے جیسے میری مبلغ عقل کا مذاق اڑا رہا ہو کہا ''یہ تو موقعہ ہے اقتدار پر قبضہ کرنے کا'' میرے استفسار پر اُس نے کہا ''دیکھنا مولوی حکومت کو کمزور کر دیں گے، ان میں تو اتنی اہلیت نہیں کہ حکومت چلا سکیں تو اب خود بتاؤ میدان کس کے ہاتھ آئے گا''۔

یہ خوش فہمی ہمارے بائیں بازو کو ہمیشہ رہی ہے لیکن اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا اس میں اتنی اہلیت اور قوت ہے کہ کسی خلا کو پر کر سکے۔ پی این اے کی تحریک میں بھی بائیں بازو کی کئی تنظیموں اور لیڈروں نے اسی امید پر بھٹو کی مخالفت کی لیکن اُن کے ہاتھ کیا آیا۔ جس نے آنا تھا وہ آ گیا۔

ایران سے واپسی کے بعد سمیع کے مالی حالات کچھ عرصہ تو بہت اچھے رہے، جو کچھ اُس نے وہاں سے کمایا تھا خرچ ہوتا رہا۔ فضول خرچ بلکہ شاہ خرچ تو تھا ہی، آہستہ آہستہ مالی حالات خراب ہونے لگے، یہاں تک کہ نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔ ہم میں سے کوئی اس قابل نہ تھا کہ اس کی مدد کر سکتا اور یہی بات ہے اس نے کسی سے اس خواہش کا اظہار بھی نہ کیا۔ آخر تنگ آ کر وہ لاہور چلا گیا۔ وہاں اس کا کام آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھابھی اور بچوں کو بھی لے گیا۔ اب اس سے رابطہ کم ہو کر کبھی کبھار کے خط یا ٹیلی فون تک محدود ہو گیا۔ اس دوران اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''جہنم + میں'' چھپا۔ یہ جدید افسانے کا ایک اہم مجموعہ ہے۔

○

اُس زمانے میں پنڈی سے باہر میرا رابطہ اور تعلق صرف اظہر جاوید سے تھا جو کراچی سے عکس نو نکالتا تھا۔ پنڈی کے سب دوست اس پرچے میں چھپتے تھے۔ بعد میں اظہر جاوید لاہور آ گیا اور تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ اظہر جاوید سے ایک قلبی تعلق اس درویشانہ رویے کی وجہ سے ہے جسے اُس نے ساری زندگی اختیار کیے رکھا۔ کئی مواقع تھے جہاں وہ اپنی قیمت وصول کر سکتا تھا لیکن اُس کی انا کا لٹھ اس کے ظاہری قد سے لمبا ہے اور اس کی اسی انا نے میرے دل میں اس کا احترام پیدا کیا ہے۔ وہ ایسا فقیر منش ہے جو ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے تخلیق کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہے۔

○

سرور کامران کا ورود پنڈی میں ساٹھ کی ابتدائی دہائی میں ہوا۔ وہ آتے ہی ہم لوگوں میں گھل مل گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی ساری قابلیت کا اظہار صرف گفتگو میں کرتے ہیں اور لکھنے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں، یہ ایک طرح کی لاابالی بھی ہے۔ لاہور میں پڑھنے کی وجہ سے وہ ٹی ہاؤس کی ادبی سیاست اور نئی لسانی تشکیلات کے بارے میں ہم سے زیادہ معلومات رکھتا تھا، جیلانی کامران کی استانزے میں نے پہلی بار اُسی سے لے کر پڑھی اور ہم کئی دن اُس کے دیباچہ پر گفتگو کرتے رہے۔ ریاضی میں ایم اے کرنے کی وجہ سے اس کی گفتگو میں منطقی استدلال کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور عصری ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔ حلقہ میں عموماً وہی ہمارے گروپ کی طرف سے گفتگو کا آغاز کرتا۔ اُن دنوں وہ پریس انفارمیشن میں تھا۔ جس کا دفتر آرائے بازار کے چوک میں تھا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ یعنی کوئی باقاعدہ گھر نہ تھا۔ اُس کی بائیسکل رات کو جہاں رک جاتی وہیں رات

بسر ہو جاتی ۔ ہم کہتے تھے یہ سائیکل شیخ سعدی کے گدھے کی طرح ہے کہ جہاں رک جائے وہیں قیام ۔ سرور کامران کے والد ہیڈ ماسٹر تھے ۔ اور اُس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے ۔ ماں نے محنت مشقت کر کے بچوں کو پالا ۔ اُس کے دو بھائی اور ایک بہن ہیں ۔ بھائی اس کی طرح تدریس کے پیشہ سے منسلک ہیں اور بہن طب سے ۔ شام کی نشست آہستہ آہستہ ہلکی ہونے لگتی، ایک ایک کر کے لوگ اٹھنا شروع ہو جاتے، آخر میں جو دو چار رہ جاتے ان میں میں، داؤد، مظہر اور سرور کامران رہ جاتے ۔ ہمارا دورہ شالیمار سے شروع ہوتا، راستے میں دو چار جگہ ٹھیکی لگتی اور ہم لوگ شہر آ جاتے، جہاں نگر ہوٹل پر صحافیوں کا ایک گروپ بھی آتا تھا ۔ یہاں لمبی گفتگو ہوتی ۔ لیکن موضوعات کا دائرہ زیادہ تر ادب تک ہی محدود رہتا ۔

سرور کامران کی شادی کے بعد بھی ہماری محفلوں میں کوئی فرق نہ پڑا ۔ بس یہ ہوا کہ اتوار یا چھٹی کو ہم اس کے گھر جمع ہو جاتے ۔ بھابھی ہم سب کو سخت ناپسند کرتی تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ سرور کی آوارگی میں ہمارا بڑا ہاتھ ہے ۔ تدریس کے شعبے میں ہم آگے پیچھے ہی آئے ۔ میں نے نومبر ۶۸ ء میں اور سرور نے جنوری ۶۹ ء میں لیکچرر شپ جوائن کی ۔ اس کی پہلی ملازمت چکوال میں تھی ۔ ہم ہر ہفتہ وہاں پہنچتے یا وہ ہر ہفتہ کی شام پنڈی میں ہوتا حلقہ کی سیاست میں وہ ہمارا ایک رکن تھا حلقہ کا سیکرٹری بھی رہا ۔ جدیدیت کی تفہیم میں اُسے بڑا درک ہے لیکن جیسا میں نے کہا اُس نے اپنی قابلیت کا زیادہ اظہار گفتگو میں کیا اور اپنے غیر سنجیدہ رویے کی وجہ سے لکھنے پر کم توجہ دی ۔

ملازمت کے دوران اُسے نائجیریا جانے کا موقع مل گیا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ کئی سال وہاں رہا ۔ اس دوران اُس سے ایک دو ملاقاتیں ہی ہوئیں ۔ واپس آ کر وہ حلقہ کی سرگرم سیاست میں شامل تو ہو گیا ۔ لیکن بہت سے معاملات میں اس کی سوئی ابھی تک ساٹھ کی دہائی پر رکی ہوئی ہے ۔ پاکستان سے باہر رہنے کی وجہ سے ادبی تاریخ کا ایک لمبا سفر اور اس کے اہم

نکات شاید اس کی نظر سے اوجھل رہے ہیں۔

○

ڈاکٹر ایوب میرزا سے میری پہلی ملاقات ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کی تقریب رونمائی میں ہوئی جس کی صدارت فیض صاحب نے کی تھی۔ اس زمانے میں مظہر الاسلام حلقہ کا سیکرٹری تھا۔ میں اس سے پہلے یہ کتاب پڑھ چکا تھا۔ تقریب سے کچھ دیر پہلے احمد داؤد اور ضیا اقبال شاہد نے نیشنل سنٹر کی سیڑھیوں میں مزدوروں کے حقوق اور فیض صاحب کے خلاف ہاتھ سے لکھے ہوئے دو تین پوسٹر لگائے۔ تقریب کے اختتام پر جب فیض صاحب سیڑھی اتر رہے تھے تو احمد داؤد نے اُن سے کہا...... ''آپ کا رویہ مزدور دشمنی کا ہے' آپ حکومت سے ملے ہوئے ہیں ،وغیرہ وغیرہ'' فیض خاموشی سے سنتے رہتے سیڑھیاں اترے اور ایوب میرزا کی گاڑی میں بیٹھ یہ جاوہ جا، فیض کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُسی وقت تلخی ہو جاتی۔ فیض کی اس خوبی نے انہیں کئی یلغاروں سے بچایا۔ اُن کا کمال یہ تھا کہ کسی معترض کو جواب نہ دیتے۔ ایک عرصہ بعد ایک محفل میں حسن عباس رضا نے ان کے ایک مصرعے کی نشاندہی کی جس میں وزن کی کوئی گڑ بڑ تھی۔ فیض نے اعتراض سن کر ''اچھا'' کہا اور دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں وہ اس معاملے میں بہت سرد مزاج تھے۔ اعتراض سنتے اور خاموش رہتے۔ ان کے خلاف کیا کیا کچھ نہیں لکھا گیا لیکن انہوں نے کبھی جواب نہیں دیا۔ فیض صاحب سے میری دو تین چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں ایوب میرزا کے گھر پر ہی ہوئیں۔ یوں تو فیض رات سرفراز اقبال کے گھر ہی گزارتے تھے لیکن پینے پلانے کی محفل میں شرکت کے لیے آجاتے تھے۔ انہوں نے ہر شہر میں ایک دو جگہیں ایسی رکھی ہوئیں تھیں جہاں شراب اور محفل کے لیے دو چار حسین خواتین جمع ہوں۔ اس سے انہیں غرض نہیں تھی کہ صاحب خانہ ادیب ہے یا نہیں، یا ان کی وجہ سے شہرت حاصل کر رہا ہے۔ اس بارے میں ان کا رویہ بہت ہی غیر سنجیدہ تھا۔ ایوب میرزا جب بھی اس

طرح کی کوئی محفل منعقد کرتے مجھے ذرا جلدی آنے کے لیے کہہ دیتے۔ اس طرح کا موقع مجھے دو چار بار ملا اور سچی بات ہے فیض کی شخصیت نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ ان کی گفتگو میں مشاہدے کی باتیں تو ہوتی تھیں علمی بات انہوں نے کبھی نہیں کی۔ میرا خیال ہے وہ پڑھتے بھی نہیں تھے۔ ان کے سارے علمی سرمایے کی بنیاد وہ ملاقاتیں اور سفر تھے جن کے دوران وہ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں سے ملے۔ ان کی شخصیت میں ایک سحر انگیزی ضرور تھی۔ شعر پڑھنے کا اپنا ایک انداز اور سلیقہ تھا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ فیض نے ہمیں سلیقے کی مار دی ہے۔

ایوب میرزا سے میرے تعلقات آہستہ آہستہ اتنے مضبوط ہوئے کہ فیملی ریلیشن میں بدل گئے۔ میں اُس زمانے میں ساڑھے دس بجے فارغ ہو جاتا تھا اور رخسانہ کو سکول سے ایک بجے لینا ہوتا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اُن کے کلینک میں آجاتا۔ اُس زمانے میں دادا امیر حیدر باقاعدگی سے گیارہ بجے وہاں آتے تھے۔ ہم چائے اکٹھی پیتے۔ ایوب میرزا مریضوں کو دیکھتے رہتے اور میں دادا کے ساتھ گپ شپ لڑاتا رہتا۔ دادا سے ان کے حالات پوچھتا۔ دادا کبھی پنجابی، کبھی اردو اور پھر عجیب وغریب انگریزی میں بولتے رہتے مجھے کچھ سمجھ آتا، کچھ نہ آتا۔

دادا امیر حیدر کا نام میں نے پہلے پہل اُس وقت سنا جب میں پاکستان گرلز ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ سکول کی پچھلی گلی کے دائیں طرف ایک ویران سا گھر تھا۔ اس گھر پر ایک عجب طرح کی اداسی چھائی رہتی تھی۔ اس گھر کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کوئی ایسا سیاسی لیڈر رہتا ہے جس کی اکثر زندگی جیل میں گزرتی ہے، یہ دادا کا گھر تھا۔ جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ جاوید منٹو کے ساتھ رہتے تھے۔ رہتے نہیں تھے بلکہ جاوید منٹو نے ان کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ دادا وہاں سے کئی بار بھاگ نکلے لیکن جاوید منٹو اور ثریا منٹو گاڑی لے کر انہیں تلاش کرتے اور پکڑ کر ساتھ لے جاتے۔ مشہور تھا کہ یہ لوگ روسی ایمبیسی سے دادا کے اخراجات

وصول کرتے ہیں۔ دادا کے نام پر وڈ کا کے کریٹ کے کریٹ لاتے ہیں کہ دادا کے ملاقاتیوں کو پیش کرنا ہیں۔ اُس زمانے میں روسی ایمبیسی میں دادا کے دستخط چلتے تھے۔ یہ بھی سنا کہ یہ لوگ تعلیم یا ویزا کے لیے لوگوں سے پیسے لیتے اور پھر انہیں دادا کے دستخطوں والی چٹ دے دیتے۔ ایسے لوگوں کو فوراً ویزا مل جاتا۔ ایک طرف یہ لوگ دادا کو باہر نہ نکلنے دیتے اور دوسری طرف یہ حال تھا کہ دادا کو سرونٹ کوارٹر میں رکھا گیا تھا۔ کھانا بھی علیحدہ ملتا۔ دادا کے نام پر حاصل کی ہوئی وڈ کا پر ڈرائنگ میں جو پارٹیاں ہوتیں، ان میں دادا کا داخلہ منع تھا۔ دادا چاہتے تھے کہ وہ بنی کے آس پاس رہیں کہ ان کے ملنے جلنے والے اسی طرف تھے لیکن منٹو خاندان کا مفاد اسی میں تھا کہ دادا ان کے لیے شوپیس بنے رہیں۔ کبھی کبھی ایوب میرزا بھی چوری چھپے دادا کو ایک دو دن کے لیے اپنے گھر لے جاتے، معلوم نہیں وہ اس سے کیا فائدہ اٹھاتے تھے۔ دادا کبھی کبھی دونوں کو غچہ دے جاتے اور کئی کئی دن کسی گمنام جگہ پڑے رہتے۔ ایک بار منٹو اور بیگم منٹو دادا کو ڈھونڈتے ایوب میرزا کے کلینک میں آ گئے۔ میں وہیں موجود تھا۔ اُنہوں نے ایوب میرزا پر الزام لگایا کہ وہ دادا کو لے آئے ہیں اور اب انہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ جواباً یہی الزام ایوب میرزا نے ان پر لگایا۔ دونوں فریقوں میں اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ میں نے اُس زمانے میں ایک افسانہ لکھا تھا ''اٹمیک آدمی'' یہ دادا کے بارے میں تھا۔ یہ افسانہ ایک ہفت روزہ میں چھپا۔ بدقسمتی سے اس کی نقل محفوظ نہ رہ سکی۔ دادا ان لوگوں کے لیے واقعی ایک اٹمیک تھے۔

دادا بنیادی طور پر ایک عملی شخص تھے۔ وہ نظریے کے ساتھ ساتھ اس کی عملی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے اکثر ترقی پسند صرف نظریے تک محدود تھے۔ عملی جدوجہد کا ان میں نہ حوصلہ تھا نہ وہ اس کا کوئی شعور رکھتے تھے۔ اصل خرابی یہ ہوئی کہ برصغیر میں ترقی پسندی کی بنیاد رکھنے والے صاحب لوگ تھے۔ انگلستان پڑھنے کے لیے وہی طبقہ جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ مارکس سے رومانوی سطح پر متاثر ہوئے اور شاید اسی لیے رومانیت ہمارے ترقی پسندوں سے کبھی نہ نکل

سکی ۔ دادا جیسے لوگ ان کو پسند نہ تھے ۔ دادا جب روس گئے اور راستے میں جہازی بغاوت میں شریک ہوئے تو ان پر تحریک کے نئے گوشے وا ہوئے ۔ وہ بتاتے تھے کہ روس جا کر انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ روسی حکومت ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی کو ایک خطیر رقم بھجواتی ہے ۔ یہ خطیر رقم کہاں جاتی تھی ۔ اس کے بارے میں دادا کی رائے بڑی تلخ تھی ۔ روس کا اپنا المیہ یہ تھا کہ اس کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دنیا بھر کی کیمونسٹ پارٹیوں کی امداد پر خرچ ہوتا تھا لیکن سوائے ایک دو جگہوں کے کہیں انقلاب نہ آیا اور اسی مسلسل خسارے سے خود روس ٹوٹ گیا۔

دادا جب روس سے واپس آئے تو ایک ذاتی دکھ کے ساتھ ساتھ عملی جدو جہد کا ایک نیا ولولہ ان کے ساتھ تھا۔ ذاتی دکھ یہ تھا کہ قیام روس کے دوران انہیں ایک خاتون سے عشق ہو گیا۔ شادی کے عہد و پیمان ہو گئے لیکن پارٹی فیصلے کے مطابق دادا کو واپس آنا پڑا۔ بمبئی میں دادا کی آمد کو پارٹی لیڈروں نے پسند نہ کیا۔ ایم این رائے نے انہیں جنوب میں بھجوا دیا کہ وہاں پارٹی کو منظم کریں ۔ بمبئی میں دادا کی موجودگی انہیں اس لیے قبول نہ تھی کہ دادا کی ریڈیکل پالیسی ان کی صاحبیت والے کیمونزم کو نقصان پہنچا سکتی تھی ۔ بمبئی میں تھوڑے سے قیام کے دوران دادا نے دو ایک فیکٹریوں میں ہڑتال کروادی۔ وہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو در پردہ مزدوروں کی مالی مدد کرتے تھے ۔ دادا نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک ایسی ہڑتال کے دوران ہمارے پاس چندہ بالکل ختم ہو گیا۔ نرگس کی والدہ جدن بائی کمیونسٹ پارٹی سے بڑی ہمدردی رکھتی تھی ۔ ایک رات ہمیں کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ۔ دادا جدن بائی کے گھر پہنچے وہاں اُس وقت بمبئی کے کچھ صنعت کار موجود تھے اور جدن بائی کا گانا ہو رہا تھا۔ دادا نے کسی طرح انہیں پیغام بھیجا۔ جدن بائی ایک لمحے کے لیے دوسرے کمرے میں آئیں دادا نے انہیں اپنی ضرورت سے آگاہ کیا۔ جدن بائی نے صنعت کاروں سے کہا ایک کارِ خیر کے لیے چندہ درکار ہے ۔ اس کی خواہش پر سب نے بڑھ چڑھ کر پیسے نکالے مزے کی بات یہ تھی کہ ان میں تین چار حضرات وہ بھی تھے جن کی فیکٹریوں

میں ہڑتال تھی اور انہی فیکٹریوں کے مزدوروں کے لیے رقم درکار تھی۔

پارٹی کے حکم پر دادا کو جنوب جانا پڑا۔ وہاں دادا نے پارٹی کو جس طرح منظم کیا اس کی ساری داستان ایوب مرزا کی کتاب میں آ چکی ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں سے دادا بمبئی پہنچے تو تقسیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ بمبئی والوں نے دادا سے جان چھڑائی اور انہیں کراچی بھیج دیا۔ کراچی والوں نے دادا کی ریڈیکل پالیسوں سے اتفاق نہ کیا اور انہیں کہا کہ لاہور میں ان کی بڑی ضرورت ہے اور لاہور والوں نے اسی اہم ضرورت کا بہانا بنا کر انہیں پنڈی بھجوا دیا۔ روس میں ٹریننگ کے دوران دادا پارٹی ڈسپلن سیکھ گئے تھے چنانچہ اختلاف رکھنے کے باوجود وہ خاموشی سے پنڈی آئے۔ یہاں انہیں آفس سیکرٹری بنا کر ایک کمرے میں بیٹھا دیا گیا۔ پنڈی کے کمیونسٹوں میں خواجہ مسعود بڑے نمایاں تھے لیکن یہ بھی صاحب کمیونسٹ تھے نئے نئے لڑکوں کو بٹھا کر کمیونزم پر لیکچر دینا اور بس۔ جمیل ملک، احمد ظفر وغیرہ ان کے طالب علم تھے۔ خواجہ مسعود نے گورڈن کالج میں یہ شمع جلائے تو رکھی لیکن اپنے ایسے شاگرد پیدا کئے جو ہوا سے بھی ڈرتے تھے۔ ۷۷ء کے مارشل زمانے میں ایک دن میں اور جلیل عالی، جمیل ملک کے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ اب یاد نہیں کس حوالے سے میرے منہ سے ترقی پسند تحریک کے لفظ نکل گئے۔ جمیل ملک نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھی اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا پھر بولے...... "مروانے لگے ہو تمہیں معلوم نہیں ہمارا کالج فوج کے تحت ہے"

خواجہ مسعود کی ترقی پسندی بھی ایسی ہی تھی۔ ایک طرف ان کے تعلقات فوج اور بیوروکریسی سے تھے اور دوسری طرف وہ نوجوان کیڈر تیار کر رہے تھے۔ ان کی بیوی سلمٰی مسعود سی بی کالج کی پرنسپل تھیں جہاں سارا عمل دخل کنیٹ فلاسفی کا تھا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے دوران ان کے بیٹے نے میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ٹی وی پر اس کا انٹرویو نشر ہوا۔ جس میں موصوف نے کہا کہ وہ "دو کتابوں سے بڑے متاثر ہیں ایک قرآن مجید دوسرے فرنیڈز نا ٹ

ماسٹر (ایوب خان کی کتاب)''۔ خود خواجہ مسعود بھی ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ بھٹو کے ابتدائی دور میں جب تعلیمی اداروں کو قومیانے کی پالیسی شروع ہوگئی تو ہم لوگوں نے بھی کینٹ کالجز کو وفاقی تحویل میں لینے کی مہم شروع کی۔ اُس زمانے میں غلام سرور ہماری ایسوی ایشن کے صدر اور میں جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے کینٹ کی مختلف تنظیموں سے مل کر ایک مرکزی تنظیم قائم کی۔ اسی سلسلے میں نیشنل سنٹر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا، جس کی صدارت اس وقت کے وفاقی سکرٹیری تعلیم عبدالعلی نے کی، یہ ولی خان کے بھائی ہیں، بڑے دبنگ اور کھرے شخص، طے ہوا کہ خواجہ مسعود کو تقریر نہیں کرنے دینا۔ تقریب کے دوران وہ بار بار چٹ بھیجتے کہ مجھے بھی بات کرنے دیں، لیکن سیکرٹری نے ان کا نام نہ پکارا، آخر میں صدر نے تقریر کی، ہم نے کہا کہ لو جی آج خواجہ صاحب کو موقع نہیں مل سکا۔ لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی صدر نے تقریر ختم کی اور سیکرٹری جلسہ کے اختتام کا اعلان کرنے مائیک پر آئے، خواجہ مسعود جو حاضرین میں بیٹھے ہوئے تھے کھڑے ہو گئے اور بولے ''صدر صاحب باقاعدہ جلسہ تو ختم ہو گیا لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام حاضرین کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کروں، آپ نے بہت عمدہ تقریر کی ہے'' اور اس کے بعد پانچ چھ منٹ تک صاحب صدر کی تعریف کرتے رہے۔

ایوب مرزا میں کچھ خوبیاں اور کئی خامیاں تھیں، خوبیاں یہ کہ دوستوں کے دوست تھے لیکن خرابی یہ کہ منہ پھٹ، جس پر احسان کرتے وہ بھی متاثر نہ ہوتا۔ انہیں اس بات کا قلق تھا کہ لوگ انہیں بڑا ادیب نہیں سمجھتے۔ فیض کے بعد انہوں نے دادا پر بھی ناول لکھا جو دو جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ اچھا دستاویزی ناول ہے۔ لیکن ایوب مرزا محنت سے جان چھڑاتے تھے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اسے دوبارہ لکھیں، مگر وہ نہ مانے چنانچہ کئی چھوٹی موٹی غلطیوں کے ساتھ یہ ناول اسی طرح چھپ گیا۔ ادب کے ساتھ ساتھ ان کا ایک گہرا تعلق بائیں بازو کی سیاست سے بھی تھا۔ وہ عرصہ تک پاک چین دوستی کے صدر اور مختلف عہدیدار رہے ہیں۔ روس کے انتہائی

عروج اور اثر کے زمانے میں وہ چین دوستی کے حوالے ہی سے اپنی پہچان رکھتے تھے۔میجر اسحاق اور افضل بنگش ان کے ذاتی دوست تھے۔ان کی ایک اطلاع کی وجہ سے افضل بنگش اور سرحد کے کئی اہم بائیں بازو کے لیڈر بچ گئے۔ہوا یوں کہ سرحد میں کسانوں کی تحریک چل رہی تھی اور اپنے عروج پر تھی۔ایوب مرزا کے گھر پارٹی تھی۔ پارٹی میں نشے کے عالم میں ایک جرنیل صاحب نے انکشاف کر دیا کہ صبح خوانین کی طرف سے ایک زبردست حملہ ہونے والا ہے جسے سرکاری سرپرستی حاصل ہے،ایوب مرزا بھی نشے میں تھے لیکن وہ باتھ روم جانے کے بہانے باہر آئے اور دوسرے کمرے سے کسی دوست کو فون کیا کہ اسی وقت پشاور روانہ ہو کر بنگش کو پیغام پہنچائے۔اس بروقت پیغام نے بہت سے لوگوں کو بچا لیا۔

بنگش کے ساتھ ایوب مرزا کے تعلقات گھریلو سطح کے تھے۔ان کے بیٹے امجد ایوب مرزا کی شادی کا مرحلہ آیا تو ایوب مرزا کی نظر انتخاب بنگش کی بیٹی پر پڑی۔مجھ سے بھی مشورہ کیا۔ بنگش اس زمانے میں لندن میں تھے۔ایوب مرزا بھی وہیں پہنچے بات ہوئی۔چل پڑی،فائنل ہونے لگی تو بنگش نے ایک فہرست پیش کر دی کہ اتنی جائیداد لڑکی کے نام کی جائے کہ یہ ان کی قبائلی روایت ہے۔بات ختم ہو گئی لیکن ایوب مرزا کو عرصہ تک یہ رنج رہا کہ یہ رویہ ترقی پسندی کے خلاف ہے۔میں نے انہیں کہا،کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے اکثر ترقی پسندوں کا ذاتی رویہ ایسا ہی ہے۔ایک بار مجھے پشاور میں ایک خاتون نے اسی طرح کا ایک واقعہ سنایا۔میں یوسف حسن،جلیل عالی اور احمد جاوید ترقی پسند دوستوں کی دعوت پر دو ایک دن کے لئے پشاور گئے تھے۔وہاں ایک خاتون نے جو حقوق نسواں کے لئے کام کر رہی تھی ہمیں بتایا کہ جب انہوں نے انجمن حقوق نسواں بنائی تو پیٹرن کے لئے وہ بیگم نسیم ولی کے پاس گئی۔بیگم ولی نے بات سن کر انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم نہیں جانتیں کہ ہماری قبائلی روایات عورت کی آزادی کے خلاف ہیں اور اس کی اجازت دی بھی نہیں جاسکتی۔اس خاتون نے کہا،"آپ بھی تو لیڈر

ہیں'' اس پر بیگم ولی غصے میں آ گئیں اور بولیں ''میری بات مت کرو میں خان زادی ہوں''

ایوب مرزا کو اس بات کا ہمیشہ گلہ رہا کہ اُن کی بیوی بچے ان کی بات نہیں سنتے اور جس ادبی مرتبے کے وہ مالک ہیں اُس کے مطابق ان کی عزت نہیں کرتے۔ وہ گھر میں بھی، کلینک میں بھی، دوستوں کی محفل میں بھی ہر جگہ خود کو فیض صاحب سے وابستہ کرتے تھے۔ ایوب مرزا کے مزاج میں بڑی تلخی تھی۔ بیگم تو ان کی خیر افغانستان کے شاہی خانوادے سے تھیں اور فارسی ان کی مادری زبان تھی، وہ ایوب مرزا کو کیا خاطر میں لاتیں۔ ایوب مرزا ایک مالی کے بیٹے تھے، البتہ ان کی بیٹی علینہ بہت ہی نفیس، شریف النفس بچی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر بن کر باپ کی خواہش پوری کر دی۔ امجد ایوب مرزا بڑی کوششوں سے ڈاکٹر تو بن گیا لیکن آخر لندن جا کر اُس نے قالینوں اور انٹیک کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس سے چھوٹا سرمد تو ایف اے کے زمانے ہی میں باغی ہو گیا تھا۔ سنا ہے اب وہ لندن میں گٹار بجاتا ہے۔ ۷۷ کے مارشل لاء میں جو پہلا جلوس نکلا اس کی قیادت امجد ایوب اور ارشد نامی ایک طالب علم نے کی۔ دونوں کو سزا ہو گئی۔ امجد ایوب عمر کی وجہ سے کوڑے کھانے سے بچ گیا۔ ایوب مرزا نے اپنے اثر و رسوخ سے اسے جیل سے نکلوایا اور میڈیکل پڑھنے چین بھجوا دیا۔ وہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رکھتا۔ وہاں سے اُس نے ایک اردو رسالہ بھی نکالا جس پر چینی حکومت نے کافی ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن پاک چائنا دوستی انجمن کا عہدیدار ہونے کی وجہ سے ایوب مرزا اُسے ہر مشکل سے بچا لیتے۔

ایک بار اُنہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ بچے میرا کہا نہیں مانتے تم انہیں سمجھاؤ۔ چین میں، میں ہی امجد سے خط و کتابت کر کے ایوب مرزا کی باتیں اس تک پہنچاتا تھا۔ میں نے کہا ''عزت سے آپ کا مطلب کیا ہے''......

کہنے لگے ''جیسے میں اپنے باپ کی کرتا تھا''

میں نے پوچھا ''کیا آپ کے والد آپ کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتے تھے، گپیں لگاتے'

تھے''۔ بولے''کیا کہہ رہے ہو، اُس زمانے میں تو ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا''۔

میں ہنس پڑا، میں نے کہا''آپ اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر شراب پیتے ہیں، انہیں اپنا دوست کہتے ہیں'' کہنے لگے''یہ تو ٹھیک ہے''۔

میں نے کہا''دوست تو دوست ہی ہوتا ہے۔ برابر کے تعلقات والا۔ آپ اس سے روایتی تعظیم کی توقع کیسے کر سکتے ہیں''۔

ہماری نسل کا المیہ ہی یہ کہ ہم اپنے بچوں سے دوستوں کی طرح سلوک کرتے ہیں کیونکہ یورپ کی تقلید اسی طرح ہوتی ہے لیکن دوسری طرف ان سے روایتی تعظیم کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ میں نے ایوب مرزا سے کہا کہ اگر آپ یورپ کی تقلید کر کے بچوں کو دوست بنائیں گے تو پھر آپ کو اس کے لیے بھی تیار رہنا پڑے گا کہ آپ کا بیٹا اپنی گرل فرینڈ کو لے کر اپنے کمرے میں چلا جائے اور آپ سے کہے کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے گا۔

○

بچوں کی تربیت کا تو اب معاملہ ہی ختم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اخلاق ہمارے معاشرے سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے امی کی نصیحتیں صبح سے شروع ہوتی تھیں اور سونے تک جاری رہتی تھیں۔ صبح اٹھتے ہی وعظ شروع ہو جاتا۔ دانت صاف کیے۔ اللہ کا نام لیا۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ بسم اللہ سے شروع کرو۔ الحمد للہ کہو وغیرہ وغیرہ ۔ یہ پند وعظ رات گئے تک جاری رہتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب کچھ عادت کا حصہ بن گیا۔ امی کہتی تھیں دائیں ہاتھ سے گلاس نہ پکڑو تو پانی زہر بن جاتا ہے۔ مجھے اب اچھی طرح معلوم ہے کہ پانی زہر نہیں بنتا لیکن لاشعوری طور پر میں ہمیشہ پانی کا گلاس دائیں ہاتھ ہی سے اٹھاتا ہوں۔ وہ کہتی تھیں کہ پانی پیتے ہوئے چار دفعہ وقفہ آنا چاہیے کہ اس سے برکت پیدا ہوتی ہے مجھے اس کی ایسی عادت پڑی ہے کہ پانی پیتے ہوئے لاشعوری طور پر یہ وقفے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بچوں کی

اخلاقی تربیت اسی طرح ہوتی تھی کہ ساری زندگی وہ باتیں مزاج کا حصہ بن جاتی تھیں، اب یہ صورت نہیں ہم نے اول تو کبھی بھولے سے بھی بچوں سے اس طرح کی باتیں نہیں کہیں اور اگر کبھی خیال آ بھی جائے تو بچے سننا پسند نہیں کرتے کہ ہم نے انہیں اس کی عادت نہیں ڈالی۔ اب ان کی آنکھ کھلتی ہے تو ٹی وی لگا ہوتا ہے، آنکھ بند ہوتی ہے تو اُس وقت بھی ٹی وی کی سکرین روشن ہوتی ہے۔

○

ایوب مرزا کے توسط سے میری کئی ایسی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی جن کا ادب سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ ان میں ایک میجر محمد اسحاق تھے۔ میجر اسحاق سے میری پہلی ملاقات احمد داؤد کے حوالے سے ہوئی تھی۔ داؤد کے گھر سے ذرا آگے رضوی رہتا تھا، جو مزدور کسان پارٹی کی پنڈی شاخ کا سیکرٹری تھا۔ میجر اسحاق جب بھی پنڈی آتے، رضوی کی بیٹھک میں ہم خیال دوستوں کا اکٹھ ہوتا۔ پہلی بار داؤد مجھے وہاں لے گیا۔ داؤد بھی مزدور کسان پارٹی میں شامل تھا، لیکن ۷۷ء کے بعد داؤد کا کردار بڑا مشکوک ہو گیا تھا۔ بہت سے باخبر لوگ اسے مخبر سمجھتے تھے۔ سنا تھا کہ اُس دور میں میجر اسحاق نے اپنے خاص لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ جب پنڈی آئیں تو داؤد کو خبر نہ ہو۔ داؤد اُس زمانے میں پنڈی کے میئر غلام حسین کا غیر اعلان شدہ پریس سیکرٹری تھا۔ غلام حسین کے ضیاء الحق سے تعلقات سب کو معلوم تھے۔ اسی زمانے میں مجھے لاہور سے فون آیا کہ محتاط رہو، میں نے تفصیلاً پوچھا تو اُس دوست نے صرف اتنا کہا کہ تمہارے حلقہ میں ایک شخص ٹھیک نہیں۔ الطاف احمد قریشی بھی باخبر شخص تھا اُس کی اطلاع بھی یہی تھی۔

ایوب مرزا بھی بائیں بازو کی وجہ سے مزدور کسان پارٹی سے گہری ہمدردی رکھتے تھے اور اکثر انہیں ایسی خفیہ اطلاعات بھی پہنچاتے تھے جو ایوب مرزا کو اپنے گھر، شراب کی محفلوں میں جرنیلوں اور بیورو کریٹس سے حاصل ہوتی تھیں۔ دائیں بازو کے راہنماؤں میں مجھے میجر

اسحاق بہت بہتر لگتے تھے، ان کے مزاج میں ایک دھیما پن اور گفتگو میں استدلال تھا۔ میں نے دوسرے بہت سے ترقی پسندوں کی طرح اُن کی منہ سے مذہب کی مخالفت نہیں سنی۔ ہمارے اکثر ترقی پسندوں نے بغیر سوچے سمجھے مذہب کو اپنا مخالف بنالیا، اس میں انگریزوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم کا مقابلہ کوئی فکری تحریک ہی کر سکتی ہے، چنانچہ انہوں نے ایک پلاننگ کے تحت اسلام اور کمیونزم کا تضاد پیدا کر دیا حالانکہ اسلام اور کمیونزم کے بنیادی عقائد اور اخلاقیات ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اقبال نے یوں ہی تو نہیں کہ دیا تھا کہ نیست پیمبر و لے در بغل دارد کتاب۔

عبید اللہ سندھی نے کہیں لکھا ہے کہ لینن اسلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور سٹالن تو برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کا ایک بلاک بنانا چاہتے تھے، لیکن شاطر برطانیہ نے نہ صرف یہ بلاک نہیں بننے دیا بلکہ الٹا مسلمانوں کو کمیونسٹوں سے ایسا لڑایا کہ یہ لڑائی پھر مسلمان ہی نے لڑی۔ انگریز کا یہ منصوبہ افغانستان میں جا کر مکمل ہوا۔ ہمارے ترقی پسند عملی کی بجائے آئیڈیلسٹ تھے۔ انہوں نے نہ تو یہاں کے ثقافتی مزاج کو سمجھا اور نہ مذہب کے گہرے اثرات کو محسوس کیا۔ ان کے سامنے صرف کتاب تھی، وہ کتاب پڑھ کر انقلاب لانا چاہتے تھے۔ میجر اسحاق مختلف شخص تھے۔ ایک بار انہوں نے بتایا کہ وہ جب کسی گاؤں میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے وہاں کی مسجد میں جاتے ہیں، نماز پڑھتے اور پھر کسانوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں، اگر یہ نکتہ ہمارے سارے ترقی پسندوں کو سمجھ آجاتا تو شاید انقلاب کب کا آچکا ہوتا۔ لیکن ہماری ترقی پسندی تو شاندار ڈرائنگ روموں تک محدود تھی۔ شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے، حسین خواتین کے قرب سے لطف اٹھاتے ہوئے ہم صرف کتابی باتیں کرتے تھے جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ روس کے حالات اور تھے، ہمارے اور، پھر یہ کہ عیسائیت کے مقابلے میں اسلام بہت زیادہ ترقی پسند اور گہرے اثرات والا مذہب ہے اور چرچ کی رسومات

کے مقابلے میں مسجد کا تقدس بہت مختلف ہے۔ میجر اسحاق اس نکتہ کو سمجھتے تھے، مزدور کسان پارٹی نے اپنے زمانے میں کسانوں کی بہبود کے لیے ایک جامع منصوبے پر عمل کیا اور اس کی وجہ سے دیہی سیاست میں کئی اچھی باتیں ہوئیں۔

○

۷۷ء کے مارشل لاء میں داؤد کے علاوہ کئی اور نوجوانوں کا کردار بھی مشکوک تھا، ان میں ضیا اقبال شاہد بھی تھا۔ ۷۷ء کے مارشل لاء میں جب بھٹو کا کیس عدالت میں تھا۔ صلاح الدین محمد نے اچانک شالیمار آنا شروع کر دیا، صلاح الدین محمد ڈھاکہ سے اسلام آباد آئے تھے۔ ادیب سہیل نے جو ایک زمانے میں صلاح الدین محمد کے فیچر سنڈیکیٹ میں سکرپٹ رائٹر تھے مجھے اُن کی ترقی پسندی کے پس منظر سے آگاہ کیا تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد صلاح الدین محمد کو پورے پروٹوکول کے ساتھ ڈھاکہ سے رخصت کیا گیا اور اسی پروٹوکول کے ساتھ اسلام آباد میں ان کا استقبال ہوا۔ وہ سیدھے پی سی میں گئے۔ دو تین دن وہاں ٹھہرے اور پھر بھٹو سے ملاقات کے بعد لاہور چلے گئے۔ شالیمار میں اچانک ان کے ورود سے کئیوں کے ماتھے ٹھنکے۔ منظور عارف نے مجھے خبردار کیا کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا۔ صلاح الدین محمد نے پہلے داؤد کو ٹرائی کیا لیکن داؤد کا اکھڑ پن اُس کی ساری پی آر کو برباد کر کے رکھ دیتا تھا۔ صلاح الدین محمد کا معمول تھا کہ وہ پہلے شالیمار آتے گپ شپ لگاتے۔ اس زمانے میں اختر حسین جعفری بھی پنڈی میں تھے۔ وہ بنیادی طور پر وکیل تھے، منظور عارف بھی وکیل تھے، الطاف احمد قریشی، مسعود اللہ خان وغیرہ صحافی، ایک دو وکیل اور بھی آتے چنانچہ بھٹو کیس کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہوتی۔ سپریم کورٹ میں جو دلائل دیئے جاتے، وہ اگلے دن اخباروں میں چھپ جاتے، یہ سارے حضرات ایک ایک نکتے پر تفصیلی بحث کرتے۔ صلاح الدین محمد کچھ دیر خاموش رہتے، بحث سنتے پھر داؤد کو لے کر اٹھ جاتے، داؤد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اکیلا واپس آتا۔ شاید بات نہیں

بنی چنانچہ صلاح الدین محمد نے احمد داؤد کی جگہ ضیا اقبال شاہد کو ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ ضیا اقبال شاہد نصرت بھٹو کا پریس سیکرٹری بن گیا ہے۔ صلاح الدین محمد واپس لاہور چلے گئے۔

اگلے مرحلوں کی تفصیل مجھے براہ راست تو معلوم نہیں لیکن سنی سنائی باتیں یہ تھیں کہ نصرت بھٹو کا بیان ابھی پریس تک نہیں آتا کہ اس کی نقل ایجنسیوں کو مل جاتی۔ اس بات کی تصدیق بہت بعد میں جا کر یوں ہوئی کہ معلوم ہوا کہ ضیا قبال شاہد کے والد ضیاء الحق کے باڈی گارڈ کے انچارج تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ضیاء الحق کے باڈی گارڈ کا انچارج ایسا شخص نہیں ہوسکتا جس کا بیٹا بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہو اور بیگم بھٹو کا پریس سیکرٹری بھی ہو۔

منظور عارف سے میری پہلی ملاقات نثار ناسک نے کرائی۔ عارف صاحب اُس زمانے میں چیمبر آف کامرس کے سیکرٹری تھے جس کا دفتر میرے گھر کے قریب ہی موہن پورہ نیو سکیم میں تھا۔ منظور عارف پنڈی کے ترقی پسندوں میں واحد شخص تھے جو باقاعدگی سے حلقے میں آتے، نئے لوگوں سے ملتے، ان سے گفتگو کرتے اور شام کو ان کے ساتھ بیٹھتے۔ ان کا تعلق سابق کیمبل پور حالیہ اٹک سے تھا۔ وکیل تھے لیکن وکالت نہیں کی۔ کچھ عرصہ پریس انفارمیشن میں رہے لیکن مزاج کے لاابالی پن کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی۔ جمیل ملک، احمد ظفر اور منظور عارف ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے اتنے گہرے کہ منظور عارف نے اپنے بڑے بیٹے کا نام احمد جمیل رکھا تھا۔ میں جس زمانے میں گورڈن کالج میں ایم اے کر رہا تھا، منظور عارف کے تعلقات سلطان رشک سے بہت تھے، شام کو ہم لوگ مختلف ہوٹلوں میں بیٹھتے تھے، منظور عارف عموماً سلطان رشک کے ساتھ ہوتے ان کے تیسرے ساتھی رفعت سلطان تھے جنہیں ہم ایمن کلیان کہتے تھے کیونکہ وہ ہر مشاعرے میں گا کر غزل پڑھتے تھے۔ رفعت سلطان محکمہ خوراک میں تھے، ان کے ساتھ اسی محکمہ میں محمود اختر کیانی بھی تھے، اچھے شاعر، بڑے خوش گفتار، ملنسار، وہ

جوانی ہی میں مر گئے ۔ ان کی دو بیٹیاں حدیقہ کیانی اور عارفہ کیانی بعد میں گلوکارہ بنیں ۔ یہ راجا حسن اختر کا خانوادہ تھا و محمود اختر کے بڑے بھائی ہیں ۔ میں کبھی کبھی اُن کے دفتر، جو لیاقت باغ کے بالکل سامنے تھا جاتا تھا، اُس زمانے میں چینی کی بڑی قلت تھی راشن ڈپو سے لائن لگا کر چینی حاصل کرنا پڑتی تھی ۔ میں جب بھی اُن کے پاس جاتا وہ میرے نہ نہ کرنے پر بھی پانچ دس کلو چینی کا پرمٹ بنا دیتے ۔ وہ حلقوں میں بہت کم آتے تھے ۔ رفعت سلطان حلقہ میں تو نہ جاتے البتہ شام کو باقاعدگی سے آتے ۔ حلقہ میں ہمارا آنا جانا زیادہ ہوا تو منظور عارف ہمارے ساتھ بیٹھنے لگے ۔ یوں بھی ان کے خیالات کے حوالے سے ہم ان سے زیادہ قریب تھے ۔ منظور عارف ایک سچے ترقی پسند تھے، زندگی بھر انہوں نے تکالیف اٹھائیں مگر کوئی ناجائز رعائت حاصل نہیں کی ۔ اٹک کے قیام کے زمانے میں فتح محمد ملک، شفقت تنویر مرزا اور منو بھائی وغیرہ کالج کے طالب علم تھے ان لوگوں کی ذہنی تربیت میں منظور عارف کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اٹک سے وہ کوئی ہفت روزہ بھی نکالتے تھے ۔ اس ہفت روزہ کے لئے انہوں خان عبدالغفار خان کا ایک انٹرویو بھی کیا تھا ۔ منظور عارف بتاتے تھے کہ اُس زمانے میں خان صاحب نظر بند تھے ۔ ان پر ہمیشہ پاکستان دشمنی کا الزام لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس انٹرویو میں خان صاحب نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کی تھی ۔ خان صاحب نے منظور عارف کو بتایا تھا کہ قائداعظم سے ان کی ملاقات طے تھی لیکن خان عبدالقیوم خان نے قائداعظم کے ایسے کان بھرے کہ ملاقات نہ ہو سکی اور یوں پاکستان کی تاریخ میں ایک ناخوشگوار روایت کی بنیاد پڑ گئی ۔

چیمبر آف کامرس کی نوکری چھوڑ کر منظور عارف کنٹریکٹ پر ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے یہاں انہیں ہر ہفتہ ایک ڈراما لکھنا پڑتا تھا اس کے علاوہ ہفتہ وار ادبی پروگرام بھی مرتب کرنا ہوتا تھا ۔ یہ ضیا مارشل لاء کا زمانہ تھا ۔ جماعت اسلامی کے محمود اعظم فاروقی وزیر اطلاعات و نشریات تھے ۔ میں کسی پروگرام کے لئے ریڈیو گیا تو عارف صاحب کہنے لگے ۔

میرے پروگرام میں سے ایک صاحب کم ہیں، پروگرام ابھی ریکارڈ کرنا ہے تم آجاؤ۔ میں نے کہا پروگرام کیا ہے، بولے قائداعظم کے بارے میں ہے امین راحت چغتائی نے افتتاحیہ پڑھنا ہے، تم اور فتح محمد ملک گفتگو کروگے۔ میں نے کہا مناسب ہے کہ ہم یہ افتتاحیہ ریکارڈنگ سے پہلے پڑھ لیں تاکہ گفتگو کے لئے کچھ پہلے سے ذہن میں موجود ہو۔ پروگرام کے پروڈیوسر اقبال فریدی تھے۔ امین راحت چغتائی اور فتح محمد ملک وہیں بیٹھے تھے۔ میں نے امین راحت چغتائی سے مضمون لے کر پڑھنا شروع کیا۔ قائداعظم کا تو اس میں ذکر خیر تھا ہی لیکن ہر تیسرا جملہ ٹیپ کا مصرعہ تھا کہ ترقی پسند غدار ہیں۔ میں نے پوچھا یہ مضمون قائداعظم کے بارے میں ہے یا ترقی پسندوں کے بارے میں۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ امین راحت چغتائی غصے سے لال ہو گئے، بولے مجھے معلوم ہے ریڈیو پر ترقی پسندوں کا قبضہ ہے۔ تم سب لوگ اسلام کے دشمن ہو...... یہ ...... یہ ...... ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ میں تو ریکارڈنگ میں حصہ لیے بغیر واپس آ گیا۔ اگلے دن امین راحت چغتائی نے اعظم فاروقی کو درخواست دی کہ ریڈیو پر ترقی پسندوں کا غلبہ ہے، یہ اسلام دشمن اور ضیاء الحق کے مخالف ہیں اور پھر تفصیل سے منظور عارف، اقبال فریدی، فتح محمد ملک اور میرا ذکر کیا۔ میں اور فتح محمد ملک تو دوسرے محکموں سے متعلق تھے، البتہ منظور عارف اور اقبال فریدی سے یہ پروگرام واپس لے لیا گیا۔ منظور عارف ذہنی طور پر کئی دن پریشان رہے۔ امین راحت چغتائی ضیا دور میں زبردست اسلام پسند بن گئے تھے، ایک زمانے میں راولپنڈی کی ترقی پسند تنظیم کے سیکرٹری تھے۔ سنا ہے کہ اپنی سیکرٹری شپ کے دوران انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جو ادیب ترقی پسندی کی مخالفت کرتا ہے اُسے پھینٹی لگائی جائے۔

منظور عارف کو روزانہ پینے کی عادت تھی لیکن اچھی شراب پینے کی استطاعت نہیں تھی۔ وہ ڈنگی کھوئی سے دیسی کچی یا تربوز کی وہسکی لیتے جو اُس زمانے میں چار پانچ روپے میں مل جاتی تھی۔ مجھے اور مظہر الاسلام کو پکڑتے اور ہم لوگ باتیں کرتے ان کے گھر کی طرف چل

پڑتے ، جو عید گاہ کی ایک گلی میں تھا ۔ بیٹھک میں گلاس لے آتے اور ایک رکابی میں نمک ۔ میں نے ایسا فقیر شرابی دوسرا نہیں دیکھا ۔ مظہر الاسلام تو جلد جان چھڑا گیا ، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھسک جاتا میں مروت کا مارا قابو میں آ جاتا ۔ عارف صاحب ایک گلاس میرے لیے بنا دیتے اور باقی بوتل خود پی جاتے ۔ بھوکے پیٹ نمک کے ساتھ یہ گلاس میرا کلیجہ کاٹ کر رکھ دیتا ۔ اس دوران گفتگو جاری رہتی ۔ عارف صاحب کی ذاتی کامیابیاں اور ناکامیاں ، ترقی پسند تحریک کا عروج و زوال ، ترقی پسندوں کے رویے ، شعری بحثیں ، ڈراموں کے آئیڈیا زغرض دنیا بھر کی باتیں کرتے گیارہ بارہ بج جاتے ، میں اجازت لے کر گھر آتا تو ساری رات سینے میں جلن اٹھتی رہتی ۔ میں طے کرتا کہ اگلے دن عارف صاحب سے نہیں ملوں گا لیکن معلوم نہیں کیسے اگلے روز میں پھر ان کے قابو میں آ جاتا ۔ احمد جاوید ان کا بھانجا ہے جو بعد میں ان کا داماد بنا ۔

فتح محمد ملک سے ابتدائی ملاقاتیں حلقہ ہی میں ہوئیں ۔ ان کا تعلق تو ہماری سینئر نسل سے تھا لیکن اپنے مزاج کی انکساری کی وجہ سے وہ ہم لوگوں سے بھی تپاک اور گرم جوشی سے ملتے تھے ۔ وہ حلقہ کے سیکرٹری کے لئے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو ہم نے پروفیسر ارزش کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا ۔ ارزش اگرچہ عمر میں ہم سے بڑے تھے لیکن ان کا بیٹھنا ہمارے ساتھ تھے ۔ ہم ہر بار انہیں کھڑا کرتے ، وہ ہر بار کہتے ''یار مجھے ذلیل نہ کراؤ'' ہم کہتے ''ہم کون ہوتے ہیں کسی کو ذلیل کرانے والے یہ تو اللہ کا اختیار ہے'' پروفیسر ارزش جیسا سیدھا اور منکسر المزاج شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا ۔ وہ عرصہ سے میانوالی کالج میں فارسی کے استاد تھے ۔ تبادلے کی کوئی صورت نہیں تھی ۔ یہ نواب کالا باغ کا زمانہ تھا اور تبادلے سیکرٹری کی سطح سے نیچے ممکن ہی نہیں تھے ۔ نواب صاحب کی والدہ فوت ہو گئیں ۔ ارزش نے مرثیہ لکھا ۔ یہ مرثیہ اتنا اثر انگیز تھا کہ کسی محفل میں سن کر نواب صاحب جو بڑے سخت گیر تھے ، آبدیدہ ہو گئے ۔ انہوں نے اگلے دن ارزش کو گورنر ہاؤس میں بلایا ، پوچھا ۔ ''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے''

ارزش صاحب نے کہا۔ ''میانوالی سے میرا تبادلہ پنڈی کروادیجیے'' نواب صاحب ہنس پڑے بولے'' آپ واقعی پروفیسر ہیں'' اُن کا خیال تھا کہ ارزش صاحب شاید کوئی بڑا عہدہ مانگیں گے لیکن اپنے وقت کے طاقت ورترین گورنر سے انہوں نے ٹرانسفر کی سفارش کرائی۔

ارزش ملک صاحب کے مقابلے میں کھڑے تو ہو گئے ،ظاہر ہے ہارنا تھا سو ہار گئے۔ ملک صاحب جانتے تھے کہ ارزش کو ہم نے کھڑا کیا ہے لیکن پورا سال انہوں نے ہمیں اس کا احساس تک نہ کرایا بلکہ حلقہ کے پروگراموں میں ہماری رائے کو اہمیت دیتے رہے۔

فتح محمد ملک سے تعلقات کا ایک نیا دور اس وقت شروع ہوا جب ان کی بیٹی سعدیہ وقارالنساء سکول میں داخل ہوئی ، رخسانہ اس کی کلاس ٹیچر تھی ،سکول ہی میں اس کی ملاقات زکیہ بھابھی سے ہوئی۔اسی دوران ملک صاحب کا بڑا بیٹا طارق کالج کی سطح پر پہنچ گیا۔وہ اسے سرسید کالج میں داخل کرانا چاہتے تھے لیکن طارق میرٹ پر نہیں آتا تھا۔ملازم حسین ہمدانی پرنسپل تھے ان کا تعلق بھی تلہ گنگ سے تھا۔ میں نے سفارش کی تو مان گئے ،ہم نے صحافیوں کے کوٹہ میں طارق کو داخل کرلیا،اس کے بعد ملک صاحب کے دوسرے دونوں بیٹے طاہر اور عدیل بھی سرسید ہی میں پڑھے،یوں ملک صاحب کے گھرانے سے ہمارے فیملی تعلقات ہو گئے۔

ملک صاحب ہائیڈرل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے لیے منتخب ہوئے تو ہم نے ان کی دعوت کی۔ملک صاحب پہلی بار ہمارے یہاں آئے۔ہال میں سنگ مرمر کا گنبد نما چبوترہ دیکھ کر کہنے لگے...... ''یہ کیا ہے؟''

میں نے کہا...... ''یہ گوردوارا ہے''

بولے...... ''تو یہ گھر آپ کا نہیں''

میں نے کہا...... ''نہیں ،یہ تو اوقاف کی ملکیت ہے''

بولے...... ''تو کوئی اور گھر بھی نہیں''

میں نے کہا..... ''نہیں''

کہنے لگے..... ''آپ رائٹرز ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر ہیں''

میں نے کہا..... ''مجھے کون اس کا ممبر بناتا ہے۔ اس کے سیکرٹری تو پروفیسر کرم حیدری ہیں، جو ہم کو ویسے ہی کمیونسٹ سمجھتے ہیں''۔

ملک صاحب نے مجھ سے درخواست لکھوائی۔ درخواست لکھ کر میں نے ملک صاحب سے کہا..... ''ایک درویش اور بھی ہے''

بولے..... ''کون''

میں نے کہا..... ''اعجاز راہی''

کہنے لگے اس کی درخواست بھی لکھ دیں۔

دونوں درخواستیں ساتھ لے گئے۔ ہفتہ بھر بعد انہوں نے جرمنی چلے جانا تھا اور میل ملاقات کا ایک طویل سلسلہ، اس لیے مجھے یقین نہیں تھا کہ انہیں درخواستیں یاد رہیں گی۔ لیکن دوسرے دن ان کا فون آیا کہنے لگے۔ ''میں اس رات کرم حیدری کے گھر گیا تھا۔ وہ مان گئے ہیں آپ فوراً اپنے اپنے حصے کی کی رکنیت سازی کی فیس جمع کرائیں''۔

میں نے اور اعجاز راہی نے اگلے ہی دن فیس جمع کرادی۔ پلاٹوں کا سلسلہ آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ اراکین کی تعداد ۳۷ ہے اور پلاٹ ۳۵ ہیں۔ ہم چپ ہو گئے لیکن جب لسٹ فائنل ہونے لگی تو کرنل محمد خان اور ضمیر جعفری نے اپنے نام لسٹ سے کٹوا دیے کہ ان کے پاس پہلے ہی اسلام آباد میں پلاٹ تھے، یوں مجھے اور اعجاز راہی کو پلاٹ مل گئے اور ہمارے گھر بن گئے ورنہ شاید زندگی بھر حسرت ہی رہتی۔ ملک صاحب کے جرمنی جانے کے بعد زکیہ بھابھی نے تعلقات برقرار رکھے۔ وہ بھی باقاعدگی سے ہمارے یہاں آتیں اور ہم بھی مہینہ میں دو ایک بار ان کی طرف جاتے۔ اسی زمانے میں قاسمی صاحب میرے ایک مضمون کی وجہ سے مجھ سے سخت

ناراض تھے۔ زکیہ بھابھی کو معلوم ہوا تو بولیں ...... ''یہ تو اچھی بات نہیں خیر میں دیکھوں گی''۔

''ایک دن صبح صبح ان کا پیغام آیا کہ دوپہر کو کھانا ہمارے یہاں کھائیں، رخسانہ کو بھی ساتھ لیتے آئیں''۔ دوپہر کو پہنچے تو دیکھا قاسمی صاحب موجود ہیں۔ قاسمی صاحب کے ملک صاحب سے دیرینہ اور فیملی تعلقات ہیں۔ ملک صاحب کی غیر حاضری میں بھی، وہ جب بھی پنڈی آتے، ملک صاحب ہی کے گھر قیام کرتے۔ رخسانہ تو زکیہ بھابھی کے پاس اندر چلی گئیں اور میں قاسمی صاحب کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ دو تین گھنٹوں کی گفتگو میں خاصی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

زکیہ بھابھی مجھے بھائیوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ایک بار رخسانہ اور وہ ہمارے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ رخسانہ نے ملک صاحب کے بارے میں کہا کہ وہ بڑے سیدھے سادھے ہیں۔ زکیہ بھابھی ہنس پڑیں اور بولیں ...... ''ملک صاحب اتنے سیدھے بھی نہیں ہاں بھائی (میری طرف اشارہ کر کے) واقعی بہت سیدھے ہیں''۔

زکیہ بھابھی کو ہر وقت ملک صاحب کی فکر رہتی تھی کہ شوگر کے مریض ہیں۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ یہی تذکرہ کرتیں کہ جرمنی میں ملک صاحب کے کھانے پینے کا انتظام جانے کیسا ہے۔ بڑی زود حس تھیں ایک بار برسات میں نالہ چڑھ جانے سے گھر میں پانی آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں رکھی ہر شے خراب ہو گئی۔ بھابھی بڑی آزردہ ہوئیں۔ پھر یہ معمول ہو گیا کہ ہر برسات میں پانی اندر آ جاتا۔ اتنی چھوٹی سی بات کو بھی وہ بہت محسوس کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ انہیں دل کی بیماری ہے۔ وہ تو جرمنی چھٹیاں گزارنے گئی تھیں۔ ایک صبح اخبار میں ان کی وفات کی خبر پڑھی تو یوں لگا میری سگی بہن مر گئی ہے۔ فتح محمد ملک کی زندگی مسلسل جدوجہد کی ایک علامت ہے۔ زیرو سے شروع کر کے انتہا کو چھوا ہے۔ گورنمنٹ کالج اصغر مال کالج میں تدریس کے دوران بھی وہ روزنامہ تعمیر سے وابستہ تھے کہ اپنے

سفر کا آغاز انہوں نے یہیں سے کیا تھا۔صوبائی محکمہ اطلاعات میں سکرپٹ ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔انہی دنوں مساوات کے اجرا کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔حنیف رامے اس کے انچارج تھے۔ ملک صاحب کنیز فاطمہ کے ذریعے مساوات میں پہنچ گئے۔کالج سے چھٹی لی اور مساوات کو چلا دیا۔پھر وزیر اعلیٰ پنجاب کے پریس سیکرٹری بنے۔اس دوران بھی انہوں نے ادیبوں سے رابطہ قائم رکھا۔انہوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ حنیف رامے کی وزارت اعلیٰ میں ایک بار دانشوروں اور صحافیوں کو کاروں کے پرمٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ظاہر ہے اس فہرست میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پیپلز پارٹی کے حامی تھے یا جنہیں پارٹی ممنون کرنا چاہتی تھی۔ملک صاحب نے اس میں شورش کاشمیری کا بھی نام شامل کر دیا۔شورش پیپلز پارٹی کے بڑے ناقدین میں سے تھے۔اس نام پر کافی ناک بھوں چڑھائی گئی،لیکن ملک صاحب نے حنیف رامے کو منوا کر پرمٹ شورش کاشمیری کو بھجوا دیا۔شورش نے شکریے کے ساتھ پرمٹ واپس کر دیا کہ مجھے گاڑی کی ضرورت نہیں،ملک صاحب کہتے ہیں شورش کاشمیری واحد شخص تھے جس نے پرمٹ نہیں لیا ورنہ کیا پیپلز پارٹی کا حامی کیا مخالف،جس کو پرمٹ ملا اُس نے انکار نہیں کیا۔

جرمنی میں اُن کے قیام کے دوران میرا ان سے مسلسل رابطہ رہا۔واپس آئے تو ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اور بڑھا۔ہر جمعہ کو ہماری ملاقات طے تھی۔میں ایوب میرزا کے کلینک پہنچتا پھر ہم دونوں گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ملک صاحب کے گھر آجاتے جہاں تین چار گھنٹے محفل جمتی۔جس میں سیاست،ادب،ذاتی حوالے اور طرح طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوتی۔اکثر دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے۔جمعہ کی ملاقات کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک ملک صاحب دوبارہ جرمنی نہ چلے گئے۔

فتح محمد ملک میرے لئے ہمیشہ ایک مہربان دوست ثابت ہوئے ہیں۔بہت پریشانیوں کے زمانے میں،میں جب کبھی اُن کے پاس جاتا ہوں تو ان سے گفتگو کر کے متوازن ہو جاتا ہوں۔

زکیہ بھابھی سے مجھے اور رخسانہ کو ایسی انسیت تھی کہ ہم انہیں اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ اب بھی کبھی جب ہم چاندنی چوک سے گزرتے ہیں تو آنکھیں بے اختیار ان کے گھر کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور ہم دونوں دیر تک انکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ملک صاحب بڑے صابر ہیں وہ کبھی زکیہ بھابی کا ذکر نہیں کرتے لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ انکی نس نس میں موجود ہیں۔ ملک صاحب نے اپنا بُرا وقت منو بھائی کے ساتھ گزارا ہے۔ تعمیر میں ملازمت کے دوران بقول منو بھائی دونوں ایک بند اور ایک کپ چائے پر دن بسر کرتے تھے۔ میری منو بھائی سے زیادہ ملاقاتیں ایوب مرزا کے ساتھ ہوئی ہیں۔ ایوب مرزا کے ساتھ ہی میں دو چار بار اُن کے لاہور والے گھر بھی گیا ہوں۔ منو بھائی پنجابی شاعری میں اپنا خاص انداز رکھتے ہیں۔ ٹی وی ڈرامے نے انہیں شہرت تو دی لیکن شائد ان کی شاعری کو محدود کر دیا۔

○

کشور ناہید سے جب میں پہلی بار ملا تو وہ نیشنل سنٹر میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھیں۔ وہ اس زمانے میں کرشن نگر میں رہتی تھیں۔ میں ان سے دفتر میں ملا، شام کو مجھے گھر لے گئیں جہاں یوسف کامران سے ملاقات ہوئی۔ یوسف کامران بڑا پیارا شخص تھا۔ دوستوں کا دوست۔ ایک زمانے میں یوسف کامران پنڈی میں بھی رہے۔ اس زمانے میں وہ اکثر شالیمار میں آتے تھے۔ ان کا دفتر ہمک میں تھا۔ کشور ناہید ادب لطیف کی اعزازی مدیرہ بنیں تو انہوں نے ہم سب سے تخلیقات منگوائیں۔ انہی دنوں حسن عباس رضا نے بھی اپنا پرچہ نکالا تھا۔ میں ایوب میرزا، حسن عباس رضا اور احمد داؤد ایوب میرزا کی گاڑی میں لاہور گئے۔ کشور نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ اس زمانے میں وہ اقبال ٹاؤن میں اپنے نئے گھر منتقل ہو چکی تھیں۔ دیگر لوگوں میں انور سجاد، جاوید شاہین اور اکرام اللہ شامل تھے۔ ادب لطیف کا پہلا شمارہ اسی دن آیا تھا۔ یوسف کامران

بیمار تھے اور لیٹے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ کشور نے پرچہ حسن عباس رضا کو دیا جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کشور نے کہا.... ''کیوں حسن..... سڑ گئی نا'' حوالہ یہ تھا کہ حسن کا پرچہ خیابان بھی دو چار دن پہلے چھپا تھا۔ ایوب میرزا میرے کان میں بولے...... ''اب بتاؤ ایسی باتیں سن کر یوسف کامران کا یہ حشر نہ ہو تو کیا ہو''۔

نیشنل سنٹر سے کشور ماہ نو میں پہنچیں تو ماہ نو کی صورت ہی بدل گئی۔ ان کے دورِ ادارت میں ماہ نو ایسا رسالہ تھا جس میں چھپنے کو جی چاہتا تھا۔ کشور نے اس کے جو خاص نمبر نکالے ہیں وہ کمال کے ہیں، ایک بات البتہ میرے لیے ہمیشہ مشکوک رہی۔ وہ یہ کہ یہ ضیائی مارشل لاء کا بدترین عہد تھا۔ مارشل لاء کے خلاف پورے زور شور سے لکھا جا رہا تھا۔ جو کچھ لکھا گیا اس کا زیادہ حصہ ماہ نو میں چھپا جو وزارت اطلاعات کا پرچہ تھا۔

ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی حصہ میں جو لوگ باہر سے آ کر پنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہو گئے تھے ان میں شبنم مناروی بھی تھے۔ کامرس کالج میں لیکچرر ہو کر آئے۔ شروع شروع میں خاموشی سے آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ جاتے۔ پھر ایسے بولے کہ چپ ہونے ہی میں نہ آتے۔ اُس زمانے میں ہم پول ویل میں بیٹھتے تھے۔ ان کا گھر قریب ہی رتہ میں تھا لیکن ٹھیک نو بجے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے شبنم صاحب اپنی نشست سے کھڑے ہو جاتے۔ سائیکل اٹھاتے اور یہ جا وہ جا۔ شہرت تھا کہ اگر وہ سوا نو بجے کے بعد گھر پہنچتے تو بھابھی ان کی عینک اتار لیتی ہیں۔ عینک اتر جانے کے بعد شبنم مناروی کے ساتھ کچھ بھی کیا جا سکتا تھا۔ ہم انہیں چھیڑتے تھے۔ جوں ہی نو بجنے لگتے ہم کہتے شبنم صاحب جلدی کریں ورنہ کل نئی عینک بنوانا پڑے گی۔ شبنم صاحب لکھنے والوں کی انجمن کے بھی سیکرٹری رہے اور حلقہ ارباب ذوق کے بھی۔ بولنے پر آتے تو چپ کرانا مشکل اور ان کی بات سمجھنا اس سے بھی مشکل۔ لکھنے والوں کی انجمن کے زمانے میں ایک دو جلسوں میں حکومت وقت کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوئی۔ سی آئی ڈی والے پیچھے پڑ

گئے۔ بات اور بڑھی تو انہوں نے شبنم سے رابطہ کیا کہ وہی اُس زمانے میں سیکرٹری تھے۔ شبنم کو سی آئی اے آفس بلا کر لے گئے۔ انسپکٹر نے پوچھا...... ''یہ جدیدیت کیا ہے'' اس پر شبنم مناروی نے جدیدیت کی وضاحت میں ایک لمبی تقریر کی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا...... ''میں سمجھ گیا، آپ تشریف لے جائیں، جب ضرورت ہوگی میں خود آ جاؤں گا''

شبنم صاحب نے کہا...... ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی جدیدیت کے بارے میں میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ اور میں اپنی بات مکمل کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا''۔

کہتے ہیں انسپکٹر کمرے سے بھاگ گیا اور اپنے محرر کو کہہ گیا کہ جب یہ چپ ہو جائیں تو انہیں احترام سے کالج چھوڑ آنا۔ شبنم مناروی کا حلقہ والا زمانہ بھی یادگار ہے۔ اسی دور میں کئی نئی لکھنے والیاں حلقہ میں آئیں، بعض اوقات تو یوں لگتا کہ لکھنے کا کام صرف خواتین تک ہی محدود ہو گیا ہے شبنم صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر شام مختلف بک سٹالوں پر جاتے، اگر کوئی خاتون ادب کی کوئی کتاب یا رسالے دیکھ یا خرید رہی ہوتی تو شبنم صاحب پاس جا کر اپنا تعارف کرواتے اور اسے بتاتے کہ وہ حلقہ کے سیکرٹری ہیں، پھر جیب سے حلقہ کا دو ماہی پروگرام نکال کر اُسے پیش کرتے اور حلقہ میں آنے کی دعوت دیتے۔ شبنم ہماری محفلوں کی جان تھے اور دوستوں کے دوست، ہم ان سے جتنا بھی مذاق کرتے مجال ہے برا منائیں۔ ایک بار مظہر الاسلام نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اعلان کیا۔ شرکا کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ ہر شخص ہار لے کر آئے گا جو شبنم صاحب کو پہنائے جائیں گے۔ شبنم صاحب ہاروں میں ڈوب گئے۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ تقریب جاری تھی کہ ایک صاحب ہال میں کھڑے ہوئے اور بولے ''سیکرٹری صاحب شبنم کی ناک تو ننگی کر دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہار انہی پر ڈالنے پڑ جائیں''۔

شبنم صاحب جب تک پنڈی میں رہے شام کی محفلیں بھی آباد رہیں اور حلقے کی

رونقیں بھی قائم ۔ پھر انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ ریاض جانے کا ارادہ کرلیا۔ اب کئی برسوں سے وہیں مقیم ہیں۔

○

منیر احمد شیخ سے میری ملاقات بی این آر میں ہوئی جہاں ان کا کام حکومت وقت کے لیے ایسا مواد تلاش کرنا تھا جس سے اپوزیشن کو زچ کیا جا سکے اور ایوب مارشل لاء کو تقویت ملے۔ الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب کی مہربانیوں کی وجہ سے ادیب اور صحافی پہلی بار سرکاری شفقتوں اور لفافوں سے آشنا ہوئے تھے۔ ادیبوں کو ایسے محکموں میں ملازمتیں دی گئیں جن کا کام صرف اور صرف مارشل لائی (justification) کرنا تھا اور سیاست دانوں کو بُرا بھلا کہنا تھا۔ منیر احمد شیخ حلقہ کے بھی پرانے رکن تھے اس لیے باقاعدگی سے حلقہ کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''لمحے کی بات'' کی تقریب حلقہ میں ہوئی ۔ یہ حلقہ کی روایت سے ہٹ کر ایک محفل تھی تاہم آج کل کی تقاریب رونمائی کی طرح صرف تقریظات پیش نہیں کی گئیں بلکہ کتاب پر پڑھے گئے مضامین پر بھی گفتگو بھی ہوئی۔ ضیا دور میں منیر احمد شیخ پہلے جرمنی اور پھر بھارت میں پریس اتاشی بنے ۔ جرمنی میں انہوں نے بڑا کام کیا اور پہلی بار پاکستان کے ثقافتی امیج کو روشن کر کے بھارتی لابی کا جواب دیا۔ بھارت میں بھی وہ ایک کامیاب پریس اتاشی تھے، لیکن سنا ہے ایک واقعہ نے ان کو واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کسی بھارتی رقاصہ کی زلف کے اسیر ہو گئے اور ایسا اسیر ہوئے کہ سفارت خانہ چھوڑ کر اُس خاتون کے گھر میں رہنے لگے۔ اسی پر اخبارات پر خاصا مواد چھپا اور سفیر کو انہیں واپس بھجوانے کی درخواست کرنا پڑی۔

پاکستان آ کر وہ ذہنی طور پر سیٹ نہ ہو سکے ۔ اسی دوران ان کا بائی پاس ہوا۔ اس تجربے پر ان کا ایک بہت عمدہ افسانہ ان کے دوسرے مجموعے میں شامل ہے۔ پیپلز پارٹی کی

حکومت آئی تو انہیں امید تھی کہ انہیں کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ چند دن وہ بے نظیر کے پریس سیکرٹری رہے بھی لیکن انہیں پھر پی این آر میں بھیج دیا گیا جہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ملازمت میں اسے کھڈے لائن لگانا کہتے ہیں۔ اس سے وہ بڑے دل برداشتہ ہو گئے۔ ایک دورے پر کراچی گئے تو وہاں انجوگرافی کرالی۔ غیر متوقع طور پر، آپریشن کے دوران ہی فوت ہو گئے۔ ان کی بیگم حیران تھیں کہ اچانک انہوں نے انجوگرافی کیسے کرالی۔ مجھے کچھ اندازہ ہے۔ منیر احمد شیخ نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ بھارت میں قیام کے دوران ان کی ایک پنڈت جوتشی سے ملاقات ہوئی جسے ہاتھ دیکھنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے منیر احمد شیخ کا ہاتھ دیکھ کر ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ منیر احمد شیخ حیران رہ گئے۔ مستقبل کے بارے میں جوتشی نے بتایا کہ ان کا ایک بڑا اور خطرناک آپریشن ہوگا جس میں وہ بچ جائیں گے اور اس کے بعد ان کی لمبی عمر ہے۔ منیر احمد شیخ سمجھتے تھے کہ یہ خطرناک اور بڑا آپریشن بائی پاس تھا اور اب انہیں کوئی خطرہ نہیں چنانچہ جب وہ سرکاری دورے پر کراچی گئے اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ایک امریکن ٹیم آئی ہوئی ہے تو وہ بے دھڑک ہسپتال چلے گئے اور وہیں انجوگرافی کا فیصلہ کر لیا، انہوں نے بیگم کو فون کیا کہ وہ آج کی بجائے کل آئیں گے۔ انجوگرافی میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ دباؤ سے پرانے بائی پاس کا کوئی جوڑ کھل گیا۔ لمحوں میں منیر احمد شیخ ''لمحے کی بات'' ہو گئے۔ ان کی وفات کی خبر چھ بجے کی خبروں میں نشر ہوئی تو یقین نہیں آتا تھا۔ کراچی جانے سے دو دن پہلے ہی تو میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھے اور مستنصر حسین تارڑ کو چائنا کیفی میں لے گئے اور وہاں دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ شام کو میں چائے پی رہا تھا کہ ٹی وی پر ان کی خبر نشر ہوئی، پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی، اسی لمحہ فون کی گھنٹی بجی۔ منشا تھا، بولا...... ''معلوم ہو گیا''۔

میں نے کہا ''ہاں'' اس کے بعد نہ وہ کچھ بولا نہ میں، فون بند ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک فون دسمبر کی ایک شام منشا نے کیا، میں نے فون اٹھایا تو

بولا ''معلوم ہو گیا''۔

میں نے کہا ''کیا''

''پروین شاکر فوت ہو گئی''

میں حیرت سے پوچھا ''کیسے''

''ایکسیڈنٹ''

پروین شاکر سے میرے مراسم کوئی خاص نہیں تھے۔ بس لکھنے لکھانے کے حوالے سے محفلوں میں سلام دعا ہو جاتی تھی۔ وہ اسلام آباد ٹرانسفر ہو کر آئی تو اکثر کتابوں کی رونمائی میں اور دو چار بار رابطہ کی محفلوں میں علیک سلیک ہوئی۔

سنا ہے کہ پروین شاکر کی ایک کتاب کو انعام دینے کے لئے اکادمی کے ''تصور سال'' میں تبدیلی کی گئی۔ میں نے جب مزاحمتی ادب کا انتخاب کیا تو اُس کی ایک نظم اس میں شامل کی۔ بے نظیر حکومت آئی تو ٹی وی پر مزاحمتی ادب کے حوالے سے ایک پروگرام ہوا۔ اس میں جمیل جالبی، فتح محمد ملک، ضیا جالندھری، احمد فراز، کشور ناہید اور میں شامل تھے۔ پروین شاکر اور احمد فراز نے گفتگو کے بعد اپنی نظمیں سنائیں۔ پروگرام ختم ہوا تو میں نے یوں ہی کسی سے کہا عجیب بات ہے کہ پروین شاکر نے جو مزاحمتی نظم سنائی ہے وہ اُس مجموعہ میں شامل ہے جسے مارشل لا دور میں انعام ملا ہے، یا تو وہ بے وقوف تھے یا ہمارے شاعر بہت ہی بھولے ہیں۔ کشور ناہید یہ بات لے اڑیں۔ اس کے بعد دو ایک محفلوں میں پروین شاکر سے آمنا سامنا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ اُس کی نظروں میں غصہ سا ہے، خلاف معمول علیک سلیک بھی نہیں ہوئی۔ اسی دوران گوپی چند نارنگ اسلام آباد آئے، منیر احمد شیخ کے گھر رابطہ کی میٹنگ تھی۔ رابطہ کے مستقل اراکین کے علاوہ پروین شاکر بھی مدعو تھیں۔ محفل ختم ہوئی اور ہم جانے لگے تو پروین شاکر نے، اس طرح جیسے کسی اور کو سنا رہی ہو کہا ''بائی دی وے رشید صاحب وہ نظم میرے اُس مجموعے

میں شامل نہیں تھی''۔

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، بے ساختہ منہ سے نکلا...... ''کوئی بات نہیں سالک زندہ ہوتا تو آپ کو اس نظم پر بھی انعام دلوا دیتا'' جملہ تو منہ سے نکل گیا لیکن ایک دم سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر نہ مجھے معلوم ہوا کہ کیا ہوا ہے اور نہ ہی میرے خیال میں پروین شاکر کو۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اُس کے جنازے میں گیا تو خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا، مجھ میں تو اتنی جرأت کبھی نہیں تھی کہ کسی کے منہ پر کچھ کہہ دوں، معلوم نہیں اُس روز یہ کیسے ہو گیا جس کا مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے۔

پروین شاکر غالباً وہ واحد شاعرہ ہیں جس نے صدیق سالک کی موت پر ردِعمل کا اظہار کیا۔ مرثیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا۔

پھول گم سم ، اداس باغِ ادب
قلب کو اب نہیں دماغِ ادب
شعروافسانہ بجھ گئے ہیں جو
ناگہاں گل ہوا چراغِ ادب

مرثیہ کے دوشعر یہ ہیں......

سارا ہی بدن سلگ اٹھا ہے
سینے کو ملا ہے داغ کیسا
قاصر ہے سمجھنے سے حقیقت
ماؤف ہوا دماغ کیسا

(صدیق سالک کے لئے کچھ حرف)

○

گوپی چند نارنگ صرف ضیائی دور میں پاکستان آئے، جمہوریت کی بحالی کے بعد معلوم نہیں کیوں انہوں نے پاکستان یاترا کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کے بارے میں یہاں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں۔ پہلی بار آئے تو جوگندر پال اور اُن کی بیگم بھی پنڈی میں تھیں اور میرے یہاں مقیم تھیں۔ ہم اُس فنکشن میں نہ جا سکے جس میں نارنگ نے کلیدی خطبہ پڑھنا تھا، لیکن اُس فنکشن کی جو روداد لوگوں سے سنی، وہ بڑی دلچسپ تھی نارنگ کو دو چار ناموں کے علاوہ کسی سے واقفیت نہ تھی، انہوں نے اسلام آباد کے افسانہ نگاروں کی جو فہرست پڑھی وہ بہت ہی دلچسپ تھی، ایک نام دوسرے سے جوڑ دیا گیا تھا مثلاً مظہر، اسلام احمد، داؤد، جاوید، محمد منشا، یاد مرزا، حامد بیگ وغیرہ۔ ظاہر ہے کسی نے ان کو نام لکھ کر دیے تھے۔ نارنگ صاحب نے ان کے غلط ٹکڑے کر دیے آخر اسلوبیاتی نقاد جو ٹھہرے۔ فنکشن کے بعد افسانہ نگاروں کا گروپ انہیں ملا، اپنی کتابیں پیش کیں، نارنگ صاحب نے راتوں رات نام درست کیے، حوالے یاد کیے اور اگلی نشستوں میں یہ تاثر جما دیا کہ وہ فکشن کو باقاعدگی اور ترتیب سے پڑھتے ہیں۔ نارنگ بہت اچھے مقرر ہیں، بات کرنا اور محفل میں رنگ جمانا انہیں خوب آتا ہے۔ اس کے بعد وہ دو یا شاید تین بار اور اسلام آباد آئے، یہاں آئے تو ضیاء الحق سے بھی ضرور ملتے، لیکن جونہی ضیا دور ختم ہوا، نارنگ اسلام آباد نہیں آئے، شاید جو پیغام وہ لے کر آتے تھے اب اُسے وصول کرنے والا موجود نہیں تھا۔

اسی زمانے میں شمیم حنفی سے بھی ایک ملاقات ہوئی۔ صبح سویرے جالبی صاحب کا فون آیا کہ حنفی صاحب آئے ہوئے ہیں اور ناشتا پر موجود ہیں، اگر تم آسکو تو آجاؤ ناشتا یہیں کر لو۔ میں جلیل عالی اور نوازش علی بھاگم بھاگ جالبی صاحب کے یہاں پہنچے۔ شمیم حنفی سے غائبانہ تعارف تو عرصہ سے تھا، منرا جب شعور نکالتے تھے تو فکشن کے حوالے شمیم حنفی کی بہت اچھی

تحریریں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ان کی بردباری، علمی گہرائی، بصیرت ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔دیکھا تو شخصیت میں بھی ایک جاذبیت، انسیت اور اپنی طرف کھینچ لینے والی مقناطیسیت ہے۔ناشتا کی میز پر دو گھنٹے گزر گئے۔ان کی تحریروں کے حوالے سے، جامعہ کی خدمات کے حوالے سے، دہلی اور بھارت کے ادبی ماحول کے حوالے سے ہمارے سوالوں کے جوابات انہوں نے اتنی تفصیل اور جامعیت سے دیے کہ اپنی علمیت کا لوہا منوالیا۔جالبی صاحب تو ساڑھے نو بجے مقتدرہ چلے گئے۔شمیم حنفی ہمارے ساتھ ہو لیے۔فیصل مسجد دیکھی، اسلام آباد کی دو ایک جگہیں اور پھر دوپہر کو انہیں واپس جالبی صاحب کے ہاں چھوڑا کہ اسی دوپہر انہیں واپس جانا تھا۔چند گھنٹے کی اس ملاقات میں ان کی شخصیت کا ایسا سحر قائم ہوا کہ میں ابھی تک اُس کے حصار میں ہوں۔وہ نارنگ کی طرح پی آر کے بندے نہیں، حقیقی کام کرنے والے ہیں۔اسی لیے ان کا کام وقتی سیاست سے بالاتر اور زندہ رہنے والا ہے خصوصاً اردو فکشن پر ان کی تحریریں جدید افسانے کو سمجھنے میں ہمیشہ معاون ہوں گی۔

شمیم حنفی کی طرح شمس الرحمن فاروقی سے بھی ایک ہی ملاقات ہوئی، وہ سارک کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد آئے تھے۔دو دن تو کانفرنس میں مشغول رہے، آخری دن تھا، جمیل الدین عالی نے فون کیا کہ فاروقی صاحب آئے ہوئے ہیں، شام کو کھانے پر آجائیں۔میں دوڑا دوڑا پہنچا تو منشا یاد اور احمد جاوید بھی موجود تھے۔فاروقی صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ تو عرصہ سے تھا اور شب خون کے حوالے سے ان سے ایک قلبی تعلق بھی تھا۔ دیر تک باتیں ہوئیں۔خصوصاً جدید افسانے کے حوالے سے۔میں نے اور احمد جاوید نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے جدید افسانے کو صرف ایک نسل تک دیکھا ہے، اس کے بعد والے لوگ بھی آپ کی توجہ چاہتے ہیں۔فاروقی ہنس پڑے، بولے ...... "آپ اپنا نقاد خود پیدا کریں، میں کیوں لکھوں"، شمس الرحمن فاروقی ایک سنجیدہ نقاد ہیں انہوں نے کلا

دونوں ادوار پر عمدہ مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ جدیدیت کے فروغ میں ان کا اور شب خون کا ایک اہم کردار ہے جسے ادبی تاریخ کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جمیل الدین عالی کی مہربانی سے میری ان سے ملاقات ہوگئی یہ محبتوں کی شام اپنی خوشبوؤں کے ساتھ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ جمیل الدین عالی کبھی کبھار اس طرح کا کرم کر دیا کرتے ہیں۔ شوکت صدیقی اسلام آباد آئے تو انہوں نے اسلام آباد کلب میں کچھ دوستوں کو اکٹھا کر لیا۔ عالی صاحب سے میری پہلی ملاقات اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی۔ کوئی فنکشن تھا۔ واپسی پر میرے پاس سواری نہیں تھی۔ منشا کہنے لگا۔ ''کیسے جاؤ گے''۔

میں نے کہا ''مجھے کسی سٹاپ پر چھوڑ دو''

اتنے میں اس کی نظر عالی صاحب پر پڑی وہ اپنی کار میں بیٹھ رہے تھے۔ منشا کہنے لگا ''میرا خیال ہے انہوں نے سٹلائیٹ ٹاؤن جانا ہے، تم چاندنی چوک پر اتر جانا''

میں نے کہا۔ ''میرا تو ان سے تعارف نہیں''

منشا نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روکی اور اُن سے کہنے لگا ''یہ رشید امجد ہیں آپ انہیں راستے میں ڈراپ کر دیجئے گا'' عالی صاحب نے کسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بڑے سرد لہجے میں کہا ''بیٹھ جائیں''۔

عالی صاحب اُن دنوں نیشنل بنک کے صدر تھے اور جب اسلام آباد آتے بنک کی گاڑی ڈرائیور سمیت ان کے لیے حاضر ہو جاتی۔ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ کچھ دیر بڑی ناگوار خاموشی رہی۔ مجھے اپنے طور پر افسوس ہوا کہ میں کیوں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چلا ہی جاتا کسی طرح۔

ابھی ہم فیض آباد سے اُدھر ہی تھے کہ عالی صاحب بڑی گھمبیر آواز میں بولے ''رشید امجد صاحب آپ سے مجھے ایک شکایت ہے''۔

میں نے چونک کر پوچھا...... ''فرمایئے''۔

بولے...... ''آپ نے پاکستانی ادب کا جو انتخاب چھاپا ہے اس میں میری صرف ایک ہی غزل شامل ہے جب کہ فراز اور فیض کی دو دو غزلیں ہیں''۔

ایک لمحے مجھے ان کی بات سمجھ نہ آئی، پھر فوراً ہی احساس ہوا وہ کیا کہہ رہے ہیں، میں نے کہا...... ''عالی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس انتخاب کو سرسری سا ہی دیکھا ہے'' بولے...... ''کیا مطلب؟'' میں نے کہا ''اس انتخاب پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ آپ کی چیزیں شامل ہیں''۔

چونکے، بولے...... ''وہ کیسے''۔

میں نے کہا...... ''اس میں آپ کی نعت، قومی نغمہ، غزل، نظم اور نثری حصہ میں سفرنامہ شامل ہے''۔

عالی صاحب نے ایک لمبا سانس لیا، ان کا موڈ یک دم بدل گیا۔ اتنے میں چاندنی چوک آ گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا...... ''ذرا روکنا، مجھے اترنا ہے''۔

عالی صاحب فوراً بولے...... ''نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے، ڈرائیور پہلے مجھے اتارے گا۔ یہاں قریب ہی ہے، پھر آپ کو گھر چھوڑ کے آئے گا''۔

اس کے بعد میں عالی صاحب کی شفقت کے سائے میں آ گیا۔ وہ اگر اسلام آباد میں ہوں اور کوئی ادبی اکٹھ کریں تو مجھے ضرور یاد رکھتے ہیں۔

○

الطاف قریشی پنڈی آنے سے پہلے مساوات کے چیف رپورٹر تھے۔ بھٹو دور میں وہ فیملی پلاننگ میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشن ہو کر اسلام آباد آ گئے اور ایک شام ڈھونڈتے شالیمار آ نکلے۔ پھر ہم لوگوں سے ایسے گھلے ملے کہ روزانہ کی نشستوں کے ساتھ پنڈی کی ادبی سیاست

میں گردن گردن ڈوب گئے۔ ان کا ایک گہرا تعلق سیاست سے بھی تھا، بابا شیخ رشید اُس زمانے میں وزیرِ صحت تھے اور ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے حوالے سے ہم لوگ بھی کچھ سیاسی لیڈروں کے قریب ہو گئے۔ ان میں طاہر محمد خان بھی تھے جو وزیرِ اطلاعات تھے۔ الطاف قریشی حلقہ کے سیکرٹری بھی رہے ایک زمانے میں نظمیں کہتے تھے اور افتخار جالب کی نئی تشکیلات کے مرید تھے۔ پنڈی میں قیام کے دوران دو چار افسانے لکھے، ایک دو ترجمے کیے اور بس۔ ان کا زیادہ اظہار گفتگو میں ہوتا تھا۔ ان کے سیکرٹری شپ کے زمانے میں حلقہ میں سیاسی گفتگو بہت ہونے لگی تھی یہ غالباً ۷۷ء کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ انتخابات کے بعد پی این اے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بھٹو کے خلاف دائیں بازو کے ادیبوں کے بیانات آنے لگے تھے۔ الطاف احمد قریشی کی تجویز پر راولپنڈی کے ترقی پسند اور لبرل لکھنے والوں نے بھی ایک قرارداد منظور کی، جس کا مسودہ قریشی نے تیار کیا تھا۔ یہ قرارداد چھپتے ہی شالیمار کی فضا میں تلخی آ گئی۔ میزیں الگ الگ ہو گئیں دائیں بائیں بازو کا فرق واضح نظر آنے لگا۔

۷۷ء کے الیکشن سے پہلے بھی ہمارا ایک اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ پی این اے کے موثر پروپیگنڈہ کے جواب میں پیپلز پارٹی کی حمایت کی جانی چاہئے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اور میرے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ میں اُس وقت کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبدالخالق سے ملوں۔ ان کا دفتر سرسید کالج کے برابر میں تھا۔ ترقی پسند ادیب شدت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ پیپلز پارٹی کا شعبہ اطلاعات بہت کمزور ہے۔ پی این اے کے پوسٹروں کے جواب میں ان کا جواب غیر استدلالی ہے۔ اُس زمانے میں پیپلز سکرٹیریٹ میں جانا اتنا آسان نہ تھا، سب کی نظروں میں آنے والی بات تھی۔ کالج کے لڑکے باہر کھڑے ہوتے تھے اور درس گاہوں میں بھی دائیں اور بائیں کی چپقلش عروج پر تھی۔ خیر میں چلا گیا، اندر پیغام بھجوایا۔ اس سے پہلے الطاف قریشی نے بات کی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر خالق نے مجھے بلایا سرسری

سی معذرت کی کہ ایک اہم اجلاس ہورہا تھا، پھر میرے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور کہا ضرورت پڑی تو ہم ضرور آپ لوگوں کی مدد لیں گے فی الحال تو ایسی ضرورت نہیں۔ میرا موڈ بہت خراب ہوا، شام کو شالیمار میں نشست لگی تو میں نے کہا...... ''ہماری طرف سے پیپلز پارٹی جہنم میں جائے'' لیکن پھر بھی ہماری تشویش کم نہ ہوئی، طے ہوا کہ جو امیدوار اطلاعاتی محاذ پر کمزور ہے اس کی مدد کی جائے۔ قیوم بٹ کی مہم سب سے کمزور تھی۔ ان کا دفتر مریڑ چوک میں تھا۔ میں، داؤد، مظہر اور الطاف قریشی وہاں گئے، ایک نیم تاریک کمرے میں بے سرو سامانی کے عالم میں قیوم بٹ پریشان بیٹھے تھے، معلوم ہوا کہ پارٹی انہیں فنڈز ہی نہیں دے رہی، ان کے پاس اشتہار چھپوانے کے بھی پیسے نہیں۔ پارٹی کے شعبہ اطلاعات کا یہ حال تھا کہ ان کا پوسٹر دیواروں پر لگ رہا ہوتا تھا کہ ساتھ ہی پی این اے کا جوابی پوسٹر چسپاں کیا جا رہا ہوتا۔ اس کا راز دو دن بعد کھلا۔ پیپلز پارٹی کا اطلاعاتی شعبہ ہنیبو ہوٹل میں جو کشمیر روڈ پر ہے، قائم تھا۔ اس دفتر کے انچارج شیخ حامد تھے، لاہور کے ایک شاعر بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک رات میں اور الطاف قریشی ادھر جا نکلے۔ یہ شاعر صاحب نشے میں دھت تھے۔ میں نے یونہی پوچھ لیا یار یہ کیا بات ہے آپ لوگوں کا پوسٹر ابھی دیواروں پر لگ رہا ہوتا ہے تو اُدھر سے جواب آ جاتا ہے۔ شاعر صاحب نشے میں ہنسے، خوب ہنسے پھر سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولے ''یاروں کا کام ہے'' میں نے ذرا کریدا تو بولے ''بھٹو خود کو سمجھتا کیا ہے۔ ہر ایک کی بے عزتی کر دیتا ہے، اسے دوست دشمن کی تمیز نہیں، ہم مال بھی اس کا کھاتے ہیں اور کام دوسروں کا کرتے ہیں''۔ معلوم ہوا کہ پارٹی کا ہر پوسٹر چھپنے سے پہلے ہی پی این اے کے پاس پہنچ جاتا ہے اور ان کا پوسٹر لگ ہی رہا ہوتا ہے کہ اُدھر سے جواب آ جاتا ہے۔ پی این اے کی تحریک اتنی منظم تھی کہ جیل میں ایک ایک ورکر کو پیسے پہنچائے جاتے تھے۔ ایک شام ہم شالیمار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو صاحب کھانا کھانے اندر آئے۔ ان میں سے ایک الطاف قریشی کا شناسا تھا، لاہور سے آیا تھا۔ میں اور الطاف قریشی ان کی میز پر

چلے گئے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ پی این اے کے جیل میں مقید ورکروں میں پیسے بانٹنے آئے ہیں ۔ دو بریف کیس نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ جیل کے حکام تک ان کے ساتھ تھے ۔ پیپلز پارٹی کی نچلی اور اوپری سطح پر ہمیشہ ایک تضاد رہا ہے ۔ نچلی سطح پر بے لوث کارکن بھٹو کے عاشق تھے اور اوپر جاگیرداروں کا ایک ایسا حلقہ تھا جس کے حیلے وہی پرویزی تھے ۔ صرف کارکنوں کا نام استعمال ہوتا تھا ۔ خود بھٹو کی شخصیت میں عجب تضاد تھا ، ان کی شخصیت میں محبوب اور رقیب دونوں پہلو تھے ۔ میں خود ان کا گرویدہ تھا اور میرا خیال تھا کہ قائداعظم کے بعد اینٹی ہیرو کی جو صورت پیدا ہوئی تھی اس کو بھٹو نے پورا کیا ۔ پنڈی میں پہلی بار آئے تو ایک بڑا جلوس نکلا ۔ میں گوالمنڈی میں ایک تھڑے پر کھڑا تھا ۔ سامنے جنگ کا دفتر تھا جہاں جنگ کے ہڑتالی ملازمین نے کیمپ لگایا ہوا تھا ۔ اور گوالمنڈی کی دیواروں پر شورش ملک کے خلاف نعرے لکھے ہوئے تھے کہ انہوں نے ساتھیوں سے غداری کر کے چھت کے اوپر سے اندر جا کر اخبار نکال دیا تھا ۔ بھٹو کا جلوس جنگ کے دفتر کے سامنے پہنچا تو انہوں نے مختصر سی تقریر کی ۔ '' جنگ سے ہماری جنگ ہے '' لیکن پھر یہی جنگ ان کا محبوب ہو گیا ۔ یہاں سے جلوس راجا بازار کی طرف روانہ ہوا ۔ لوگوں کا ایک سیلاب تھا ۔ لیاقت روڈ کی چھتیں عورتوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ تقریباً رات کے آٹھ بج چکے تھے لیکن یوں لگ رہا تھا ۔ جیسے دن کا سماں ہے ۔ میں بھی جلوس کے ساتھ ساتھ دھکے کھاتا فوارا چوک تک آیا ۔ میری اسفنج کی چپل کا ایک پیر اتر گیا اور مجھے ننگے پاؤں ہی گھر آنا پڑا ۔ بھٹو ایک ہیرو کی طرح اقتدار کے ایوان میں داخل ہوا لیکن جاگیردارانہ مزاج کی وجہ سے انہیں دوست دشمن کی تمیز نہ تھی ۔ وہ خوشامدیوں کو اپنا دوست اور صحیح بات کرنے والوں کو دشمن سمجھنے لگے ۔ کوثر نیازی جیسے شخص نمایاں اور جے رحیم جیسے غیر نمایاں ہو گئے ۔ جے رحیم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کی روداد فتح محمد ملک نے بتائی ۔ وہ وزیر اعلیٰ پنجاب کے پریس سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں موجود تھے ۔ ہوا یوں کہ بھٹو نے کیبنٹ میٹنگ بلائی ہوئی تھی ۔ وزیر آگئے لیکن

وہ خود دوسرے کمرے میں کسی اور مسئلے میں الجھے ہوئے تھے۔ دیر ہوتی گئی۔ جے رحیم جو سیکرٹری جنرل تھے نہ رہ سکے اور بولے ...... ''یہ ہماری بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں اور صاحب بہادر باہر ہی نہیں نکل رہے، مولانا بار بار اندر جا کر جانے بھٹو کو جانے کیا کچھ کہتے رہے۔ ڈیڑھ دو بج گئے۔ جے رحیم احتجاجاً اٹھ کر چلے گئے۔ بھٹو صاحب باہر آئے تو انہیں بتایا گیا کہ جے رحیم چلے گئے ہیں۔ ان کا موڈ پہلے خراب تھا، بولے، ''یہ شخص بہت سر چڑھ گیا ہے اسے ٹھیک کرنا پڑے گا'' شاہ سے بھی زیادہ شاہ کے حمائتیوں میں سے ایس ایف ایس کے سربراہ نے جو وہیں موجود تھے کہا۔ ''فکر ہی نہ کریں'' اور اسی رات وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آیا جسے میں بھٹو کے زوال کی ابتدا کہتا ہوں۔ ایس ایف ایس کے نوجوانوں نے آدھی رات کو جے رحیم کے گھر دستک دی اور پھر اندر جا کر انہیں مارا پیٹا۔

کوثر نیازی کا کردار ہمیشہ مشکوک حوالے ہی سے زیر بحث رہا۔ سنا ہے کسی میٹنگ میں کسی نے بھٹو سے کہا کہ ہماری ساری کارروائی فوج کے پاس پہنچ جاتی ہے، بھٹو مولانا کی طرف دیکھ کر ہنسے اور بولے'' ہمارے ان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں''۔ مولانا وزیر حج واوقاف تھے۔ اسی زمانے میں ایک ادبی انجمن تھی جس میں کئی لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ ایک بار ان کا وفد مولانا سے ملنے گیا۔ مولانا لڑکوں کو دیکھ کر کہنے لگے تم لوگ کیوں ساتھ آئے ہو، اپنے پی اے کو بلا کر کہا ان کو حج آفیسر کا لیٹر دے دو اور پھر ان سے مخاطب ہو کر کہا آئندہ تم لوگ ساتھ نہ آنا۔

الطاف قریشی کی وجہ سے ہمارا ان سیاسی حضرات سے خاصا رابطہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بھٹو کی کچن کیبنٹ کا بڑا تذکرہ تھا۔ ایک شام الطاف کسی کام سے شیخ رشید سے ملنے گئے۔ اسی شام صحت کے بارے میں کوئی پالیسی جاری ہوئی تھی شیخ رشید وزیر صحت تھے۔ الطاف قریشی مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ گفتگو کے دوران اُنہوں نے شیخ صاحب سے پوچھا'' میری تو صبح ہی آپ سے بات ہوئی ہے آپ نے اس پالیسی کا تذکرہ ہی نہیں کیا''۔

شیخ صاحب بولے۔ ''میں نے خود ریڈیو سے سنا ہے''۔

میں نے کہا۔ ''آپ تو وزیر صحت ہیں اور آپ کو بھی نہیں معلوم تھا''۔

بولے ''یہ باتیں صرف کچن کیبنٹ میں منظور ہوتی ہیں''۔

اسی کچن کیبنٹ نے بھٹو کو مروادیا۔ پی این اے کی تحریک کے دوران بھی انہوں نے اسی کچن کیبنٹ کے مشورے قبول کیے ورنہ سمجھوتے کی کئی صورتیں موجود تھیں۔

عام لوگ بھٹو کی شخصیت سے عشق کرتے تھے اس حوالے سے پیپلز پارٹی بھی ان کی محبوبہ تھی۔ بھٹو کو اس کا احساس تھا اور کسی حد تک وہ عوام کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے لیکن بے نظیر نے عوام کے عشق کو ان کی مجبوری سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ عوام کوڑے کھا کھا کر خودسوزی کر کے انہیں اقتدار میں لاتے ہیں اور بس، پھر ان کا کام ختم ہو جاتا ہے حقیقت بھی یہی ہے کہ سڑکوں پر مار مار کھا کھا کر جب لیڈر وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو عوام کو بھول جاتا ہے تاکہ وہ اپنے زخموں پر مرہم لگائیں اور دوبارہ کوڑے کھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

مارشل لاء لگتے ہی قریشی کی ملازمت ختم ہوگئی اور وہ واپس لاہور چلے گئے اور ہم ایک مستقل شب نوردسے محروم ہوگئے۔

○

ادیب سہیل سے میرا تعلق تو سابقہ مشرقی پاکستان ہی کے زمانے سے تھا۔ وہ سید پور میں تھے اور خط وکتابت کے ذریعے ان سے تازہ ادبی مسائل خصوصاً جدید ادب کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ان کے علاوہ صبا اکرام محمود واجد، شہزاد منظر وہ دوست تھے جن سے اوراق اور شب خون کے توسط سے ایک مستقل رابطہ تھا۔ جدیدیت اور ترقی پسندیت کے حوالے سے بھی ان سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ادیب سہیل المیہ مشرقی پاکستان کے بعد دوبارہ مہاجر بن کر کراچی میں آئے اور ملازمت کے سلسلہ میں، کہ وہ اس زمانے میں ریلوے میں تھے، پنڈی

آ گئے۔ اس زمانے میں ان سے روز ملاقات ہوتی۔ وہ بھی باقاعدگی سے شالیمار آتے۔ میری ان سے کئی دلچسپیاں مشترک تھیں۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی کا ایک عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور فن موسیقی کے رموز کو سمجھتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی پر ان کے کئی مضامین چھپ چکے ہیں۔ پھر ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ لیکن کراچی جا کر بھی انہوں نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

ترقی پسند دوستوں میں سے خاور رضوی بھی روز آنے والوں میں سے تھے۔ اچھے شاعر اور پر خلوص دوست۔ جہلم ٹرانسفر ہوئے تو ملاقاتیں اتوار تک محدود ہو گئیں۔ دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اُن کی وفات سے ہم ایک اچھے دوست سے محروم ہو گئے۔ اُن کی کمی کو ان کے بیٹے شبیہ الحسن رضوی نے پورا کر دیا۔ شبیہ بھی اچھے شاعر اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔

اسی زمانے کا ایک دوست نذیر عامر ہے۔ فیصل آباد سے پنڈی آیا تو شالیمار پہنچا اور پھر شام کی نشستوں کا حصہ بن گیا۔ کھانے پینے کا بادشاہ تھا۔ ادب و شعر کے علاوہ اس سے ایک تعلق یہ بھی تھا کہ ہم ہر اتوار صبح اکٹھے ناشتا کرتے۔ ناشتا کی اس نشست میں عموماً اس کے علاوہ میں، مظہر اور داؤد ہوتے۔ نذیر عامر لال کرتی سکول میں پڑھاتا تھا اور وہیں ایک کمرے میں ٹھکانہ تھا، سو وہ ہم میں سے سب سے زیادہ شب نورد تھا۔ ٹی وی میں جانے کے بعد اس کے سلسلے بدل گئے اور آہستہ آہستہ ہماری محفلوں میں اس کا آنا جانا کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔

فیصل آباد کے حوالے سے ریاض مجید کا نام یاد آ گیا۔ اس سے ملاقات سرور کامران کے حوالے سے ہوئی تھی۔ لیکن مہینے میں دو تین بار وہ پنڈی آتا اور تین چار دن رہتا۔ اس دوران ہم میں سے کسی کا بھی گھر میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ دو تین دن ہم کسی ہوٹل میں گزارتے۔ ہوتا یہ کہ ریاض مجید پنڈی وارد ہو کر ٹیکسی پکڑتا اور باری باری ہمیں اکٹھا کرتا، پھر فوارا چوک کے کسی ہوٹل میں کمرا بک کراتا، اسی چکر میں رات ہو جاتی، اُسی ٹیکسی میں ہم ائر پورٹ پہنچتے اُس زمانے میں سکیورٹی برائے نام تھی۔ لوگ جہاز تک جا سکتے تھے۔ پنڈی ائر پورٹ پر ایک ٹیرس تھا جس

کے ساتھ کینٹین ٹیریا، یہاں سے پورا ائیر پورٹ نظر آتا تھا۔ ہم لوگ اس ٹیرس پر چلے جاتے یا کبھی کبھار کینٹین ٹیریا میں بیٹھ جاتے اور رات گئے تک جہازوں کو جاتے اور اترتے دیکھتے رہتے۔ ائیر پورٹ اور جہاز کی روانگی سے ریاض مجید کا کوئی گہرا تعلق تھا۔ کوئی ایسی کہانی، کوئی ایسا لمحہ جس سے اس پر ایک عجب وارفتگی طاری ہو جاتی۔ شعر سناتا، سنتا، ہم بڑی مشکلوں سے اسے وہاں سے اٹھاتے، کمرے میں آتے اور باقی کی ساری رات شعر سنتے سناتے اور ادبی بحثیں کرتے گزر جاتی۔ صبح وہیں ناشتا ہوتا۔ دوسرے دن چھٹی کرنا پڑتی یا اس وعدے پر کہ دفتر یا کالج سے سیدھے وہیں آنا ہے۔ یہ صورت دو دو تین تین دن رہتی۔ ہم تو خیر سے ابھی شادی شدہ نہ تھے۔ سرور کامران کو بڑی مصیبت پڑتی۔ بھابھی ریاض مجید کے نام سے چڑتی تھیں۔ یہ معمول برسوں رہا پھر ریاض مجید کو معلوم نہیں کیا ہوا۔ داڑھی رکھ لی اور اس کے رویے میں ایک عجیب طرح کی درشتگی آ گئی۔

○

اپنے عہد کے جن سینئر ادیبوں سے مختلف اوقات میں کسی نہ کسی حوالے سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں فیض، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، راشد، جوش اور مظفر علی سید ہیں۔ فیض سے جو دو چار ملاقاتیں ہوئیں وہ ایوب میرزا کے گھر ہوئیں، فیض صاحب جس طرح کی ہلکی پھلکی شاعری کرتے تھے اسی طرح کی ان کی گفتگو بھی تھی۔ فیض صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کے یہاں کوئی بڑا سوال اور کوئی بڑا فلسفیانہ مسئلہ نہیں لیکن روایت سے جرأت اور روایت کی چاشنی کو سلیقے کے ساتھ برتنے کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ راشد سے صرف ایک ملاقات ہوئی۔ سعادت سعید ان کے ساتھ پنڈی آیا تھا۔ پنڈی کلب میں قیام تھا۔ ہمیں معلوم ہوا تو دوڑے دوڑے پہنچے۔ راشد کی گفتگو میں ایک متکبرانہ لہجہ تھا۔ ہمارے ذہنوں پر اُس وقت افتخار جالب سوار تھا، ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا...... ''افتخار جالب کی شاعری کے

بارے میں آپ کی کیا رائے ہے''۔

بولے...... ''کون افتخار جالب؟''

ہم نے حیرت سے کہا...... '' آپ انہیں نہیں جانتے''

بولے...... ''نہیں''

چند ہی دنوں بعد ان کا مجموعہ ''لا = انسان'' شائع ہوا تو اُس کے دیباچے میں انہوں نے افتخار جالب کا شکریہ ادا کیا ہوا تھا۔ راشد سے جدید نظم کے حوالے سے کافی دیر گفتگو ہوئی۔ بعد میں ہماری فرمائش پر انہوں نے کئی نظمیں سنائیں۔

قاسمی صاحب سے میرا گہرا تعلق کبھی قریبی نہیں رہا۔ میں فنون میں ایک عرصہ تک باقاعدگی سے چھپتا رہا لیکن ان کے گروپ میں رچ بس نہیں سکا اس کی وجہ وزیر آغا سے میری قربت تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں ان کے قریبی دوستوں میں شامل ہوں۔ قاسمی صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئی۔ دوبار فتح محمد ملک صاحب کے گھر دیر تک ادبی منظر نامہ اور ادبی سیاست پر بات ہوئی لیکن قاسمی صاحب نے اپنی گفتگو سے کبھی متاثر نہیں کیا۔ ان کے منہ سے لطیفے ہی اچھے لگتے ہیں علمی بات کم ہی سنی۔ اس کے برعکس وزیر آغا سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے لطف آجاتا ہے۔ ہر بار جب ملتے تو میں پوچھتا...... '' آغا صاحب اس دوران آپ نے کیا پڑھا ہے''۔

آغا صاحب شروع ہو جاتے اور احساس ہی نہ ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جتنا صاحب مطالعہ ادیب ہمارے عہد میں کوئی دوسرا نہیں۔ اوراق گروپ کے حوالے سے انور سدید بھی قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ جب بھی پنڈی آتے فون کر کے ملتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں ادبی سیاست کا ذکر ہوتا۔ ان جیسا زود نویس بہت کم دیکھا۔ عموماً زود نویس معیار سے گر جاتے ہیں لیکن انور سدید زود نویسی کے باوجود معیار برقرار رکھتے ہیں۔

اسی زمانے میں مظفر علی سید سے بھی بہت ملاقاتیں ہوئیں۔ اول اول جب اُن سے ملا

تو وہ پشاور کے قریب بڈھ بیر میں ائیر فورس میں تھے۔ کبھی کبھار پنڈی آتے تو اطلاع مل جاتی۔ اس زمانے میں شالیمار ختم ہو چکا تھا۔ اور ہم لوگ داتا میں بیٹھتے تھے۔ سید صاحب وہاں آجاتے۔ گفتگو کے بادشاہ تھے۔ جوش کی طرح مصرع اٹھانے پر ہی اگلا مصرع پڑھتے یعنی اگلا جملہ ادا کرتے۔ ان کی عادت تھی کہ جملہ کہہ کر چپ ہو جاتے خود اس کی لذت سے لطف اندوز ہوتے۔ مسکراتی نظروں سے دوسروں کی طرف دیکھتے، سگریٹ کا کش لگاتے اور جب مخاطب جملے کی تعریف کر دیتا تو اگلا جملہ ادا کرتے۔ سید صاحب نے جو کچھ لکھا وہ رسالوں میں بکھرا رہ گیا۔ ''تنقید کی آزادی'' میں تو اس کا عشر عشیر بھی جمع نہیں ہو سکا۔ ان کی پہلی کتاب ترجمہ اور تشریح تھی، سید صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی تحریر سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ لکھتے اور جب تک وہ مضمون چھپتا، نئی چیزیں مطالعے میں آجاتیں۔ وہ ان کو بھی شامل کرنا چاہتے یوں مضمون زیر قلم ہی رہتا۔ جس زمانے میں، میں نے دستاویز کے دو شمارے نکالے، سید صاحب سے بھی مضمون لیا، کہنے لگے پروف خود پڑھوں گا۔ میں نے کہا یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ پروف پڑھتے ہوئے اتنا اضافہ کیا کہ مضمون نئے سرے سے لکھوانا پڑا۔ دوسری بار پروف بھیجے تو پھر نئے اضافے کر دیے۔ اسلام آباد اور پنڈی کے حلقہ میں راشد اور مجید امجد پر مضامین پڑھتے، چھپتے چھپتے ان کی شکلیں بھی بدل گئیں۔

ریٹائر منٹ کے بعد سید صاحب اسلام آباد آگئے۔ وہ ہمارے رابطے کے رکن بھی تھے۔ اس لیے مہینے میں ایک بار تو اُن سے ملاقات لازمی تھی۔ لیکن درمیان میں بھی ملتے رہتے۔ اکثر شہر آجاتے ہم لوگ اس زمانے میں صدر سے نکل کر شہر کے ایک ہوٹل شمع میں آگئے تھے۔ سید صاحب اسلام آباد سے گاڑی دوڑاتے آتے اور رات گئے تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے۔

ان کی گفتگو سن کر لطف آجاتا۔ وزیر آغا کے بعد جس شخص نے اپنی گفتگو سے اسیر بنایا وہ مظفر علی سید ہیں۔ اسلام آباد میں قیام کے دوران وہ ضیاء الحق کے تقریر نویس تھے۔ لیکن صرف

انگریزی تقریریں لکھتے تھے جو عموماً پالیسی امور سے متعلق ہوتی تھیں۔ کنٹریکٹ ختم ہوا تو لاہور چلے گئے اور وہیں مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ میں جب بھی لاہور جاتا سید صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ ایک عرصہ تک تو وہ باقاعدگی سے ٹی ہاؤس آئے۔ بیمار ہوئے تو اس دورے میں فرق پڑ گیا۔ پہلے ہفتہ میں دوبار پھر اتوار تک محدود ہوگئے۔ ان کی بیماری کے آخری دنوں لاہور گیا تو گھر پہنچا۔ بہت کمزور ہوگئے تھے لیکن مجال ہے گفتگو میں کوئی فرق پڑا ہو۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور اسی دوران جو مطالعہ کیا تھا اس کے لطف میں شریک کرتے رہے۔

جوش صاحب سے دو ایک سرسری ملاقاتیں ہوئیں، وہ جملہ بازی کے بادشاہ تھے۔ لیکن علمی گفتگو کم ہی کرتے تھے۔ جب تک ان کا مصرع نہ اٹھایا جائے وہ اگلا مصرع نہیں پڑھتے تھے۔ گفتگو میں بھی یہی طور طریقہ تھا۔ لطیفے بازی اور جملے بازی میں کمال رکھتے تھے۔ شاید سنجیدہ گفتگو بھی کرتے ہوں گے لیکن میری جو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں ان میں اس طرح کا موقع نہیں آیا۔

وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے دوران جو چپقلش ہوئی، اس میں ان دونوں بزرگوں کا تو جو رویہ تھا سو تھا لیکن اس لڑائی سے فائدہ اٹھا کر کئی چھوٹے لوگوں نے وہ گند اچھالا کہ لکھنوی دور کی لڑائیاں بھول گئیں۔ شاہ سے بھی زیادہ شاہ کی وفاداری ظاہر کرنے والوں نے گمنام نظموں، پمفلٹوں، جملے بازیوں سے فضا کو ایسا مکدر کیا کہ اب اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی حجاب دامن گیر ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں پرانے کاغذات دیکھتے ہوئے اسی طرح کا ایک پرچہ ہاتھ لگ گیا۔ صرف ایک شعر درج کرتا ہوں جس سے اس لڑائی کے ''مزاج'' اور ''ذوق'' کا اندازہ ہو جائے گا۔

یاد اس کو طبلے کی لے پر سارے گاما پادا ہے
وہ ماڑا اس شہر کی مسجد کا اک پیراں زادہ ہے

اس طرح بلکہ اس سے بھی بدتر حملہ دوسری طرف بھی کیا جاتا رہا۔ میرے خیال میں

اس لڑائی کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ کیونکہ یہ کوئی نظریاتی لڑائی نہ تھی یہ سارا کھیل ان لوگوں کا تھا جو فنون اور اوراق میں جگہ بنانا چاہتے تھے ۔ کئی سنجیدہ لوگوں نے کوشش بھی کی کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے اور یہ دونوں بزرگ اس پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن ان کے دوستوں کو یہ صلح پسند نہ آئی ۔ صرف ایک واقعہ درج کرتا ہوں ۔

بڈھ بیر میں ایک مشاعرے میں آغا صاحب اور قاسمی صاحب دونوں اکٹھے ہو گئے ۔ کچھ دوستوں نے کوشش کر کے دونوں میں صلح کرا دی ۔ شاعر بھی محفل میں موجود تھے ۔ رشید قیصرانی نے دونوں کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب دونوں طرف سے کوئی بھی شخصی یا اختلافی کالم یا مضمون نہیں لکھے گا ۔ دوسرے یہ کہ احمد ندیم قاسمی اوراق کے لیے اور وزیر آغا فنون کے لیے اپنی تخلیقات بھیجیں گے ۔ اس پر احمد فراز فوراً بول اٹھے اوراق کے لیے تو قاسمی صاحب اپنی نظم بھیج دیں گے ۔ لیکن فنون کے لیے وزیر آغا کی تخلیق لے کر فنون کا معیار نہیں گرایا جا سکتا ۔ چنانچہ ساری فضا ایک لمحے میں خراب ہو گئی ۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وزیر آغا سے زیادہ قاسمی صاحب اس جھگڑے کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ پہل ہمیشہ انہی کے دوستوں کی طرف سے ہوتی تھی ۔ اس محفل میں بھی انہوں نے فراز کو ٹوکا نہیں نہ اس بات کی تردید کی ۔ بعد میں کئیوں نے کہا بھی کہ انہیں بات رکھنے کے لیے ہی سہی فراز کی بات سے لاتعلقی کا اظہار کرنا چاہیے تھا ۔

ادبی سیاست میں ہمارے ایک ساتھی ایسے تھے جو کبھی ہماری محفلوں میں نہیں آئے لیکن وہ پوری طرح اس میں ملوث تھے ۔ یہ ماجد الباقری تھے ۔ جن کا تکیہ کلام تھا '' کاٹ دیتے ہیں '' ماجد الباقری سے تعارف ان کے دفتر میں ہی ہوا ۔ وہ صوبائی محکمہ اطلاعات میں سکرپٹ رائٹر تھے ۔ اور بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئے ۔ ماجد الباقری نے پہلی بار مجھے شب خون پڑھنے کو دیا اور میں غائبانہ طور پر شمس الرحمٰن فاروقی سے متعارف ہوا ۔ بھارتی رسائل سے میرا تعارف انہی کے ذریعے ہوا ان کے پاس اکثر رسائل آتے تھے ۔ پڑھنے کے لیے وہ مجھے

دے دیتے میں نے جب کالج جوائن کیا تو ۶۸ء کی تحریک شروع ہو چکی تھی ایک کھلی فضا تھی۔ کالج کھلے تو یحییٰ کا مارشل لاء لگ گیا تھا اور سنسر نافذ ہو چکا تھا۔ پرنسپل نے مجھے کالج میگزین کا انچارج بنا دیا۔ مجھے کالج میگزین کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے اس کا جو اداریہ لکھا وہ تقریباً سیاسی تھا۔ اس پر طرہ کہ حمید ساغر سے سرورق بنوایا، جس میں ایک سایہ لہولہان زمین پر پڑا تھا۔ اتفاق سے رنگ ایسے چھپے کہ پیپلز پارٹی کے تین رنگ ہو گئے یعنی سرخ، سبز اور سیاہ، کسی نے سٹیشن کمانڈر کو درخوست دے دی کہ اس کالج میگزین میں حکومت کے خلاف مواد موجود ہے۔ میں صبح کالج پہنچا تو پرنسپل ورانڈے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا ''کا کام روا دیا''۔

میں نے پوچھا...... ''کیا ہوا''

بولے...... ''سٹیشن کمانڈر کا حکم ہے کہ پرچہ تقسیم نہ کیا جائے پہلے سنسر کرایا جائے''۔

سچی بات ہے میں گھبرا گیا۔ شام کو منظور عارف ملے تو میں نے اُن سے ذکر کیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے ڈانٹا اور بولے...... ''ایڈونچرازم کرنے کا کیا فائدہ، سوائے اس کے کہ بیکاروں میں ایک اور بیکار کا اضافہ ہو جائے گا'' پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ ماجد الباقری سے ملو...... میں اسی وقت ان کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ابھی دفتر ہی میں ہیں۔ سنسر شپ کمیٹی کے انچارج ان کے ڈپٹی ڈائریکٹر سید عاقل تھے۔ ماجد الباقری نے اُن سے بات کی انہوں نے کہا، رسالہ کہاں ہے۔ میں ایک کاپی ساتھ لے گیا تھا۔ انہوں نے بغیر دیکھے اور پڑھے اس پر Cleared کی مہر لگائی اور دستخط کر کے کہنے لگے...... ''آئندہ اس طرح کا اڈونچر نہ کرنا''۔

جب تک ماجد الباقری پنڈی میں رہے ان سے روز ملاقات یوں ہوتی کہ سرسید کالج اور ان کا دفتر ساتھ ساتھ تھے۔ میں خالی پیریڈ میں ان کے پاس آجاتا اور چائے پیتے گپ شپ لگا کر، تازہ خبریں سنتا اور واپس آجاتا۔ پنڈی سے ان کی ٹرانسفر اٹک ہوئی تو دو تین بار کسی نہ کسی ادبی نشست کے حوالے سے وہاں جانا ہوا جس کا اہتمام ماجد الباقری نے کیا تھا۔ اٹک سے وہ

گوجرانوالہ چلے گئے تو رابطہ کمزور ہوتا گیا تاہم جب بھی بھارت سے کوئی نیا رسالہ یا کتاب آتی تو وہ مجھے آگاہ کرتے۔ بھارت کے اکثر ادیبوں سے میرا تعارف انہی کے ذریعے ہوا۔

حمید ساغر ادیب تو نہ تھے لیکن ان کی تصویروں کو ہم شاعری ہی کہتے تھے اور شعر ہی کی طرح ان کے معنی تلاش کرتے تھے۔ اپنے حالات کی وجہ سے وہ مین لائن میں نہ آ سکے۔ ہماری کتابوں کے سرورق بناتے، انہیں چھپوانے کا اہتمام کرتے۔ وہ باقاعدگی سے ہماری نشستوں میں آتے اور شب گردی میں ہمارے ساتھ ہوتے۔ ان کے سرورق کتاب کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ ایسے مصور ہیں جو کتاب پڑھے بغیر سرورق نہیں بناتا۔

○

امی نے مجھے ہمیشہ اپنی محبت کی بکل میں دبا کر رکھا، اتنا دبایا کہ کبھی کبھی میرا دم گھٹنے لگتا، علیا چاچا ایک سائبان کی طرح میری حفاظت کرتے تھے اور والد کی شفقت میں ایک عجب طرح کی مٹھاس تھی۔ میں اپنے والدین کی شادی کے کئی برس بعد پیدا ہوا، اکلوتا ہونے کے سبب میری حیثیت ایک ایسے قیمتی کھلونے کی سی تھی جسے ہر کوئی احتیاط سے اٹھاتا ہے اور سنبھال کر رکھتا ہے۔ میرے بعد تین بہنیں ہوئیں۔ اس لحاظ سے بھی میں گھر میں سب سے زیادہ اہم تھا اور سب کی توجہ کا مرکز، تین بہنوں کا اکلوتا بھائی جس کی ذرا سی تکلیف پر سب بے چین ہو جاتے تھے۔ اچھے دنوں کے بعد ہم پر بہت بُرے دن بھی آئے، اتنے برے کہ ان کا تصور کرتے خوف آتا ہے۔ لیکن امی نے ہمیں احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے زیور بیچ بیچ کر، قیمتی کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کر رہی تھیں۔ لیکن میرے کھانے پینے میں کسر نہ چھوڑتیں۔ محبتوں کی اس گرم جوشی میں پروان چڑھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ہمیشہ محبت کا بھوکا اور متلاشی رہا۔ کسی نے مسکرا کے بھی دیکھا تو بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل پڑا۔ سکول میں مسکرانے والی استانیاں اچھی لگتی تھیں۔ میں انہیں خط لکھ دیتا تھا۔ محلے میں ایک لڑکی پانی بھرنے آتی تھی۔ اس کی خوبی اس کا مسکراتا

چہرہ تھا۔ میں نے اس کے نام محبت نامے لکھنا شروع کر دیے۔ ایک زمانے میں کتاب خریدنا معمول کا ایک حصہ تھا۔ ہر مہینے تنخواہ میں سے تھوڑی سی رقم اس کے لیے مخصوص ہوتی تھی میرے پاس اچھی خاصی کتابیں تھیں۔ محلے کی ایک خاتون اردو میں ایم اے کر رہی تھیں۔ انہیں کسی نے بتایا کہ میرے پاس ان کے مطلب کی کچھ کتابیں ہیں۔ وہ آئیں، کتابیں دیکھ کر ایسی ریجھیں کہ روز کتابیں لینے آنے لگیں۔ ان کی شخصیت میں بھی ایک جاذبیت تھی۔ عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں۔ مجھے خط لکھنے اور اپنی عمر سے بڑی خواتین سے متاثر ہونے کا چسکا ہے۔ میں نے انہیں بھی ایک دن خط تھما دیا۔ انہوں نے جواب نہ دیا۔ میں خط لکھتا اور اس کتاب میں رکھ دیتا جو انہوں نے لے جانی ہوتی تھی۔ سال گزر گیا انہوں نے نہ تو میرے کسی خط کا جواب دیا اور نہ آنا چھوڑا۔ آتیں، مسکرا کر دیکھتیں، میں اس مسکراہٹ سے اپنے مطلب کے معنی نکال لیتا، خط کتاب میں رکھ دیتا۔ یہ سلسلہ سال بھر چلتا رہا، پھر ان کا امتحان آ گیا۔ امتحان سے فارغ ہو کر اس نے ساری کتابیں واپس کیں ان میں وہ سارے خط بھی تھے جو میں نے لکھے تھے۔

گورڈن کالج میں ہماری کلاس میں لڑکیاں زیادہ اور لڑکے کم تھے ہم مذاق سے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ منسوب کرتے رہتے تھے انہی میں ایک لڑکی تھی جسے میں کچی مونگ پھلی کہتا تھا۔ یوں کہ دیہاتی اکھڑ پن اور کڑواہٹ اس کی بات بات اور انگ انگ میں موجود تھی۔ کلاس میں اس طرح کی ہلکی پھلکی محبتیں چل رہی تھیں۔ ہمارے ایک دوست وحید تھے ان کا معاملہ ذرا سیریس تھا۔ دونوں طرف سے عہد و پیمان ہوئے تھے لیکن درمیان میں ایک عجب افتاد آن پڑی۔ ہماری ایک کلاس فیلو قمر جیون تھی۔ اس کی ایک اپاہج بہن بھی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ باپ اور سوتیلی ماں انہیں بہت تنگ کرتے تھے۔ تنگ آ کر دونوں بہنیں واہ چلی گئیں۔ ہماری کلاس کا ماحول بالکل گھر کی طرح تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور ایک دوسرے کے حالات سے واقف۔ میں اور وحید انہیں دیکھنے واہ گئے۔ معلوم ہوا کہ ساتھ

والے گھر میں سبط علی صبا رہتے ہیں۔ صبا سے میری واقفیت ۱۹۶۰ء سے تھی۔ جب وہ چکلالہ میں فوج میں تھا۔ پھر وہ فوج چھوڑ کر فیکٹری میں چلا گیا۔ قمر جیون کے حوالے سے اب اس سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔ حسن ناصر بھی قریب ہی رہتا تھا۔ قمر جیون اور اس کی اپاہج بہن اکیلی رہتی تھیں اور بڑی پریشان تھیں۔ میرے افسانے "کاغذ کی فصیل" کے دونوں کردار وہی ہیں۔ وحید اور میں صرف انسانی ہمدردی سے ہر اتوار کو جاتے اور بساط بھر سامان ان کو دے آتے۔ ایک دن ہم گئے تو قمر رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ اکیلے ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ انہیں تنگ کر رہے ہیں۔ میں نے صبا سے کہا۔ وہ پہلے ہی ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے معاشرے میں دو لڑکیوں کا اکیلے رہنا کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ صبا کی توجہ کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ اُس روز قمر بے چاری کچھ اس طرح روئی کہ وحید کا انسان جاگ اٹھا، اُس نے یک دم فیصلہ کیا کہ وہ اُس سے شادی کرے گا۔ راستے میں میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ یہ جذباتی فیصلہ ہے لیکن وہ نہ مانا شادی ہوگئی۔ ظاہر ہے وحید کے گھر والوں نے قمر کو کبھی قبول نہیں کیا۔ جذبہ اترا تو کئی اختلافات بھی سامنے آئے لیکن وحید کی شرافت کہ اُس نے اپنا عہد نبھایا۔

اس شادی نے کلاس میں ایک عجب طرح کی بدمزگی پیدا کر دی۔ جو لڑکی وحید سے محبت کرتی تھی۔ بڑی افسردہ اور دل گرفتہ ہوئی۔ کلاس کی فضا میں ایک عجب طرح کا روکھا پن پیدا ہو گیا۔ میری پکی مونگ پھلی بھی جسے اس بار میں نے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ دور دور رہنے لگی وحید کا دوست ہونے کی وجہ سے میرے بارے میں ساری لڑکیوں کا رویہ خراب تھا اور وہ سمجھتی تھیں کہ اس شادی میں میرا بھی کوئی کردار ہے۔ چند دنوں بعد ہی امتحان شروع ہو گئے اور یوں یہ ادھوری سی محبت گئے دنوں کی بات بن گئی۔

حلقہ میں ایک خاتون باقاعدگی سے آتی تھی۔ بنیادی طور پر تو وہ موسیقی سے منسلک تھی۔ شعر بھی کہتی مگر اتنا ہی کہ مصرع وزن میں ہوتا۔ ستار بہت اچھا بجاتی تھی۔ مجھے اس کی

شخصیت سے نہیں ستار سے بڑا لگاؤ تھا۔ شروع شروع میں مَیں اور شبنم مناروی اس کے گھر جاتے اور دیر تک ستار سنتے رہتے۔ پھر میں اکیلا جانا شروع ہوگیا۔ وہ ستار بجاتی اور میں گم ہو جاتا۔ اُس کے ماں باپ بوڑھے تھے۔ بہن بھائی ملک سے باہر جا چکے تھے اور اکیلی ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ایک عجیب طرح کی نفسیاتی مریض تھی۔ پل میں ادھر دوسرے پل میں اُدھر، مجھے ایسے لوگوں سے تعلقات میں مزا آتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات بڑھتے گئے۔ اور میں اکثر اسے لے کر سلور گرل چلا جاتا۔ وہاں گھنٹوں چائے پیتے موسیقی اور شعر پر گفتگو ہوتی رہتی۔ وہ سگریٹ بہت پیتی تھی۔ میں تو نہیں پیتا تھا لیکن اُس کے لیے مہنگے سگریٹ خریدتا، اسے پیش کرتا بلکہ سلگا کر دیتا۔ اُس زمانے میں غیر ملکی سگریٹ عام نہیں تھے۔ میں کسی کو کہہ سن کر پشاور باڑے سے اچھے سگریٹ منگواتا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میرا اس کا تعلق کس نوعیت کا تھا۔ بس ایک تیز ہوا تھی کہ ہمیں اُڑائے لے جا رہی تھی۔

پھر یہ سلسلہ اچانک ختم ہوگیا، کیسے شاید اب میں اس کی کوئی وجہ نہ بتا سکوں۔ تیزی سے لپکنا اور پھر اسی تیزی سے پیچھے ہٹنا میرا مزاج ہے۔

ایک لمحے میں زندگی گزارنا بھی اپنی ایک لذت رکھتا ہے۔ کسی سفر کے دوران کوئی چہرہ اپنی طرف متوجہ کر لے تو میں تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ ایک لمبا سفر طے کر لیتا ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے میں ایک کٹی پتنگ کی طرح ہوں جو کسی کی جھولی میں گرنے کے لئے بے تاب ہے۔ کبھی کبھی لوٹنے والے مل جاتے ہیں اور کبھی حسرت رہ جاتی ہے کہ کوئی لوٹ لے۔ کسی دوسرے شہر جاؤں تو محسوس ہوتا ہے وہاں کی مٹی نے میرے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ جی چاہتا ہے ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاؤں۔ چند دن گزرتے ہیں تو واپسی کا لپکا شروع ہو جاتا ہے۔ میرے مزاج میں جلدی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے تو ساری عمر جم کر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کر سکا۔

شالیمار میں بیٹھتے تھے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میری وجہ سے دوسرے دوست بھی

بیٹھے رہتے تھے۔ ہماری اس عادت سے بیرے بڑے تنگ تھے۔ وہ ایک ایک بتی بجھاتے مگر ہم اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ آخر ایک دن شالیمار کے مالک چودھری مختار نے مجھ سے کہا کہ آج سے ہم آپ کو تالا کھول کر دے جایا کریں گے۔ آپ جاتے ہوئے تالا لگا دیا کریں۔ اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ ساڑھے گیارہ بارہ بجے بیرے سارے دروازے بند کر کے باقی بتیاں بجھا کر تالا مجھے دے جاتے۔ میں جاتے ہوئے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیتا۔ چودھری مختار بھی مزے کے آدمی تھے۔ ادیب نواز بلکہ ادیبوں کے نخرے برداشت کرنے اور ان کے نخرے اٹھانے والے۔

چھوٹی موٹی محبتوں کے سلسلے چلتے رہے لیکن کوئی ایسا بڑا واقعہ نہ ہوا جو میری زندگی کے دھارے کو تبدیل کر دیتا۔ رخسانہ سے میری شادی طے شدہ تھی۔ امی نے بتایا کہ وہ اس سے میری شادی کر رہی ہیں اور وہ فلاں جگہ کام کرتی ہے تو میں غلام سرور کے ساتھ اُسے دیکھنے گیا۔ ہم اُس کے پاس گئے اور کسی فرضی شخص کے بارے میں پوچھا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی......
''میں تو انہیں نہیں جانتی''۔

میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔ ظاہر ہے اسے شبہ ہو گیا کیونکہ بات چیت تو چل رہی تھی۔ میں اور سرور ہنستے ہوئے گیٹ تک پہنچے تھے کہ میں نے یونہی مڑ کر دیکھا وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ہمیں ہنستے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہم کسی کو تلاش کرنے نہیں بلکہ کسی اور غرض سے آئے تھے۔

منگنی ہو گئی لیکن جانے کیوں میں نہ اُس سے ملا نہ فون کیا۔ شادی کے بعد ہمیں ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھنے میں کافی دیر لگی۔ ہمارے گھریلو حالات بھی بڑے ناخوشگوار تھے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ دیر تک ان میں تعلقات کی خوشگواریت پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن ہم دونوں میں قربت بڑھتی ہی گئی۔ ہماری محبت میں عشق کا سر پھرا پن ہے۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں لیکن ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ رخسانہ کی محبت اور توجہ

میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ ایک حوالے سے ہم دونوں آئیڈیل میاں بیوی ہیں اور اتنے بے تکلف کہ دل کی ہر بات، ہر راز ایک دوسرے سے کہہ دیتے ہیں۔ نہ کبھی میں نے اُس سے کچھ چھپایا اور نہ کبھی اُس نے مجھ سے، ایسی ایسی باتیں، جذبے جو آدمی اپنے آپ سے بھی کہتے ڈرتا ہے۔ میں اس سے کہہ دیتا ہوں اور یہی سچائی ہمارے خلوص کی علامت بھی ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن ایک نا معلوم سا یہ ہے، ایک بے نام بے چہرہ کوئی وجود یا شاید ہیولہ جس کی ہمیشہ مجھے تلاش رہی ہے ایک خواب ہے۔ جس کی کوئی تعبیر نہیں ایک چہرہ ہے جس کا کوئی روپ نہیں کہیں اس کا ایک ٹکڑا ہے کہیں دوسرا، کہیں آنکھ، کہیں دانت، کہیں زلفیں، کہیں مسکراہٹ، یہ سب ایک جگہ نہیں، شاید ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ میرا ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس کے ساتھ رہنے، بسر کرنے میں لطف آتا ہے اور جو میرے اپنے وجود کا ایک حصہ ہے۔

○

جدیدیت کو فروغ دینے اور اسے متنازع بنانے میں ہمارے ادبی رسائل کا بڑا کردار ہے۔ چند ایک رسالوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ادبی پرچے ایسے تھے۔ جن کو اس نام ہی سے چڑ تھی۔ نقوش کو ادب کی بیوروکریسی سمجھا جاتا تھا۔ جو ادیب اس پرچے میں چھپ جاتا۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں بھی عار سمجھتا تھا۔ احمد شریف ہمارے ایسے ہی سینئر دوستوں میں سے تھے۔ ان کے افسانے اس دور میں نقوش میں چھپتے تھے۔ یہی حال وقار بن الٰہی کا تھا۔ چنانچہ یہ حضرات ہما شما کو لفٹ کرانا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ وقار تو خیر اُس زمانے میں اٹک میں تھے۔ اسلام آباد آئے تو عرصہ تک ان سے مراسم نہ ہو سکے رابطہ کے بعد ان کے مزاج کے رنگ اور انگ کھلے تو ان سے ایک ایسی قربت قائم ہوگئی جس کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ احمد شریف حلقہ میں آتے تھے، شام کو دو گیز اور پھر شالیمار میں بھی آنکلتے تھے۔ ان کی زیادہ دوستی آغا بابر سے تھی اور اس کی ایک وجہ دونوں کی ڈرامے میں دلچسپی تھی۔ نقوش اس زمانے میں باقاعدگی سے نکلتا تھا لیکن اس

کے لکھنے والوں کا دائرہ مخصوص اور محدود تھا۔طفیل صاحب جلدی جلدی کسی نئے لکھنے کو قبول نہیں کرتے تھے۔فنون نکلا تو اس کی روش بھی وہی تھی۔اس کے لکھنے والوں کا بھی اپنا ایک حلقہ تھا جس میں نئے لکھنے والوں کی گنجائش کم تھی۔قاسمی نے کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا لیکن سب وہ تھے جن کا تعلق روایت کے ساتھ تھا۔جدیدیت کے لیے، یہاں بھی کوئی ہمدردانہ گوشہ نہیں تھا۔سات رنگ اور کچھ اور پرچے نکلے مگر دو دو تین شماروں سے، زیادہ نہ چل سکے۔سیپ نے نئے اور پرانے لکھنے والوں کا اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔نسیم درانی خود اس زمانے کی نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے پرچے میں سینئر لکھنے والوں کو بھی جمع کر لیا، یوں سیپ نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم بن گیا جہاں دونوں دھارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔میں خود اُس زمانے میں ملی جلی چیزیں لکھ رہا تھا۔میرے کچھ افسانے علامتی تھے کچھ نیم علامتی اور کچھ روایتی۔سیپ کی اشاعت بہر حال نئے لکھنے والوں کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔سکہ بند مدیروں کے برعکس نسیم درانی کا رویہ نئے لوگوں کے ساتھ بڑا حوصلہ مندانہ تھا۔

جدیدیت کو فروغ دینے اور اسے ایک رویے کے طور پر شناخت کرانے میں جن دو پرچوں نے اہم کردار ادا کیا۔وہ شب خون اور اوراق ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون کے ذریعے تمام نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ پر جمع کیا۔نئی تحریروں کی اشاعت سے نئے ادب کا قاری پیدا کیا۔ہمارے اردو قاری کی تربیت کلاسیکی حوالے سے ہوئی تھی اور یہ نسلوں کی تربیت تھی اس لیے جب اول اول نئی تحریریں سامنے آئیں تو ابلاغ کے مسائل پیدا ہوئے، کچھ شک نہیں کہ ان میں سے بہت سے مسائل عجز بیان کے بھی تھے لیکن نامانوسیت بھی ایک مسئلہ تھی۔ شب خون نے تواتر سے نیا ادب شائع کر کے قاری کو نئے مزاج سے آشنا کیا۔

اوراق کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔اس کی اشاعت سے پاکستان میں سکہ بند بڑے پرچوں کی مناپلی ٹوٹ گئی۔میرا پہلا افسانہ اوراق کے تیسرے شمارے میں چھپا اور

اس کے بعد شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہوا جس میں میری کہانی یا کوئی اور چیز شامل نہ رہی ہو۔اوراق کے اشاریے کے مطابق میں اس پرچے میں سب سے زیادہ چھپا ہوں ۔اوراق نے نہ صرف جدیدیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اسے ایک متوازن صورت بھی عطا کی اوراق کے فکر انگیز اداریوں نے جدیدیت کے وہ راہنما اصول وضع کیے جس نے کئی انتہا پسندوں کو اعتدال کی راہ دکھائی ۔میرے ادبی سفر اور پہچان میں اوراق کا بڑا ہاتھ ہے۔میرے خیال میں شب خون اور اوراق دو ایسے رسالے ہیں جن کے ذریعے میں نے اپنا بہترین اظہار کیا ہے،اس کے بعد سیپ ہے۔

اُس زمانے میں اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں کا رواج نہ تھا۔سوائے امروز کے کوئی اخبار ادبی صفحہ نہیں نکالتا تھا۔امروز کا ادبی صفحہ بھی ادبی سیاست سے خالی ہوتا تھا۔اس میں افسانے ،شاعری اور مضامین چھپتے تھے یا ایک آدھ ادبی ڈائری۔ یہ وہ دور تھا جب تخلیق آگے اور ادیب پیچھے ہوتا تھا یعنی ادیب کی شخصیت پس پردہ تھی۔ادبی صفحوں نے تخلیق کو پیچھے کرکے ادیب کو نمایاں کیا اور اسے شوبز کی طرح تماشا بنا دیا۔اسی دوڑ میں ادبی سیاست کے وہ رخ سامنے آئے جس پر سوائے شرمندگی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔امروز کے بعد حریت کراچی اور ایک آدھ اور اخبار نے ادبی صفحہ شروع کیا۔حریت کے ادبی صفحے کے لیے میں عرصہ تک پنڈی کی ادبی ڈائری لکھتا رہا ہوں۔ادبی صفحوں میں ادبی سیاست اور گروہ بندی کا آغاز ادبی صفحات سے ہوا۔ادبی صفحوں کے مرتبین دفعتاً زمین سے آسمان پر پہنچ گئے۔ادبی صفحوں نے نہ صرف شہرت کی ایسی چکا چوند پیدا کی جس نے آنکھیں خیرہ کردیں بلکہ شخصی ادبی سیاست کی ایسی دلدل پیدا کی جس نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا۔قاسمی وزیر آغا چپقلش میں بھی انہی ادبی صفحوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے سنسنی پیدا کرنے کے لیے اختلافات کو ہوا دی۔ان صفحوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ادیب کو تصویر چھپوانے اور خبر لگانے کا چسکا پڑ گیا۔تخلیق کی

بجائے شخصیت موضوع گفتگو بن گئی۔ان صفحوں نے ادب کے سنجیدہ قاری کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایک تو ویسے ہی میڈیا کی یلغار نے لکھے ہوئے حرف کی ساکھ کو متاثر کیا ہے۔دوسرے ان صفحوں کی سیاست نے ادب کا امیج خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔چھوٹی چھوٹی باتوں اور اختلافات کو نمایاں کر کے بڑے جھگڑوں کی بنیاد رکھی گئی۔اب ادبی صفحوں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ادبی اخبار بھی نکل آئے ہیں۔ان اخباروں کی اکثریت سکینڈل سازی کے سوا اور کیا کر رہی ہے۔ادب میں گروپ بندی تو ہمیشہ ہوتی ہے اور شخصی اختلافات بھی کوئی نئی بات نہیں لیکن ان کا دائرہ محدود ہونا چاہیے۔ان صفحوں اور اخباروں نے شخصی پہلوؤں کو نمایاں کر کے نظریاتی بحثوں اور اختلافات کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ہر ہفتہ تصویر چھپوانے کے لیے بہت سے ادیب ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں جو شوبز کے لوگ کرتے ہیں۔

○

بیسویں صدی جدید انکشافات اور نئے علوم کی صدی ہے،ان علوم نے زندگی کے سارے شعبوں کو متاثر کیا ہے اور ادب پر بھی ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔بیسویں صدی کے تین بڑے نام ایسے ہیں جنہوں نے اس صدی کی فکر پر دیرپا اثر ڈالا ہے،ایک آئن سٹائن جس کے نظریہ اضافت نے سائنس کی دنیا میں نئے دریچے وا کیے،ادب پر اگرچہ اس کے براہ راست اثرات تو نہ ہوئے لیکن ادب چونکہ تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے اس لیے ادبی تنقید میں اس حوالے سے کئی نئے نظریات اور نکتہ ہائے نظر کی راہ ہموار ہوئی،دوسرے فرائڈ جس کے نفسیاتی نقطۂ نظر نے انسانی ذہن اور فطرت کو سمجھنے کی کئی راہیں سمجھائیں۔ادب میں اس حوالے سے لکھنے والوں کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے نفسیات،جنسیات اور شعور اور لاشعور کے حوالے سے انسانی طبع کا نیا مطالعہ کیا،تیسرے مارکس جس کے معاشی نقطۂ نظر نے اگرچہ پورے نظام کو نئی راہ دکھائی لیکن اس فکر کے تحت لکھنے والوں کا ایک نیا گروہ وجود میں آیا جو ترقی پسندوں

کے نام سے منسوب ہے۔

بیسویں صدی کی پہلی دو تین دہائیاں نوآبادیاتی نظام کے عروج کا زمانہ ہے، تیسری دنیا کے زیادہ تر ممالک یورپ کی نوآبادیاں ہیں جن میں مخصوص طرح کا سیاسی اور تعلیمی نظام جاری ہے۔لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول نے اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے نوآبادیوں میں جہد وجہد کرتے لوگوں کو نیا حوصلہ دیا۔جنگ عظیم اول نے سامراجی قوتوں کو کمزور کر دیا اور وہ نوآبادیوں کو کچھ حقوق دینے پر مجبور ہو گئے۔چنانچہ برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد معذرت خواہانہ رویے کی بجائے ایک مزاحمتی دور کا آغاز ہوا۔اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے فرد کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے اسے ایک ایسا ولولہ عطا کیا جس کے بل بوتے پر وہ سامراج سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر سکتا تھا، انہوں نے ماضی کی قوت سے حال کا مقابلہ کرنے کی تدبیر کی، اقبال نے نہ صرف فکری سطح پر بلکہ فنی حوالوں سے بھی اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور انداز عطا کیا۔اقبال برصغیر میں اُسی جدید فکر کے بانی ہیں جس کی کوکھ سے بعد میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔اقبال کی فنی اور فکری توانائی کا مقابلہ کرنے کی کسی میں سکت نہ تھی، چنانچہ اقبال کا رنگ ان کا منفرد انداز بن گیا جس کی تقلید ممکن نہ تھی۔اقبال کے اس فلسفیانہ انداز کے ردِعمل کے طور پر رومانوی رویے نے جنم لیا۔اقبال کی شاعری سے عورت غائب تھی۔رومانوی طرز میں اس کا اس قدر ردِعمل ہوا کہ نہ صرف گوشت پوست کی عووت شاعری کا حصہ بنی بلکہ اس کے نام تک متعین ہو گئے۔اختر شیرانی کی نظموں اور گیتوں نے اقبال کی بھاری بھرکم فکری فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی۔تیس اور چالیس کی دہائیوں میں مغربی نظم اور دیگر تحاریک و رجحانات کے حوالے سے نظم کا ایک نیا مزاج وجود میں آیا۔میرا جی اور راشد نے جدید طرز کی نظم کی بنیاد رکھی، خصوصاً میرا جی نے جدید نظم میں مصرع سازی کے تصور کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ ایک حوالے سے مصرع لکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔نظم کے پہلو بہ پہلو غزل میں بھی موضوعاتی سطح پر کئی باتیں

ہوئیں اپنے فنی مزاج اور مضبوط اور روائتی ڈھانچے کی وجہ سے اگر چہ غزل کی ہیت و تکنیک میں تو کوئی بڑی تبدیلی نہ آئی لیکن موضوعات کی سطح پر غزل نے بھی نئے رجحانات کو قبول کیا۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نے اپنے اظہار کے لئے اگر چہ نظم کو زیادہ اہمیت دی لیکن ترقی پسندوں کی اکثریت نے اچھی غزلیں بھی لکھیں اور غزل میں اپنے نقطہ نظر کو پوری توانائی سے بیان کیا، حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کے یہاں بھی نظم ہی زیادہ مقبول رہی۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے پریم چند ہمارے پہلے بڑے اور اہم افسانہ نگار ہیں، جنہوں نے اپنے افسانہ کے ذریعے عام معاشرتی مسائل کی عکاسی کی اور اردو افسانے کو معاشرے کی زیریں سطح تک لے گئے۔ یلدرم کی رومان پسندی نے اس کے برعکس اپنا علیحدہ دائرہ تو ضرور بنایا لیکن ایک حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے یہاں بھی معاشرتی مسائل پوری طرح موجود ہیں۔ فرق صرف رویے کا ہے۔ پریم چند کی روایت ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں تک پہنچی تو برصغیر میں سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ جنگِ عظیم دوم کی وجہ سے نو آبادیاتی نظام ٹوٹ رہا تھا اور اس میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت شاعری اور نثر دونوں میں اپنے سماج کی بھرپور عکاسی ہو رہی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک پورے دم خم کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن تقسیم کے اثرات کے تحت پاکستانی ادب میں چار پہلو بہت نمایاں ہوئے۔

اوّل فسادات کا المیہ، محرومی اور انسانی جانوں کے زیاں پر دکھ اور غم، دوم ہجرت کا دکھ، پرانی زمینوں ور آبائی گھروں کی یاد جس نے ایک نئی طرح کی تنہائی اور مایوسی کو جنم دیا۔ سوم، نئی مملکت کے بارے میں ٹوٹتے خواب کہ کچھ عرصہ بعد ہی احساس ہونے لگا کہ جس بڑے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی دی گئی ہے وہ ابھی دور ہے اور لوٹ کھسوٹ کا وہی پرانا نظام پھر وجود میں آ گیا ہے۔ چہارم کچھ خوش فہمیاں جن کی بنیاد پر ہجرت کے عمل سے مطمئن ہونا تھا خوابوں

کے ٹوٹنے کی اذیت ہر باشعور شاعر کے یہاں موجود ہے۔ فیض تو صرف اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے مارے گئے ورنہ ...... ۔ یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر...... سے زیادہ واضح اور موثر طریقے سے اس کا اظہار دوسرے شاعروں کے یہاں ہوا ہے۔

رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے (حفیظ جالندھری)

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش وخروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے (حفیظ جالندھری)

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے، کیا ہوئے (ناصر کاظمی)

کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا دیا (احمد ندیم قاسمی)

○

۱۹۵۸ء کا مارشل لا لگا تو میں اُس وقت اٹھارہ سال کا تھا اور اب میں ۶۱ سال کا ہوں اور چوتھا مارشل لا لگا ہوا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لا لگا تو عوام کی اکثریت اس سے واقف نہ تھی، عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ ان کی بہتری کی کوئی صورت ہے کہ اُس وقت تک فوج کے بارے میں بھی کوئی منفی رائے موجود نہیں تھی، مارشل لا کے ساتھ خوف کا پہلو تھا وہی اُس وقت نمایاں ہوا۔ یہ ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور راشننگ کا دور تھا۔ چیزوں کی قیمتیں مقرر تھیں لیکن وہ اوپن مارکیٹ میں دستیاب نہ تھیں۔ ہر شے لائن میں لگ کر لینا پڑتی تھی۔ یہ بات عرصہ تک حکمرانوں کو سمجھ نہ آئی، وہ چیز کو مقررہ قیمت سے زیادہ پر بیچنے پر معترض ہوتے تھے نتیجہ یہ کہ لوگ لائنوں میں لگ کر یا بلیک میں خریداری کرتے تھے۔ ضیاء الحق کو یہ نکتہ سمجھ آ گیا کہ قیمتوں سے

کنٹرول اٹھالیں ،اب چیزیں موجود اور قیمت کی وجہ سے خریدار غائب ۔ چنانچہ حکومت کو جو گالیاں پڑتی تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ مارشل لاء کی مدد کے لیے وفادار بیوروکریٹس ہمیشہ سامنے آجایا کرتے ہیں ۔ الطاف گوہر نے صحافیوں کو لفافوں سے آشنا کیا تو قدرت اللہ شہاب نے گلڈ کے ذریعے ادیبوں کو قابو کیا۔ بیرونی قرضوں کی انتہا ہوگئی۔ کچھ صنعتیں ضرور لگیں لیکن انفراسٹرکچر کے بغیر ان کا جو حشر ہونا تھا وہی ہوا۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے یہاں اگر زراعت کو صنعت کا درجہ دیا جاتا تو نتائج بہت مختلف ہوتے لیکن کچھ ذاتی مفادات کچھ بیرونی قرضہ دینے والوں کی شرائط کی وجہ سے یہاں ہمیشہ ایسی صنعتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی جس کے لیے ہمارے پاس بنیادی ڈھانچہ نہیں تھا۔ مارشل لاء کو پہلا دھچکا تو ۶۵ء کی جنگ میں لگا اس جنگ میں کشمیر میں مجاہدین بھجوائے لیکن اپنے بارڈر کھلے چھوڑ دیے۔ واہگہ میں اگر بھارتی افواج اپنے ہی خوف سے رک نہ جاتیں تو صورت حال مختلف ہو جاتی ۔ اکھنور میں جنرل اختر کو ہٹا کر جنرل یحیٰی کو لگانا بھی کسی بیرونی دباؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس جنگ کے بارے میں اب بہت سے حقائق کتابوں میں چھپ چکے ہیں، بہر حال اس جنگ کا جو بھی تاثر تھا وہ تاشقند میں ختم ہوگیا۔

مارشل لاء کو دوسرا دھچکا انتخابات سے پہنچا مادر ملت اگرچہ ہار گئیں لیکن مضبوط مرکز میں ایک ایسی دراڑ پڑ گئی جس نے بالآخر ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔ بی این آر سیاستدانوں کو ذلیل کرنے کے منصوبے تیار کرتا تھا۔ مجیب کے چھ نکات یہیں تیار ہوئے ۔ ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک کے آغاز میں طالب علموں کا جھگڑا تو ایک ظاہری وجہ تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ لوگوں کی نفرت لاوا بننے کے لئے عرصہ سے کھول رہی تھی۔ تحریک شروع ہوئی تو گلیوں محلوں تک پھیل گئی ۔ کمیٹی چوک جسے بعد میں شہید چوک بھی کہا گیا۔ تحریک کا مرکز بن گیا، جب پولیس مظاہرین پر شیلنگ کرتی تو وہ آس پاس کی گلیوں میں بھاگ جاتے پولیس پیچھا کرتی تو عورتیں گھروں کے دروازے کھول دیتیں، لوگ ان گھروں میں پناہ لیتے ۔ پانی کی بالٹیاں بھری ہوتی تھیں، چھتوں

سے گیلے کپڑے گلیوں میں بھاگتے نوجوانوں کی طرف پھینکے جاتے یوں اس تحریک میں ہر فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لے رہا تھا۔

مارشل لا کا نتیجہ پھر مارشل لا ہی نکلا۔ایوب خان نے اپنے ہی بنائے ہوئے آئین سے انحراف کر کے اقتدار، سپیکر کی بجائے اپنے چیف کے سپرد کیا۔حمودالرحمن رپورٹ اب چھپ گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ نے بہت پہلے سے اقتدار پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ پہلے مارشل لا نے ۶۵ ء کی جنگ کا تحفہ دیا، دوسرے مارشل لا نے ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ۱۹۷۱ء کی وہ شام بڑی اداس تھی، بلیک آوٹ ابھی جاری تھا، میں، مظہر، داؤد، اعجاز اور سرور کامران صدر سے شہر کی طرف آ رہے تھے، ہم میں سے ہر کوئی خاموش تھا، بس چل رہے تھے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے، جب ہم لیاقت باغ سے ذرا پہلے لئی کے پل پر پہنچے تو ہمیں اندھیرے میں کسی کے ہنسنے کی آواز آئی، ہم ٹھٹھک گئے۔ پل کے نیچے کچھ لوگ جوا کھیل رہے تھے اور غالباً جیتنے والے نے قہقہہ لگایا تھا۔ان کو احساس تک نہ تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔

بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ایک امید سی بندھ گئی کہ شاید اب زوال کی دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔بھٹو کا یہ کریڈٹ تو اپنی جگہ کہ انہوں نے ۷۳ء کا آئین بنا دیا،لیکن ان کے جاگیردارنہ مزاج نے جمہوریت کی روح کو قبول نہیں کیا۔میں بھٹو کا بڑا حامی تھا، اب تک ہوں لیکن جب کراچی میں مزدوروں کا مسئلہ کھڑا ہوا تو میں نے افسانہ ''بے پانی کی بارش'' لکھا، جس پر کئی دوست ناراض ہو گئے، اس افسانے کی وجہ سے مجھے قومی مزدور محاذ کا سٹڈی سرکل بھی چھوڑنا پڑا، لیکن مجموعی طور پر بھٹو کے منفی پہلو نسبتاً کم ہیں۔اسلامی ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، پاکستان کے نیوکلئیر پروگرام کا آغاز کرنا اُس کے وہ مثبت پہلو ہیں جس پر پاکستانیوں کو ہمیشہ فخر کرنا چاہئے۔بھٹو حکومت کے اٹھارہ مہینے میں ہی پہلی فوجی بغاوت ناکام ہوئی۔بھٹو نے خود اس کے بارے میں لکھا ہے کہ حیرت ہے کہ جس فوج کے ۹۳ لاکھ آدمی ابھی دشمن کی قید

میں ہیں وہ بغاوت کے بارے میں سوچ بھی سکتی ہے۔

بھٹو خود ایک جاگیردار تھا، فوج کے بارے میں اس کی مخصوص سوچ تھی، وہ پھانسی چڑھ گیا لیکن اُس نے فوج کو شکنجہ میں لانے کی کوشش نہ کی۔ ۷۱ء میں فوج پہلی اور آخری بار ایسی حالت میں تھی کہ اسے لگام دی جا سکتی تھی، لیکن بھٹو کا نقطۂ نظر ہی مختلف تھا۔ نہرو کے زمانے میں ایک بار جب کرشنا مینن بھارت کے وزیر دفاع تھے، وزیر دفاع اور آرمی چیف کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف ہوا، اگرچہ آرمی چیف کا موقف درست تھا لیکن نہرو نے کرشنا مینن کا ساتھ دیا اور جب آرمی چیف نے استعفیٰ دینے کی کوشش کی تو نہرو نے اسے بلا کر ڈانٹا اور کہا کہ یاد رکھو تم ایک سرکاری ملازم ہو اور کرشنا مینن ایک منتخب عوامی نمائندہ۔ بالکل انہی دنوں پاکستان میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ایوب کھوڑو وزیر دفاع اور ایوب خان آرمی چیف تھے، کسی بات پر اختلاف ہوا تو کھوڑو کو جانا پڑا۔ بھٹو اس صورت حال پر اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے نہرو پر تنقید کرتے ہیں کہ ان کا رویہ غلط تھا۔ میرے خیال میں یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے پاکستان اور بھارت کے آئندہ نظاموں اور دونوں ملکوں میں آرمی چیف کے کردار کا تعین ہو گیا۔ بھٹو نے پوری کوشش کی کہ فوج کا امیج دوبارہ ٹھیک ہو جائے جو مشرقی پاکستان میں ذلت آمیز طریقے سے ہتھیار پھینک کر اتنی بڑی میں تعداد میں جنگی قیدی بنی تھی۔ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بھٹو نے فوج کا امیج بنایا۔ جنگی قیدی واپس آئے تو ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے انہیں طرح طرح کی مراعات سے نوازا گیا۔ حمود الرحمن کمیشن کی رپورٹ شائع نہ کی گئی۔ اب یہ رپورٹ شائع ہو گئی ہے تو فوج کے ''کارناموں'' کی تفصیل بھی سامنے آئی ہے۔ اگر اسی طرح کا ایک کمیشن ۶۵ء کی جنگ کے بارے میں بھی بنایا جاتا اور حقائق منظر عام پر لائے جاتے تو شاید فوج کو اقتدار میں آنے کی جرات نہ ہوتی۔ اس کے برعکس ہمارا رویہ یہ رہا ہے کہ ہم نے سیاستدانوں کی ذرا سی غلطی کو تو خوب اچھالا اور فوج کی بڑی غلطیوں بلکہ مجرمانہ غلطیوں کو چھپایا بلکہ نظر انداز کیا،

اسے دفاع پاکستان کے ساتھ منسلک کر کے ہمیشہ گڑ وی گولی کی طرح مزے لے لے کر چوسا۔

بھٹو کا المیہ ایک بڑے تجزیے کا متقاضی ہے۔ اس کی ذاتی خامیوں اور اچھائیوں سے قطع نظر اس کا تیسری دنیا میں کردار قابل غور ہے۔ بن بااللہ، سوئیکارنو، شاہ فیصل، بھٹو اور قذافی میں سے قذافی صرف اس لئے بچ گئے کہ انہوں نے اپنے عوام سے رابطہ نہیں توڑا۔ یہ سارے لوگ مسلم بلاک کے حامی تھے اور ان کے انجام کی وجہ بھی یہی تھی۔ ۷۷ء کے انتخابات کا اچانک اعلان، لوگوں کے لئے غیر متوقع ہوسکتا ہے لیکن مارشل لا کی پلاننگ کرنے والے کے لئے غیر متوقع نہیں تھا، انہوں نے ایسے حالات پیدا کئے اور بھٹو کو مشورے دیے کہ وہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صدیق سالک نے اپنی آخری کتاب میں ضیاء الحق کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوری ہی میں مارشل لگانے کا پروگرام چکا تھا۔

○

میری اپنی زندگی میں ۷۷ء کا سال بڑا اہم ہے۔ ابتدائی جنوری میں امی سودا لینے راجا بازار گئیں۔ واپسی میں ان کے ٹخنے پر چوٹ لگ گئی۔ تین چار دن تو انہوں نے خیال نہیں کیا نہ ہی ہم نے کوئی توجہ دی لیکن ورم ٹخنے سے پنڈلی کی طرف بڑھا تو فکر ہوئی۔ وہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا اُس نے دوا دی، دوا کھاتے ہی ورم میں اضافہ ہوگیا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ انہیں سول ہسپتال میں جو ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا، داخل کرا دیا جائے۔ دو دن ٹیسٹ ہوتے رہے رات کو میری چھوٹی بہن شاہین ان کے پاس رہتی تھی۔ تیسرے دن ابھی اذانیں ہو رہی تھیں کہ گھبرائی ہوئی آئی بتایا کہ امی رات ایک بجے سے بے ہوش ہیں۔ ہم عموماً بارہ بجے رات تک ان کے پاس رہتے تھے۔ افراتفری میں ہسپتال پہنچے۔ وہ بے ہوش تھیں، ڈاکٹر کے آتے آتے آٹھ بج گئے۔ وہ بڑا مایوس تھا، ہم امی کو ہولی فیملی لے گئے۔ ایمبولینس سے اتارتے ہوئے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ انہیں وہاں بھی ہوش نہ آیا اور وہ چار بجے کے قریب فوت

گئیں، یہ جمعہ ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء تھا۔

میں کتنے ہی عرصے تک اس صدمے سے نہ نکل سکا۔ والد کی وفات کا مجھے اتنا صدمہ نہ ہوا تھا کہ پاکستان آنے کے بعد وہ کافی عرصہ ہم سے دور رہے اور آخری دنوں میں بھی بہن کے گھر تھے لیکن امی سے جدا ہونے کا تصور تک نہیں تھا۔ میں ان کی محبت سے بھاگتا تو تھا اور مقناطیس کی طرح ان کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ وہ میرا باپ بھی تھیں اور ماں بھی۔ ایک ایسی آئیڈیل ماں جس کا ذکر کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے خصوصاً میرے لئے ان کی قربانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ ان کی وفات کے کافی عرصہ تک میرے حواس بجا نہیں ہوئے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی ہیں رات کو کئی کئی دفعہ اٹھ کر میرے منہ پر ہاتھ پھیرتی تھیں، دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتی تھیں۔ میری شادی ہوئی تو میں نے دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دیا دیر سے آنے کی عادت ختم نہ ہوئی، وہ سو جاتی تھیں، میں چپکے سے آتا اور اپنے کمرے میں چلا جاتا، صبح سویرے نماز پڑھتے ہی وہ دروازہ کھٹکھٹا دیتیں۔ رخسانہ دروازہ کھولتی۔ وہ اندر آ کر میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتیں اور دو تین پھونکیں مار کر چارپائی پر بیٹھ جاتیں۔ میں عموماً جاگ کر ان کی گود میں سر رکھ دیتا۔ وہ دیر تک میرے بالوں سے کھیلتی رہتیں۔

○

الیکشن کے اعلان کے ساتھ ہی پی این اے وجود میں آ گئی یہ ایک منظم تحریک تھی کہ اس کے پیچھے جو ماسٹر مائنڈ تھا، وہ اسے ایک طے شدہ پروگرام کے تحت قدم قدم، لحہ لحہ آگے بڑھا رہا تھا اس کے برعکس پیپلز پارٹی کے لیڈر اپنی خوش فہمیوں کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے، اقتدار نے ان کے دماغ میں ایسا تکبر پیدا کر دیا تھا کہ وہ کسی سے مشورے کو بھی توہین سمجھتے تھے۔ پیپلز پارٹی کی الیکشن مہم انتہائی ناکام اور بودی تھی۔ پوسٹر بازی کا زمانہ تھا، پیپلز پارٹی کا حال یہ تھا کہ ان کا پوسٹر لگ رہا ہوتا تھا کہ پی این اے کا جواب بھی ساتھ ہی چسپاں ہو جاتا، پیپلز پارٹی کے

الیکشن سیل میں بڑے سوراخ تھے، کچھ لالچ میں اور کچھ نشے میں، وہاں کی ساری باتیں قبل از وقت طشت از بام ہو جاتی تھیں لیڈروں کا یہ حال تھا کہ جب پنڈی کے ہم خیال دوستوں نے انہیں مدد کی پیش کش کی تو انہوں نے کہا کہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ پیپلز پارٹی میں یہ بنیادی خرابی ہے کہ کوئی لیڈر دوسرے کو آگے نہیں آنے دیتا کہ کہیں اس کی حیثیت متاثر نہ ہو جائے، اس کے برعکس پی این اے کی مشاورت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

پیپلز پارٹی کا مسئلہ بھی عجیب ہے یہ عاشق اور معشوق والا معاملہ ہے۔ عوام عاشق اور پارٹی لیڈر شپ معشوق، چنانچہ لیڈر شپ یہ سمجھتی ہے کہ کوڑے کھانا، خودسوزی کرنا، قید و بند کی صعوبتیں سہنا ورکروں کا کام ہے۔ ورکر واقعی یہ سب کچھ کر کے انہیں اقتدار میں لاتے ہیں، اقتدار میں آنے کے بعد لیڈر انہیں بھول جاتے ہیں، ان کا فلسفہ شاید یہ ہے کہ اس عرصہ میں ورکر کوڑوں کے زخم ٹھیک کرلیں اور تازہ دم ہو کر پھر تیار ہو جائیں، اس دوران لیڈر شپ اللے تللوں کے بعد اقتدار سے محروم ہو چکی ہوتی ہے، پھر وہی صورت کہ ورکر سڑکوں پر اور لیڈر شپ جیلوں میں یا ملک سے باہر لندن میں آرام کر رہی ہوتی ہے۔ لیڈر شپ اقتدار میں آتی ہے تو اپنے ورکروں کو نوازنے کی بجائے مخالفین کو فائدے پہنچاتی ہے، فخر زمان اکادمی کے چیئرمین بنے تو عطا اور امجد کو خوش کرنے میں لگے ہوئے تھے، کسی نے اعتراض کیا تو کہنے لگے، آپ تو اپنے آدمی ہیں آپ کی ہمیں فکر نہیں لیکن مخالفین کو نوازنا ضروری ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں۔ ساتھ تو معلوم نہیں ان لوگوں نے ان کا دیا یا نہیں یہ ضرور ہوا کہ اپنے دوست دور ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ کی یہ فلاسفی کافی عرصہ تک کامیاب رہی لیکن اب صدی ختم ہو گئی ہے۔ ورکروں کو بھی کافی چیزوں کی سمجھ آ گئی ہے۔ اب وہ سڑکوں پر آنے، کوڑے کھانے اور خودسوزی کے لئے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں اب لیڈر آگے آئیں ہم ان کے پیچھے ہوں گے۔

○

مارچ کی پانچ تاریخ کو قومی اسمبلی کے الیکشن تھے، چار کی رات کو رخسانہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ میں تقریباً دو بجے اسے ہسپتال لے گیا۔ صبح میں تو ووٹ ڈالنے چلا گیا۔ دو بجے کے قریب واپس آیا، تین بجے کے قریب نرس نے آ کر سعدیہ کی پیدائش کی خبر دی۔ مسلمان ہونے کے ناطے میں آواگون پر یقین نہیں رکھتا، لیکن اگر میرا اس پر یقین ہوتا تو میں کہتا کہ امی نے سعدیہ کے روپ میں دوبارہ جنم لے لیا ہے۔

○

پی این اے نے اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت الیکشن کا بائیکاٹ کیا حکومت نے صوبائی حکومتوں کے الیکشنوں پر اصرار کیا اور یوں وہ تضاد وجود میں آیا جس کی کوکھ سے تیسرے مارشل لا نے جنم لیا۔ پی این اے کی تحریک اتنی منظم تھی کہ جیل میں ورکروں کو باقاعدہ پے منٹ ہوتی تھی، شالیمار میں کئی لوگ لاہور سے بریف کیس سمیت آتے تھے، ان میں سے کئی الطاف احمد قریشی کے جاننے والے ہوتے تھے، ان کی زبانی معلوم ہوتا کہ جیلر تک اس سازش میں شریک ہیں۔ اس تحریک میں جو مذہب کے نام پر شروع کی گئی تھی بائیں بازو کی جماعتوں کا ردعمل بڑا دلچسپ تھا۔ ان کی اکثریت اس تحریک کی حامی تھی اور بعض جماعتوں کے ورکر ان جلوسوں میں شریک بھی ہوتے تھے، فلسفہ یہ تھا کہ سسٹم کمزور ہو جائے گا تو بایاں بازو اقتدار پر قبضہ کر لے گا۔ یہ خیالی اور فرضی سوچ سٹڈی سرکلوں کی پیداوار تھی جہاں اردگرد سے آنکھیں بند کر کے کتاب پڑھی جاتی تھی، یہ سٹڈی سرکل وہ کنویں تھے جنہوں نے بڑے بڑے مینڈک پیدا کیے، جن کا انقلاب ان کی ذات تک محدود تھا، انہیں معاشرتی مزاج کا ادراک ہی نہیں تھا۔

اس کے بعد مذاکرات کی ایک طویل داستان ہے۔ دونوں طرف ماسٹر مائنڈ کے گماشتے موجود تھے جو کسی فیصلے پر نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر معاہدہ دو ایک دن پہلے ہو جاتا تو مارشل لا کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن یہ معاہدہ ہو کیسے جاتا۔ ماسٹر مائنڈ یہ معاہدہ کسی

قیمت نہ ہونے دیتا۔ بھٹو کے ساتھیوں میں اُس کے ایجنٹ اُسے اکسا رہے تھے اور پی این اے میں شامل اسی طرح کے لوگ، پی این اے کو کسی سمجھوتے پر نہ پہنچنے دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جمہوریت کو بچانے کی ساری خواہشیں اور کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اور پانچ جولائی ۱۹۷۷ء کو چوتھے مارشل لا کی لعنت ہم پر نازل ہوگئی مجھے ایک بار پھر لگا کہ میری عزت نفس مجروح ہوگئی ہے میں ایک بار پھر مفتوح ہوگیا ہوں۔

○

بھٹو کا نعرہ چونکہ روٹی کپڑا مکان اور اسلامی سوشلزم تھا اس لیے مارشل لا نے اسلام کا نعرہ بلند کیا، بھٹو اپنے نعرے کے ساتھ مخلص نہیں تھا، ضیاء اسلام کے نفاذ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ نہ سوشلزم آیا نہ اسلام۔ سوشلزم کا نعرہ لگانے والوں کا المیہ یہ تھا کہ ان کی اکثریت مغربی ماڈرن ازم کو سوشلزم اور کمیونزم سمجھتی تھی۔ ان کے نزدیک معاشرے کے ظاہری اور اوپری حصہ میں تبدیلی ہی کافی تھی، اس کے برعکس اسلام کا نام لینے والے بھی ایسی صورت حال سے دوچار تھے۔ ان میں سے بعض قبائلی نظام کو اسلام سمجھتے تھے اور بعض صرف ظاہری سطح یعنی رسوم کی ادائیگی میں ظاہرداری کو اسلام خیال کرتے تھے چنانچہ ضیاء الحق کا اسلام بھی اتنا ہی تھا جس میں نماز روزے پر تو بہت زور تھا لیکن اسلام کے نظام حیات کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ اسلام کا نعرہ یوں بھی اس کی مجبوری تھی کہ بھٹو کے رد کے لیے اس کے سوا اور کوئی فوری نعرہ تھا ہی نہیں۔ ہمارے نظام تعلیم، سیاسی نظام اور معاشرتی رویوں میں یہ ساری منفی تبدیلیاں 1857ء کے بعد آئیں۔ 1857ء سے پہلے ہمارے مدرسوں میں دین اور دنیا دونوں نصاب میں شامل تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ منطق، حساب اور فلسفہ بھی پڑھایا جاتا تھا۔ مدرسے سرکاری عمل دخل سے دور تھے۔ بادشاہ مدرسوں کو جاگیریں الاٹ کر دیتے تھے۔ ان جاگیروں کی آمدنی سے مدرسوں کا نظام چلتا تھا۔ انگریز نے جب انگریزی کو سرکاری زبان بنایا تو ملازمتوں

کے حصول کے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدرسوں کے نظام پر یوں ضرب لگائی کہ ان کی جاگیریں چھین لیں۔ مدرسے زکواۃ اور چندے پر آ گئے۔ اُس وقت سے اب تک ان کی آمدنی کا یہی ذریعہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدرسوں میں پڑھنے والوں کی انا پہلے دن کچلی جاتی ہے اور ان کے اندر معاشرے کے خلاف ایک منتقم مزاجی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کی ہر شے کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ گھر گھر سے روٹی مانگ کر کھانے والے سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے، دوسرے یہ کہ ہمارے مدرسوں نے انگریزی سکولوں کی ضد میں اپنے نصاب میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی اور ابھی تک ان میں درس نظامیہ ہی پڑھایا جا رہا ہے۔ ان مدرسوں میں جدید علوم کا گزر گناہ ہوگیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل دین کے بارے میں تو آگہی رکھتے ہیں، جدید دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس انگریزی تعلیمی اداروں میں دین کا داخلہ ممنوع ہوگیا، وہاں دنیا ہے دین نہیں۔ انگریزوں نے کہا اگر نوکری لینا ہے تو ادھر آ جاؤ، مُلاّ بننا ہے تو ادھر چلے جاؤ۔ علی گڑھ کی بنیاد میں یہ شامل تھا کہ یہاں دین اور دنیا ساتھ ساتھ ہوں گے لیکن آہستہ آہستہ وہ نوکری حاصل کرنے کا ایک زینہ بن کر رہ گیا، اسی لیے شبلی نے کہا تھا علی گڑھ ہر مجسٹی کے لیے وفادار ملازم پیدا کرنے کی ایک فیکٹری ہے، یہی اعتراض اکبر الہ آبادی کو بھی تھا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے ذریعے انگریز سرکار کے لیے وفادار پیدا کیے جاتے تھے۔ لارڈ میکالے نے جب اپنی تعلیمی پالیسی وائسرائے کو منظوری کے لیے بھیجی تو اُس نے اس پر جو نوٹ لکھا وہ قابل توجہ ہے اُس نے لکھا ''ہم چند ہزار انگریز زیادہ عرصہ تک کروڑوں کے اس ملک پر حکومت نہیں کر سکتے، ہمیں یہاں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو نسلاً ہندوستانی اور ذہنی طور پر انگریز ہو، مجھے یقین ہے کہ اس تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں جلد ہی یہ جماعت وجود میں آ جائے گی''

حیرت ہے کہ سرسید نے علی گڑھ کالج کے بارے میں انہی خیالات کا اظہار کیا۔ وہ

لکھتے ہیں۔ ''اُس کالج کا مقصد عموماً مسلمانوں میں اور خصوصاً اعلیٰ طبقے کے خاندانوں میں یورپی سائنس وادب سے واقفیت پیدا کرنا ہے اور اس طرح ایک مسلمان طبقہ پیدا کرنا ہے جو مذہب کے اعتبار سے مسلمان، خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر ذوق، خیالات اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو'' خیالات کی یہ مماثلت قابل غور ہے۔ یہ ایک طے شدہ منصوبہ تھا، اشتراک عمل۔ سرسید کی خوش فہمی یا بقول حسن عسکری وہ گودے اور چھلکے کے فرق کو نہیں سمجھ سکے اور یہ ہی ہوا اس جماعت نے انگریزی نظام کو تقویت بخشی۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب المیہ ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی، ایک وقت میں وہ ڈھائی ہزار بھی تھے۔ گویا اوسطاً بیس پندرہ ہزار انگریزوں نے نوے سال تک اس ملک پر حکومت کی اور کوئی بڑی بغاوت نہیں ہوئی۔ اگر ہٹلر یورپ میں سامراجیت پر ضرب نہ لگا تا تو نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ ایک شہر میں انگریز افسروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہی ہوتی تھی۔ ایک کمشنر، ایک ڈپٹی کمشنر، ایک ایس ایس پی اور ایک کلکٹر، باقی تو یہ دیسی گورے ہی تھے جو انگریزی حکومت کی آنکھیں کان اور ہاتھ تھے۔ علی گڑھ کے بارے میں یہی تصور تھا کہ یہاں داخلہ لینے والوں کی پہلی تمنا آئی سی ایس ہوتی تھی نہ بن سکے تو کلرک۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو بیوروکریسی نوآبادیاتی نظام کی ناجائز اولاد ہے۔ اس طبقہ کی ہمدردیاں اور خدمات صرف حکومت کے لئے ہیں۔ ہم آج بھی ہر سال دو تین سو اشخاص کا انتخاب کرتے ہیں، پھر انہیں مختلف اکادمیوں میں یہ سکھاتے ہیں کہ عوام پر کیسے حکومت کرنی ہے اور حکمرانوں سے جو جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں، کے مفادات کا تحفظ کیسے کرنا ہے۔ میکالے کا نظام تعلیم آج بھی جاری ہے۔ ہماری تمام تعلیمی پالیسیاں زیادہ تر انتظامی معاملات سے متعلق رہی ہیں، کسی پالیسی میں بنیادی تبدیلی پیش نہیں کی گئی۔ 1965ء کی جنگ میں ایک لطیفہ بڑا مشہور ہوا تھا کہ دو بڑے افسروں کی بیگمات ملیں تو ایک نے دوسری سے کہا۔ ''بہن اگر انڈیا نے ہم پر قبضہ کر لیا تو ہمارا کیا

بنے گا'' دوسری نے اطمینان سے کہا'' کچھ بھی نہیں ہم پی سی ایس سے آئی سی ایس ہو جائیں گے''۔ جب تک ہم اس نظام کو نہیں بدلیں گے بنیادی تبدیلی نہیں آسکتی۔ آزادی کے بعد صرف یہی فرق پڑا ہے کہ چہرے بدل گئے ہیں، نوآبادیاتی نظام ایک نہ نظر آنے والے نئے نوآبادیاتی نظام میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم براہ راست افسر بھرتی کرنے کی بجائے اسسٹنٹ کی سطح پر بھرتی کریں، تین سال تک وہ دفتروں میں کام کریں پھر سیکشن افسر کا امتحان دینے کے اہل ہوں۔ یوں صرف افسر ہونے کا تصور ختم ہو جائے گا، یہی صورت فوج میں بھی ہو۔ براہ راست افسر بھرتی کرنے سے ایک علیحدہ کلاس وجود میں آجاتی ہے۔ نظام میں بنیادی تبدیلی نہ آنے کی وجہ سے کوئی بھی نعرہ ہمارے یہاں بے اثر اور بے ثمر ہو جاتا ہے۔ لیکن جمہوریت کی کمزور سی شمع بھی بہر حال آمریت اور مارشل لا سے بہتر ہوتی ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کی تو یہ روایت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ روشن خیالی کا ساتھ دیا ہے، مُلّا ازم کے مقابلے میں سرسید، قائد اعظم اور پھر بھٹو کا ساتھ دے کر انہوں نے تو اپنی ترجیحات کا اظہار کر دیا تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے خوابوں کے تعبیر کیا نکلی۔

پہلے مارشل لاء (۵۸ء) میں تو اکثر لوگ اس نام ہی سے واقف نہ تھے لیکن دس سالہ آمریت کا مزہ چکھ کر اور پھر دوسرے مارشل لاء (۶۹ء) میں آدھا ملک گنوا کر سب کو مارشل لا کی نام نہاد افادیت کا پتہ چل گیا تھا چنانچہ جب تیسرا مارشل لاء لگا تو اکثریت نے اسے پسند نہیں کیا، وہ بھی جو بھٹو کے خلاف تحریک میں پیش پیش تھے، مارشل لا کے بارے میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے، سوائے اُن چند لوگوں اور جماعتوں کو، جو الیکشن میں چار پانچ فیصد ووٹ بھی نہیں لے سکتے، مارشل لا ہمیشہ اچھا لگتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے یہ اقتدار میں آنے کا چور دروازہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مارشل لا میں بڑی جماعتیں تو پیچھے ہو جاتی ہیں اور علیحدگی پسند اور چھوٹے گروپ اوپر آجاتے ہیں۔ ۷۷ء کے مارشل لا کا عوامی سطح پر تو جو ردِعمل ہوا سو ہوا، ادب میں ایک نئی

مزاحمتی تحریک وجود میں آئی۔ شاعری اور نثر دونوں میں اس کا ردِعمل سامنے آیا۔ اعجاز راہی اس زمانے میں کراچی میں تھا۔ اُس نے لکھا کہ وہ مارشل لا کے خلاف لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ مرتب کرنا چاہتا ہے۔ یہ دسمبر کی بات ہے میں نے منشا، مظہر، داؤد، فریدہ حفیظ، احمد یوسف، اور اپنے افسانے بھجوائے، جو ۵ جولائی کے بعد لکھے گئے تھے۔ اعجاز راہی نے گواہی کے نام سے یہ مجموعہ مرتب کیا اور جنوری ۱۹۷۸ء میں اسے چھاپ دیا، یعنی مارشل لا لگنے کے صرف چھ سات ماہ بعد ہی مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ چھپ گیا۔ اس کا خاصا ردِعمل ہوا۔ یہ عرصہ ایک عجیب خوف کا زمانہ ہے۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے ہم ڈرتے بھی تھے۔ لیکن باز نہیں آتے تھے۔ اس دوران میں نے اور منشا نے متواتر ایسے افسانے لکھے اور حلقہ میں پڑھے جن میں مارشل لا کی مذمت کی گئی تھی۔ اس دوران لکھے گئے میرے ذاتی افسانوں کا مجموعہ ''سہ پہر کی خزاں'' اپریل ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا غالباً یہ پہلا مکمل مجموعہ ہے جس میں سارے مزاحمتی افسانے شامل ہیں۔ یہ تو وہ کام تھا جو ادبی محاذ پر ہو رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے کئی گروپ ایسے تھے جو وال چاکنگ کر کے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ وال چاکنگ کی وجہ سے پولیس الرٹ ہو گئی تھی اس کے علاوہ مختلف ایجنسیوں کے لوگ بھی ایسے لوگوں کو تلاش کر رہے تھے۔ میرے پاس اس زمانے میں موٹر سائیکل تھا۔ لوگ ایک دو بجے کے بعد نکلتے۔ رنگ کے ڈبے ہینڈل کے ساتھ لٹکا لیتے برش کی بجائے کٹنگ کا استعمال ہوتا۔ کٹنگ والا پیپر دیوار پر لگا کر اس پر رنگ کا برش پھیرنے سے ایک ہی دفعہ ساری عبارت دیوار پر لکھی جاتی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹے میں ہم لوگ مری روڈ اور اس کی ملحقہ سڑکوں پر مارشل لا کے خلاف نعرے لکھ کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ اور بھی کئی لوگ یہ کام کر رہے تھے ان میں اشرف سلیم، جہانگیر عمران اور اسلام آباد میں طارق شاہد شامل تھے۔ یہ کام بظاہر تو بڑا آسان لگتا تھا لیکن اس کے خطرے کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ جو شخص پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا پھر اس کا جو حشر ہوتا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ احسن علی خان اور اختر

جمال کا بیٹا جو قائد اعظم یونیورسٹی میں لیکچرار تھا اس کی ایک مثال ہے۔ اس کا سکوٹر پکڑا گیا۔ اس میں اشتہار تھے۔ دوسرے دن انہوں نے اسے بھی آ دبوچا۔ احسن علی خان بڑے بااثر شخص تھے۔ کاکول میں عرصہ تک پڑھا چکا تھے اور کئی بڑے فوجی ان کے شاگرد تھے لیکن وہ بھی بیٹے کو نہ چھڑا سکے۔ ابھی مارشل لا کا آغاز تھا اس لیے پی این اے کے حامی یہ سمجھتے تھے کہ ان کی فتح ہو گئی ہے، بھٹو جیسے دشمن کو انہوں نے زیر کر لیا ہے۔ ہم لوگ اس زمانے میں شالیمار میں بیٹھتے تھے۔ مارشل لا کے بعد پہلی بار وہاں ادیبوں کی دو میزیں بن گئیں۔ ایک پر احسان اکبر، جلیل عالی اور اس طرح کے لوگ اور دوسری میز پر الطاف قریشی، منظور عارف، اختر حسین جعفری، ادیب سہیل، داؤد، مظہر، منشا، مرزا حامد بیگ اور میں تھے۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد لاہور میں بھٹو کا جو استقبال ہوا اس نے مارشل لا کی قیادت کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بھٹو کو نواب احمد خان قتل کیس میں گرفتار کر لیا گیا اور مولوی مشتاق کی عدالت میں کارروائی شروع ہو گئی یہ کارروائی کیسے چلی اب یہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ نجی محفلوں میں اس پر طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ جسٹس یوسف صراف جو اس زمانے میں آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، ایوب مرزا کے عزیز تھے، ایک دن ایوب مرزا کے گھر کھانے کی دعوت تھی۔ مہمان چلے گئے تو میں ایوب مرزا اور یوسف صراف رہ گئے گفتگو کا رخ عدلیہ کی طرف مڑ گیا۔ یوسف صراف کہنے لگے، جس زمانے میں بھٹو کا کیس چل رہا تھا، ایک میٹنگ میں میری مولوی مشتاق سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا مولوی صاحب بھٹو بار بار آپ پر عدم اعتماد کر رہا ہے، مناسب ہے کہ آپ یہ کیس چھوڑ دیں۔ عدلیہ کی روایت بھی یہی ہے۔ یوسف صراف کہنے لگے کہ میری بات سن کر مولوی مشتاق بولے۔

''میں کیسے یہ کیس چھوڑ دوں، میں نے ہی تو اسے پھانسی چڑھانا ہے''۔

عدالتی کارروائی روز اخبار میں چھپتی تھی۔ منظور عارف اور اختر حسین جعفری دونوں وکیل تھے چنانچہ شام کو ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی۔ اخبار نویسوں میں سے مسعود اللہ خان، سلیم

عاصمی اور انعام اللہ جرال باقاعدگی سے آتے۔ ان سب کا تعلق پاکستان ٹائمز سے تھا، ان سے کمرہ عدالت کی ان باتوں کا بھی پتہ چلتا جو اخباروں میں شائع نہ ہوتیں۔ بھٹو کا کیس ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ میں پہنچا تو ہماری میز کے تجزیے بھی اسی زور شور سے آگے بڑھنے لگے۔ عدالتی کارروائی اور افواہیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بھٹو کو سزائے موت ہوگئی۔ ہماری عدالتوں کا مزاج تو جسٹس منیر کے فیصلے ہی سے متعین ہو گیا تھا، نصرت بھٹو کیس میں نظریۂ ضرورت نے اسے اور مستحکم کر دیا اس لیے جب بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو زیادہ تعجب نہ ہوا، حیرت تو یہ تھی کہ تین جج ایسے تھے جنہوں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا تھا۔

حلقہ کے حوالے سے یہ عرصہ زوردار بحثوں کا ہے۔ ادیبوں نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس عرصہ میں پیش کی جانے والی تخلیقات نے مزاحمتی ادب کی ایک نئی تاریخ اور نئی تعریف مرتب کی۔ منشا نے ''تماشا'' اور میں نے ''گملے میں اگا ہوا شہر'' اسی زمانے میں حلقہ کی نشستوں میں پڑھا۔ حلقہ کی نشستوں کا انداز اس زمانے میں بہت زیادہ سیاسی ہو گیا تھا۔ واضح طور پر دو گروپ بن گئے تھے اکثریت تو مارشل لا کے خلاف تھی لیکن معدودے چند مارشل لا کی حمایت بھی کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ دائیں بازو کی کچھ جماعتیں مارشل لا کی بی ٹیم بن کر اقتدار میں شامل ہو چکی تھیں۔ حلقہ کے جلسوں پر کوئی پابندی تو نہ لگی لیکن تقریباً ہر نشست میں کوئی نہ کوئی اجنبی شخص ضرور موجود ہوتا ایک بار تو ایک شخص کی بغل میں سے ٹیپ ریکارڈ بھی نکل آیا۔ لیکن خوف خاصی حد تک دور ہو چکا تھا، باہر پیپلز پارٹی اور جمہوریت پسند ورکر کوڑے کھا رہے تھے۔ خود سوزی کر رہے تھے۔ ان کا ولولہ اور ہمت دیکھ کر ادیب بھی روایتی بزدلی کی کینچلی اتار کر اپنی واضح وابستگی کے ساتھ سامنے آگئے اس وقت پورا ملک اینٹی بھٹو اور پرو بھٹو کے کیمپوں میں تقسیم تھا اور دیکھا جائے تو یہ تقسیم اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

بھٹو کو جس صبح پھانسی دی گئی میں اس دن گوجرانوالہ میں تھا۔ ہمارے کسی عزیز کی

شادی تھی، ہم لوگ تین اپریل کی شام کو وہاں پہنچے تھے۔ رخسانہ اور بچوں کو شادی والے گھر چھوڑ کر میں ادیبوں کی تلاش میں نکلا۔ اسلم سراج دین سے ملاقات ہوگئی، ہم لوگ دیر تک ایک کیفے میں بیٹھے رہے۔ وہیں محمود احمد قاضی اور دوسرے بھی آ گئے اسلم سراج دین واپسی پر مجھے چھوڑنے آئے۔ صبح سویرے معلوم ہوا کہ بھٹو کو پھانسی دیدی گئی ہے جس گھر میں ہم ٹھہرے تھے وہ اینٹی بھٹو تھا اس خبر پر وہاں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ میں بڑا بدمزا ہوا اور سوچ ہی رہا تھا کہ یہاں سے نکلوں کہ اسلم سراج دین آ گئے۔ وہ بھٹو کے حامیوں میں سے تھے ہم دونوں دل گرفتہ اور اداس اداس شہر کی سڑکوں پر نکل آئے۔ گوجرنوالہ پی این اے کے مضبوط مرکزوں میں سے تھا اور تجارتی شہر ہونے کے ناطے پیپلز پارٹی کا خاصا مخالف، ضمیمے بک رہے تھے اور شہر میں ملا جلا تاثر تھا۔ میں اور اسلم سراج دین دوپہر تک سڑکوں پر گشت لگاتے رہے، شام کو میں رخسانہ اور بچے لاہور آ گئے۔ ٹی ہاوس میں ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اگلے دن ہنگامے تو شروع ہو گئے لیکن ان میں جان نہیں تھی۔ میں اور مستنصر حسین تارڑ شام کو مینار پاکستان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کچھ لڑکے ایک سرکاری گاڑی کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگ کیسے لگائیں۔ مستنصر نے انہیں سمجھایا کہ ٹنکی سے تھوڑا پٹرول نکال کر اس سے آگ لگاؤ۔ اس زمانے میں مستنصر حسین تارڑ کا ایک سیریل ٹی وی پر چل رہا تھا اور بڑا مقبول تھا۔ اس میں مستنصر ایک رپورٹر امجد کا کردار ادا کرتا ہے۔ لڑکوں نے اسے پہچان لیا اور چلانے لگا ''امجد بھائی کی بات سنو''۔

اس سے اگلے دن میں کشور ناہید کے دفتر الفلاح گیا تو وہ باہر نکلنے کی تیاری کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''چلو شہر کا چکر لگا کر آئیں۔'' ہم نے گاڑی میں شہر کا چکر لگایا، ہنگامے ہو رہے تھے۔ دو تین دن بعد ان کا زور ٹوٹ گیا۔

بھٹو کی پھانسی کے چند روز بعد ہی اکادمی ادبیات پاکستان نے اہل قلم کانفرنس کا

انعقاد کیا۔ یہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا۔ بھٹو کی پھانسی کے فوراً بعد اس کانفرنس سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ دانشور ضیاء کے ساتھ ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ مسیح الدین صدیقی نے جو اس زمانے میں ڈائریکٹر جنرل تھے ذاتی طور پر لوگوں کو ٹیلیفون کیے، کئیوں کو دھمکی بھی دی کہ وہ سرکاری ملازم ہیں اس لیے ان کا نہ آنا نافرمانی میں شمار ہوگا۔ اس دھمکی کے باوجود بہت سارے لوگ کانفرنس میں شریک نہ ہوئے۔

میرے اور منشا کے ساتھ تو مسیح الدین صدیقی کی ایک جھڑپ اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ ہوا یہ کہ جب انہوں نے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ سنبھالا تو شہر کے ادیبوں کو چائے پر مدعو کیا۔ اس محفل میں ان کا رویہ بڑا متکبرانہ بلکہ توہین آمیز تھا۔ ممتاز مفتی اور ضمیر جعفری تو ان کے سامنے بچھے جاتے تھے، ممتاز مفتی نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ان کا بڑا کرم ہے کہ انہوں نے ادیبوں کو بلایا۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار ضمیر جعفری نے بھی اپنی تقریر میں کیا۔ اختر امان نے کوئی سوال کیا تو مسیح الدین صدیقی نے بری طرح جھاڑ کر اسے خاموش کر دیا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا، میں نے کہا ''صدیقی صاحب یہ کلاس روم نہیں ہے اور نہ ہم آپ کی چائے کے بھوکے ہیں، آپ کا رویہ انتہائی قابل اعتراض ہے''۔

میرے خاموش ہوتے ہی منشا کھڑا ہو گیا اور اس نے بھی خاصے سخت الفاظ اور لہجے میں مسیح الدین صدیقی کے رویے پر اعتراض کیا۔ مسیح الدین صدیقی نے فوراً پلٹا کھایا اور بولے۔ ''اگر آپ لوگوں کو میرے رویے سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں معافی مانگتا ہوں، اصل میں میرا یہ مطلب نہیں تھا جو سمجھا گیا''۔

محفل بدمزگی میں ختم ہوئی۔ چائے پر مسیح الدین صدیقی میرے اور منشا کے پاس آ گئے، بولے...... '' آپ نوجوان ہیں جلدی غصے میں آ جاتے ہیں''۔

چائے پی کر لوگ جانے لگے تو انہوں نے مجھے اور منشا کو روک لیا۔ بولے ''ایک کپ

چائے اور خاص میری طرف سے'' دیر تک لیپا پوتی کرتے رہے لیکن ان کے دل سے میل دور نہ ہوئی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب بھارت سے اردو پڑھانے والا ایک وفد اسلام آباد آیا۔ اکادمی نے ہر کالج کے پرنسپل کو خط لکھا کہ شعبۂ اردو کے دو سینئر اراکین کو نامزد کر کے تقریب میں بھیجا جائے۔ جمیل ملک اس دن چھٹی پر تھے میں اور فاروق علی اکادمی پہنچ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی مسیح الدین صدیقی کے ابروؤں پر بل پڑ گئے بولے۔ ''ہم نے تو سینئر اراکین کے لئے کہا تھا''۔ میں نے کہا ''ہم دونوں سینئر ہی ہیں''۔ بڑی بے رُخی سے کسی کو کہا۔ ''ان کو بٹھا دیں''۔

تھوڑی دیر میں مہمان آ گئے، ان میں ڈاکٹر محمد حسن، قاضی عبدالستار، صادق وغیرہ شامل تھے ڈاکٹر محمد حسن وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ مسیح الدین صدیقی نے افتتاحی تقریر کی اور پھر یہاں کے نمائندوں سے کہا کہ اپنا تعارف خود کروائیں۔ ہر شخص نے اپنا اپنا نام بتایا۔ ان میں فتح محمد ملک، اختر جمال، احسان اکبر، وقار بن الٰہی بھی شامل تھے۔ میری باری آئی تو میں نے بھی اپنا نام بتا دیا۔ میرا نام سن کر قاضی عبدالستار کھڑے ہو گئے، بولے...... ''ارے بھائی آپ کو کون نہیں جانتا، صحیح پوچھیے تو یہاں ہم آپ ہی کو تو ملنے آئے ہیں'' یہ سننا تھا کہ مسیح الدین صدیقی کا رویہ ایک لمحے میں بدل گیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہیں کھڑے کھڑے میری بلائیں لیتے۔ محفل کے اختتام پر وہ سیدھے میرے پاس آئے اور بولے...... ''آپ نے جانا نہیں، اسلام آباد ہوٹل میں کھانا ہے'' مجھے اس کھانے کا علم تھا اور اس سے ذرا پہلے تک صرف میں اور فاروق علی ہی مدعو نہیں تھے۔ کھانے پر ڈاکٹر محمد حسن سے ترقی پسند تحریک بھارت کی ادبی صورتِ حال اور مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر محمد حسن بہت عمدہ نقاد اور ترقی پسند تحریک کے رمز آشنا ہیں۔ اُردو تنقید میں اُن کا منفرد مقام ہے۔

اکادمی کی پہلی اہل قلم کانفرنس میں ہم لوگ شریک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن دوسری کانفرنس کے وقت ترقی پسند ادیب دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایوب میرزا کے کلینک میں صبح

سویرے میٹنگ ہوئی۔ اس میں جمیل ملک، احمد ظفر، منظور عارف، ایوب میرزا اور میں شامل تھے۔ جانے یا نہ جانے کے سوال پر کافی بحث ہوئی۔ آخر طے پایا کہ جانا چاہیے، کیونکہ میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ منظور عارف نہ جانے کے حق میں تھے لیکن اکثریت کے فیصلے کو مان کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایوب میرزا گاڑی چلا رہے تھے۔ ہم لوگ سنٹرل ہسپتال کے سامنے پہنچے تو منظور عارف نے کہا ''مرزا صاحب ذرا رک جائیں''۔

ایوب میرزا نے گاڑی روکی اور پیچھے مڑ کر پوچھا...... ''کیا بات ہے'' منظور عارف بولے...... ''وہاں میں نے آپ کی بات مان تو لی لیکن دل نہیں مان رہا۔ اگر آپ سب اجازت دیں تو میں یہاں اتر جاؤں''۔

جمیل ملک نے کہا...... ''اگر دل نہیں مانتا تو ضرور اتر جائیں'' منظور عارف گاڑی سے اتر گئے اور ہم چاروں کانفرنس میں چلے گئے۔

آخری سیشن قراردادوں کا تھا۔ افغانستان میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ روس کے خلاف مذمت کی قرارداد پیش کرنا چاہتے تھے۔ عطا الحق قاسمی نے مشتاق قمر کو آگے کیا اور اُس نے قرارداد لکھ کر پیش کر دی۔ قرارداد پڑھی گئی تو کئی لوگ اس کے مخالف تھے لیکن جرأت کون کرے۔ ہم تو ویسے ہی سرکاری ملازم تھے اور پھر معتوب بھی۔ ایوب میرزا کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ڈٹ کر اس کی مخالفت کی، ان کی تائید میں کچھ اور آواز میں بھی بلند ہو گئیں، چنانچہ قرارداد سے روس کا نام نکال کر ''بیرونی مداخلت'' کے الفاظ شامل کیے گئے۔ ''بیرونی مداخلت'' میں دونوں اطراف شامل ہو گئے۔ واپسی پر ایوب میرزا نے کہا۔ ''کانفرنس میں ہماری شرکت کا فیصلہ ٹھیک تھا'' اس کانفرنس میں کئی ترقی پسند ادیب شریک نہیں ہوئے تھے لیکن اس کے بعد والی کانفرنسوں میں تقریباً سبھی لوگ شامل تھے، ہاں لاہور سے انتظار حسین، کشور ناہید، جاوید شاہین، اکرام اللہ کسی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔

یوں تو مارشل لاء نے پورے معاشرے پر اپنے منفی اثرات مرتب کئے تھے لیکن ایک حوالے سے اس کا اثر براہ راست مجھ پر بھی ہوا۔ جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے ہمارے ادارے وفاقی وزارت تعلیم کے تحت تھے اور اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹوریٹ تھا جو اسلام آباد میں واقع وفاقی تعلیمی اداروں اور کنٹونمنٹ بورڈ میں واقع وفاقی تعلیمی اداروں کا انتظام چلاتا تھا۔ ۵ جولائی کے مارشل لا کے بعد جو پہلا انتظامی آرڈر جاری ہوا اس کے تحت کنٹونمنٹ بورڈ میں واقع وفاقی تعلیمی اداروں کو آرمی ایجوکیشن کور کے تحت کر دیا گیا۔ فنڈز وفاقی وزارت فراہم کرے گی اور انتظامی معاملات آرمی ایجوکیشن کور کے تحت ہوں گے۔ اس انتظامی تبدیلی کے پیچھے کوئی قومی مقصد نہیں تھا بلکہ خالصتاً ذاتی معاملہ بلکہ عناد تھا۔ ہوا یوں کہ اُس زمانے میں ہمارے پرنسپل ملازم حسین ہمدانی تھے، جو بڑے اُصولی آدمی تھے۔ جنرل ضیاء الحق اور جنرل چشتی کے بیٹے کالج میں داخل نہ ہو سکے کہ وہ میرٹ پر نہیں تھے۔ ضیاء الحق نے حفیظ پیرزادہ سے کہا جو اس زمانے میں وزیر تعلیم تھے لیکن انہوں نے بھی میرٹ سے بالا کام کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ ضیاء الحق نے بھٹو سے بات کی اور وزیر اعظم کے حکم پر ضیاء الحق کا بیٹا انوار الحق فسٹ ائر میں داخل ہو گیا۔ ضیاء الحق کو اس کا بڑا قلق تھا کہ بیٹے کے داخلے کے لئے اتنی تگ و دو کرنا پڑی، چنانچہ مارشل لا لگتے ہی اس نے یہ آرڈر جاری کر دیا جس کے تحت مالی معاملات تو وفاقی وزارت تعلیم کے پاس رہے اور انتظامی معاملات جن میں داخلہ پالیسی اور اساتذہ کی تبدیلیاں وغیرہ تھیں، آرمی ایجوکیشن کور کے پاس آ گئیں۔ میں اس کو کمپنی کی حکومت کہتا تھا کہ جس طرح کمپنی بہادر کے افسر مال کمانے ہندوستان آتے تھے اسی طرح آرمی ایجوکیشن کور کے افسر دو تین سالوں کے لیے موج میلہ کرنے کے لیے اس نظامت میں آتے ہیں اور اپنا وقت گزار کر یہ جا وہ جا۔ انہیں ان اداروں کے اساتذہ سے ملنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ ان کی پہنچ صرف پرنسپل تک ہوتی ہے، چنانچہ نچلی سطح پر کیا ہو رہا ہے اس کی انہیں خبر نہیں۔ پرنسپل جو کہہ دے وہ ٹھیک ہے ملازم حسین ہمدانی بڑے کمال

کے آدمی تھے۔ ڈرامے سے انہیں خاص شغف تھا۔ ہمارے کالج کا مجلہ سرسید ین معمول کے مطابق نکلتا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے اس کی کوئی علیحدہ شکل بناؤ میں دو تین دن سوچتا رہا، پھر پاکستانی ادب کا خاکہ بنایا، ابتدا میں یہ صرف ایک جلد میں تھا لیکن بعد میں یہ کام پھیلتا گیا اور پاکستانی ادب کا یہ انتخاب سات جلدوں میں چھپا، ہمدانی صاحب نے خاکہ کو بڑا پسند کیا لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ فنڈز کہاں سے لیے جائیں۔ طے ہوا کہ اس میں سرکاری رقم استعمال نہ کی جائے بلکہ چندہ اکٹھا کیا جائے۔ اس زمانے میں بریگیڈیر نصیر الدین آرمی ایجوکیشن کور کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ہمدانی صاحب نے ان سے بات کی تو انہوں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور کہا کہ کاغذ اور کتابت کے اخراجات آپ برداشت کریں۔ چھپوائی اور بائنڈنگ کے اخراجات آرمی پریس ادا کرے گا۔ اس سے ہمارا بوجھ آدھا رہ گیا۔ ہمدانی صاحب نے چارسدہ پیپر ملز سے بات کی کہ کاغذ سستا مل جائے۔ مل والوں نے بھی تعاون کیا اور تقریباً آدھی قیمت پر ایک ٹرک بھجوا دیا۔ ٹرک رات کے وقت کالج پہنچا۔ چوکیدار نے مجھے فون کیا۔ ہمدانی صاحب بھی آ گئے۔ ٹرک کے ساتھ صرف کلینر تھا چنانچہ ہمدانی صاحب میں اور چوکیدار نے ٹرک خالی کیا اور کاغذ کو ایک کمرے میں رکھا۔ ساری رات کاغذ کے بنڈل اٹھا اٹھا کر ہماری کمریں دوہری ہو گئیں۔

انتخاب کی ذمہ داری میری تھی۔ کوشش تو بہت کی کہ اس کی تشہیر نہ ہو لیکن ہمارے اپنے شعبہ کے ساتھیوں اور کچھ دوسرے ذرائع سے بات نکل گئی۔ نوائے وقت میں خبر چھپی کہ ایک فوجی ادارے کے تحت پاکستانی ادب کا انتخاب ایسا شخص کر رہا ہے جو کمیونسٹ اور اسلام دشمن ہے۔ دوسرے دن بریگیڈیر نصیر الدین نے ہمدانی صاحب اور مجھے اپنے دفتر بلایا اور کہا کہ ضیاء الحق نے پوچھا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم فہرستیں ساتھ لے گئے تھے۔ نصیر الدین نے ایک فہرست دیکھی اور بولے ”باقی تو ٹھیک ہے لیکن یہ فیض اور فراز کو اس میں سے نکال دیں“ میں

نے کہا ...... ''نکالنے سے ان لوگوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن دس سال بعد ہمارا انتخاب مشکوک ہو جائے گا اور لوگ کہیں گے یہ کیسا انتخاب ہے جس میں فیض موجود نہیں''......

کہنے لگے ...... ''پھر کیا کریں''

میں نے کہا ...... ''آپ یہ دیکھیں کہ جو کچھ ہم چھاپ رہے ہیں وہ پاکستان یا نظریہ پاکستان کے خلاف نہ ہو اور یہ بھی ہے کہ اس وقت سنسر ہے انتخاب چھپنے سے پہلے لازماً سنسر کے مراحل سے گزرے گا''۔

کہنے لگے ...... ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی طرف سے بھی کسی سے اس کی پڑتال کرالیں''۔

میں نے کہا ...... ''ٹھیک ہے''۔

طے ہوا کہ کرنل غلام سرور جو اُس زمانے میں نیشنل ڈیفنس کالج کے چیف لائبریرین تھے۔ ان کو سارا مسودہ بھیجا جائے۔ کرنل غلام سرور دائیں بازو کے نظریات کے حامی تھے لیکن ان کا یہ پہلو قابل تعریف ہے کہ انہوں نے کسی بھی شخص کی شمولیت پر اعتراض نہ کیا اور سارے مسودے کو درست قرار دیا۔ اس کے بعد کتابت کا مرحلہ طے ہوا اور سارا کتابت شدہ مواد سنسر کے لیے صوبائی محکمہ اطلاعات کو پیش کیا گیا۔ اس زمانے میں یہ کام ثناء اللہ اختر کے ذمہ تھا۔ انہوں نے سارا مواد پڑھا اور دو ایک جگہوں پر نشان لگائے۔ ایک نشان خلیفہ عبدالحکیم کے ایک جملے پر تھا جو پاکستانی ثقافت سے متعلق تھا۔ میں نے ثناء اللہ اختر سے کہا خلیفہ صاحب کو تو فوت ہوئے بھی مدتیں گزر گئیں۔ یقیناً یہ جملہ انہوں نے مارشل لا کے بارے میں نہیں لکھا لیکن وہ نہ مانے مجبوراً جملہ کاٹنا پڑا۔ یہ خالی جگہ اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

اُس زمانے میں سنسر کے کئی لطیفے زبان زد عام تھے۔ ایک لطیفہ جو بہت مشہور ہوا یہ تھا کہ سنسر کے لیے کوئی رسالہ پیش کیا گیا۔ سنسر افسر نے سارا مواد پڑھنے کے بعد کہا باقی تو ٹھیک

ہے لیکن ایک جملہ ٹھیک نہیں۔ جملہ تھا ''وہ ننگے پاؤں کمرے میں داخل ہوا'' سنسر افسر کی تجویز تھی کہ اس میں سے ننگے کا لفظ نکال دیا جائے۔

ایک طرف پابندیوں کا یہ حال تھا لیکن دوسری طرف ردعمل بھی اتنا ہی شدید تھا۔ کوڑے کھاتے ہوئے لوگ مارشل لا مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ دیواروں پر چاکنگ ہو رہی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق اور شام کی نشستوں میں کھل کر مارشل لا کے خلاف بحثیں ہوتیں۔ اسی دور میں احتساب کے دو شمارے شائع ہوئے۔ حسن عباس رضا نے خیابان کے تین چار شمارے نکالے۔ ان اور دوسرے رسائل میں چھپنے والا مواد جمہوری آزادیوں اور مارشل لا مخالفت کے موضوع سے متعلق تھا۔ ہفت روزوں میں سے الفتح اور دوسرے کئی رسالے کھل کر تنقید کر رہے تھے اور آئے دن ان کی بندش کے حکم نامے جاری ہو رہے تھے۔ ایک رسالہ بند ہوتا تو کسی اور نام سے دوسرا جاری ہو جاتا۔

اسی زمانے میں حسن عباس رضا کے رسالے ''خیابان'' پر بھی پابندی لگی اور حسن رضا کو گرفتار کر لیا گیا۔ خیابان کے شمارہ کے بارے میں ڈاکٹر بشریٰ نگار نامی کسی خاتون نے ضیاء الحق کو خط لکھا۔ یہ فرضی نام تھا جس کے پیچھے کچھ اور لوگ تھے۔ جن کو پرچے سے زیادہ پرچہ کی معاون مدیرہ محمودہ غازیہ سے دلچسپی تھی۔ جن نظموں پر اعتراض اٹھایا گیا وہ مراٹھی سے ترجمہ تھیں۔ یہ بند اچھالا گیا......

اب جو گھر میں
پاگل کتا گھس آئے
لوگ بے چارے
ڈر کے مارے
گھر ہی چھوڑ کے چل دیتے ہیں

ایوب میرزا کے کلینک میں مدیرہ نے ہمیں بتایا کہ یہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں ان سے ملوں۔

مجھے سمجھ نہ آئی میں نے بھولپن سے کہا...... ''تو مل لیں''۔

ایوب میرزا کو بڑا غصہ آیا، بعد میں مجھے کہنے لگے...... ''یا تم تو بالکل ہی گھامڑ ہو''۔

○

۷۷ء کے مارشل لاء نے مجموعی زندگی پر جو اثرات مرتب کئے ان سے غیر سنجیدہ رویے کو فروغ ملا۔ بھٹو نے روٹی، کپڑا، مکان اور اسلامی سوشلزم کو بے توقیر کیا تو ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر یہی کچھ کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عام آدمی کے لاشعور میں ایک مایوسی کا رویہ پیدا ہو گیا کہ شاید ہمارے مسائل کا حل کہیں نہیں۔ حلقہ میں سنجیدہ علمی اور فنی بحثوں کی بجائے سیاسی بحثوں نے زور پکڑا۔ تخلیق کی فنی حیثیت کو جانچنے کی بجائے گفتگو کا محور عموماً یہ ہوا کہ یہ مزاحمتی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسی بہت سی انجمنیں وجود میں آ گئیں۔ جنہوں نے بڑے ہوٹلوں میں کتابوں کی رونمائی شروع کر دی۔ ان فنکشنوں میں تنقید کا عجب وغریب نمونہ سامنے آیا۔ ہر کتاب اور ہر مصنف عظیم ٹھہرا۔ اگر کسی نے غلطی سے تھوڑی سی تنقید کر دی تو اسے برا کہا گیا۔ اسی طرح کے ایک فنکشن میں جو منیر احمد شیخ کے مجموعے کی رونمائی کے لیے مخصوص تھا جب مظفر علی سید نے تنقیدی مضمون پڑھا تو اکثر نے اس کا برا منایا۔ ضیاء جالندھری نے فنکشن کے اختتام پر سید تقی کے حوالے سے سنایا کہ کتاب کی رونمائی کی تقریب سہرے بندی جیسی ہوتی ہے۔ اگر کوئی سہرے بندی کے موقع پر دولہا کا سہرا پڑھتے ہوئے اس کی خامیاں گنوانی شروع کر دے تو اسے بد ذوقی میں شمار کیا جاتا ہے سید تقی کا واقعہ یہ تھا کہ ان کی کتاب ''تاریخ میر انظریہ'' کی تقریب تھی۔ ضیا جالندھری نے بتایا کہ میں نے بھی مضمون پڑھنا تھا۔ دوپہر کو تقی صاحب کا فون آیا کہ ضیاء صاحب تقریب کی مثال سہرا بندی کی سی ہے۔ سہرا بندی میں اگر کوئی دولہا کی خامیاں

گنوانے لگے تو یہ ٹھیک نہیں۔ آپ کو اگر کوئی اعتراض ہو تو بعد میں مجھ کو اکیلے میں بتا دیجیے۔ تقریب میں کوئی ایسی بات نہ کہیے گا۔ اس رویے نے نہ صرف ہماری تنقید کو خراب کیا بلکہ حلقہ میں ہونے والی بحث کو بھی نقصان پہنچایا۔ چنانچہ حلقہ میں کسی تقریب کا اہتمام کروانے کی بجائے ایسی انجمنوں کے سٹیج کو استعمال کیا جانے لگا۔ ان انجمنوں کا مقصد ایک طرف تو ادیبوں کی سنجیدہ بحثوں کو ختم کرنا اور دوسری طرف حلقہ جیسی سنجیدہ تنظیموں کو نقصان پہنچانا تھا۔ اسی نوعیت کی ایک تنظیم جو اپنی طرح کی تنظیموں میں اولیت رکھتی ہے، دائرہ کے نام سے قائم کی گئی۔

شالیمار چوک میں حیدر روڈ پر دوائیوں کی ایک کمپنی تھی۔ جس کے اوپر عنایت کبریا رہتے تھے۔ میرا ان سے پہلے کوئی تعارف نہ تھا۔ مارشل لا کا ابتدائی زمانہ تھا۔ شالیمار کی بحثیں عروج پر تھیں، ہر شام محفل کے اختتام پر منصور قیصر ایک دو لوگوں کو لے کر کہیں غائب ہو جاتے۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم شالیمار سے اٹھ کر جی ٹی ایس کے اڈے کے باہر ٹھیکی لگاتے پھر پیدل مری روڈ سے ہوتے ہوئے کوہائی بازار اور راجا بازار تک آتے، راستے میں ساتھی اپنی اپنی راہوں پر ہو لیتے۔ آخر میں، میں اور احمد داؤد رہ جاتے۔ اب یہ ہونے لگا کہ روز ایک آدھ کم ہوتا ایک دن میری باری بھی آگئی۔ منصور قیصر نے مجھے کہا کہ ذرا رک جانا ایک جگہ جانا ہے۔ وہ مجھے عنائت کبریا کے پاس لے گئے وہ بڑے تپاک سے ملے، باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا آگیا وہ اکیلے ہی وہاں رہتے تھے۔ باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ اس وقت ایک ادبی انجمن کی بڑی ضرورت ہے۔ میں نے کہا حلقہ جو موجود ہے۔ آپ وہاں آئیں اور آپ کے پاس جو تجاویز ہیں وہاں پیش کریں حلقہ کو مزید فعال بنایا جا سکتا ہے۔ بولے نہیں میرا ٹارگٹ کچھ اور ہے۔ مارشل لا میں ہمیں کچھ کام کرنا چاہئے۔ میں نے کہا اس کا سیدھا طریقہ تو یہ ہے کہ مارشل لا کے خلاف ایک تنظیم بنائیں اور دو چار فوجی ٹھکانوں پر بلاسٹ کروا دیں۔ عنائت کبریا میرا منہ دیکھنے لگے بعد میں منصور قیصر نے بتایا کہ میرے جانے کے بعد وہ اُس سے کہنے لگے...... کہ یہ کس شخص کو

لے آئے تھے۔ یہ تو مروا دے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں حلقہ کی موجودگی میں کسی دوسری تنظیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اور میرے خیال میں اس طرح کی کسی بھی کوشش کا مقصد حلقہ کی فعالیت کو کم کرنا تھا۔ بعد میں میری رائے صحیح ثابت ہوئی۔

دائرہ بن گیا ہمارے کچھ دوست بڑے ذوق وشوق سے اس میں شریک ہوئے، لیکن میں اس کی کسی محفل میں نہیں گیا۔ حامد جیلانی میرے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ عنائت کبریا کے بھی دور پار کے رشتہ دار تھے۔ پیپلز پارٹی کے پرجوش حامی تھے۔ ان کے خلاف کیس درج ہوا۔ وہ عنائت کبریا کے پاس آ گئے۔ اگلے دن نیچے اترے تو خفیہ والوں نے انہیں دبوچ لیا۔ پھر عرصہ دراز تک ان کی خبر نہ ملی، ملے تو ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ یہی صورت نذیر بلوچ کے ساتھ بھی ہوئی۔ وہ لیبیا سازش کیس میں نامزد تھے۔ اپنی دانست میں انہوں نے یہ پناہ گاہ ڈھونڈی تھی لیکن نیچے اترتے ہی وہ بھی خفیہ والوں کی زد میں آ گئے۔ آہستہ آہستہ دائرہ کا طریقہ کار بدلتا گیا۔ بڑے ہوٹلوں میں فنکشن کی ابتدا اُسی نے کی۔ اُس کے فنڈز کہاں سے آتے تھے اور عنائت کبریا کی دلچسپی کے اسباب کیا تھے۔ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی تھیں۔ بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ وہ اس سے ذاتی فائدے اٹھاتے ہیں۔ وزیروں کو بلا کر اور ان سے صدارت کرا کے انہوں نے اپنی دواؤں کی فیکٹری کے لیے اسلام آباد میں کمرشل پلاٹ حاصل کیا ہے اور بھی کئی طرح کے فائدے اٹھائے ہیں۔ خود عنائت کبریا کا حال یہ تھا کہ ان کی فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرنے والی ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ وہاں کسی کو تین چار ماہ سے زیادہ مسلسل ملازمت نہیں کرنے دی جاتی۔ کسی نہ کسی بہانے نکال کر ہفتہ دو ہفتہ کا خلا پیدا کر دیا جاتا ہے تاکہ ملازمت مسلسل نہ رہے اور ملازم کو فوائد حاصل نہ ہو سکیں۔

عنائت کبریا کو دو ایسے شخص مل گئے، جنہوں نے اس کے مقاصد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ غضنفر مہدی اور رشید نثار تھے۔

دائرہ کے انتظامی معاملات غضنفر مہدی نے سنبھال لیے اور رشید نثار سکرپٹ رائٹر بن گئے۔ شالیمار پلازہ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ شام تھی۔ عنائت کبریا نے بہت اچھا مضمون پڑھا، مجھے شرارت سوجھی، فنکشن کے اختتام پر چائے پیتے ہوئے میں نے عنائت کبریا سے کہا ''آپ کا مضمون بہت اچھا تھا'' ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ جواباً کچھ کہتے، میں نے کہا......

''کس نے لکھا تھا؟''

عنائت کبریا کی کھلی ہوئی باچھیں اسی حالت میں رہ گئیں، میں یہ جا وہ جا۔ دائرہ نے وزیروں کو بلانے کی جو روایت ڈالی، اس نے اسلام آباد میں اس طرح کی کئی انجمنیں پیدا کر دیں۔ یہ سرکار سے قریب ہونے کا آسان ترین طریقہ تھا۔ وزیروں کو بھی تصویریں چھپوانے اور تقریریں کرنے کا شوق ہوتا ہے پھر ایک ایسا پلیٹ فارم بھی مہیا ہو جاتا ہے جہاں پڑھے لکھے لوگوں تک بات پہنچائی جا سکتی ہے۔ نتیجتاً بعض سرکاری ادارے بھی ایسی تنظیموں کی سرپرستی کرنے لگے۔ بعد میں تو یہ باقاعدہ کاروبار بن گیا۔ کتاب کے مصنف سے اخراجات وصول کیے جاتے، ہوٹل والوں سے ریبیٹ لیا جاتا۔ باہر سے کوئی مہمان آتا تو ٹکٹ اور قیام کا خرچہ اکادمی برداشت کرتی۔ کارڈ تک سپانسر ہوتے چنانچہ ہر فنکشن منفعت بخش کاروبار بن گیا اور یہ طریقہ ابھی تک قائم ہے۔ اسلام آباد میں ایسی کئی انجمنیں ہیں جن کا کام اکادمی یا مقتدرہ کے ہر نئے چیئرمین کے اعزاز میں تقریب منعقد کرانا ہے اور بعد میں فائدے اٹھانا ہے، ان انجمنوں کی اہمیت کیا ہے، میں صرف دو واقعے بیان کرتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد افضل وزیرِ تعلیم تھے انہوں نے کتابوں کے فروغ کے لیے ایک میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں منشا یاد، اعجاز راہی، عنایت کبریا، غضنفر مہدی اور میں شریک ہوئے۔ اتفاق سے ہمارے پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر افضل کے پاس ایک امریکی وفد آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بھی اندر بلوا لیا۔ ان کی گفتگو ختم ہوئی تو انہوں

نے امریکیوں سے ہمارا تعارف کرایا۔ عنایت کبریا اور غضنفر مہدی کی باری آئی تو ڈاکٹر افضل نے کہا ہمارے ادب کے فروغ میں ان دونوں کا بڑا کردار ہے انہیں آپ اسلام آباد کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز سمجھ لیں۔ امریکن بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے جاتے جاتے عنایت کبریا سے ان کا فون نمبر مانگ لیا۔

دوسرا واقعہ گوپی چند نارنگ کی اسلام آباد آمد سے متعلق ہے۔ منیر احمد شیخ نے مجھے فون کیا کہ دوپہر کو نارنگ کے اعزاز میں دائرہ کی طرف سے کھانا دیا جا رہا ہے تم نے ضرور آنا ہے"۔ میں نے کہا "شیخ صاحب یہ آپ نے دائرہ کو کہاں شامل کرلیا"۔ بولے "یار میں نارنگ کے اعزاز میں دعوت کرنا چاہتا تھا لیکن میری اتنی استطاعت نہیں۔ اب دائرہ والے دلچسپی لے کر آدمیوں کو بلا رہے ہیں"۔ دعوت میں غضنفر مہدی اور عنایت کبریا آگے آگے تھے، چنانچہ نارنگ نے دہلی جا کر کہا یہ دونوں اسلام آباد کے سب سے بڑے ادیب ہیں، اس پر کسی نے جملہ لگایا اسی طرح جیسے نارنگ بھارت کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

○

رابطہ کا ڈول ممتاز مفتی نے ڈالا تھا۔ یہ غیر رسمی سی ادبی ملاقاتیں تھیں۔ ہر مہینے اراکین میں سے کسی کے گھر ون ڈش پارٹی ہوتی۔ جس میں ایک نثری اور ایک شعری تخلیق پڑھی جاتی۔ مختصر سی گفتگو ہوتی۔ گفتگو کا انداز حلقہ سے بہت مختلف تھا۔ رابطہ کا پیٹرن تو وہی تھا لیکن یہاں گفتگو تنقید سے زیادہ فن کی تفہیم کے حوالے سے ہوتی۔ ابتدا میں اس کے اراکین کی تعداد بیس تھی لیکن میزبان کو اپنی طرف سے کچھ مہمان بلانے کی اجازت تھی۔ شروع شروع میں تو ون ڈش کی پابندی رہی لیکن آہستہ آہستہ یہ یزید کا دسترخوان بن گیا۔ شہاب صاحب کی باری آئی تو انہوں نے سختی سے ون ڈش کی پابندی کی سب کو دال روٹی کھلائی۔ کچھ عرصہ ون ڈش ہی چلتی رہی لیکن آہستہ آہستہ پھر وہی پرانی ڈگر شروع ہوگئی۔

قدرت اللہ شہاب سے میری پہلی ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی تھی۔اس زمانے میں وہ وفاقی سیکرٹری تعلیم تھے۔بھٹو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ہم لوگ اپنے کالجوں کو قومیانے کے لیے کوشش کررہے تھے۔میں نے کسی سے کہہ سن کران سے وقت مانگا۔میں غلام سرور اور ہمارے دو اور ساتھی ان کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوئی غیر ملکی وفد ان کے کمرے میں موجود ہے۔ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ہم انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔شائد آدھ پون گھنٹہ بعد شہاب صاحب فارغ ہوئے۔خود انتظار گاہ میں آئے اور معذرت کی کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ان کے اس رویے سے ہم بہت متاثر ہوئے۔اس سے پہلے میں ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔رائٹرز گلڈ کے حوالے سے ان کے کردار پر اکثر تنقید ہوتی تھی۔ پھر جب ہم نے دستاویز نکالا تو مظہر الاسلام نے اپنے پہلے ہی اداریے میں ان پر اور مفتی صاحب پر بڑی سخت تنقید کی۔میں نے بھی اپنے مضمون میں ان دونوں کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔دستاویز کے صرف تین شمارے نکلے،اس کا ڈیکلریشن تو عزیز الرحمٰن کے نام تھا مگر مدیر مظہر الاسلام تھا۔تینوں شماروں میں کسی نہ کسی حوالے سے شہاب صاحب اور مفتی صاحب تنقید کا نشانہ بنے۔بعد میں مظہر الاسلام نے مفتی صاحب سے معافی مانگ لی اور انہی کے ذریعے وہ شہاب صاحب تک پہنچا۔انہوں نے اسے وزارت میں نوکری دلوادی۔یہیں سے وہ لوک ورثہ میں آیا۔

دستاویز والے مضامین کے بعد میں پہلی بار شہاب صاحب سے ملا تھا لیکن انہوں نے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ جب ہم ان کے کمرے سے نکل رہے تھے تو وہ ہمیں کاریڈار میں چھوڑنے آئے اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے ''کبھی کبھی ملتے رہا کریں'' رابطے نے ملنے کی یہ صورت پیدا کردی اور ہر ماہ ان سے ملاقات ہونے لگی۔وہ اس زمانے میں شہاب نامہ لکھ رہے تھے۔رابطہ کے اجلاسوں میں انہوں نے اس کے کئی باب پڑھ کر سنائے۔ہم اس زمانے میں اپنے کالج میگزین سرسیدین کا اقبال نمبر نکال رہے تھے۔یہ سال اقبال صدی کے طور پر منایا جارہا تھا

صاحب منہ کھولے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے پردہ غیب سے کوئی عجب شے نمودار ہونے والی ہے۔
شہاب صاحب کے قریبی دوست انہیں بت کی طرح پوجتے تھے۔ اوران کی ہر بات پر مرید کی
طرح سر دھنتے تھے لیکن ان کی بعض باتیں مشکل ہی سے ہضم ہوتی تھیں۔ رابطہ میں جب انہوں
نے شہاب نامہ میں سے اسرائیل کے سفر کا حال پڑھا تو کچھ یہی کیفیت تھی۔ اتفاق سے ان
دنوں وزیر آغا بھی پنڈی آئے ہوئے تھے اور رابطہ کے اس اجلاس کی صدارت بھی انہوں نے
ہی کی تھی۔ محفل میں تو اس حوالے سے زیادہ گفتگو نہ ہوئی لیکن دوسرے دن وزیر آغا کہنے لگے
"آپ کا کیا خیال ہے اس سفر کے کتنے واقعات سچے ہیں۔" میں نے کہا...... "اس میں بڑا
مبالغہ ہے۔ اول تو یہ کہ کوئی غیر عربی اتنے دن بھیس بدل کر اسرائیلی علاقے میں رہے...... اور
خفیہ والوں کو خبر نہ ہو...... اور دوسرے وہ اتنی آسانی سے وہاں کے مدرسوں کا دورہ کر آئے

"شہاب نامہ کے بارے میں ہماری رائے یہ تھی کہ شہاب صاحب کی اکثر کہانیاں اس میں
دوبارہ شامل ہوگئی ہیں۔ یہ خرابی ہر اُس شخص کے ساتھ ہے جو افسانے لکھتا ہے۔ مفتی جی کے
"علی پور کا ایلی" اور "الکھ نگری" میں اُن کے بے شمار افسانے دہرائے گئے ہیں۔ یہی صورت
انتظار حسین اور عبداللہ حسین کے ناولوں کی بھی ہے۔

رابطہ کے ذریعے جس دوسرے شخص سے قربت ہوئی اور جس کی شخصیت کی مٹھاس اب تک
محسوس ہوتی ہے وہ ممتاز مفتی تھے۔ مفتی صاحب میں جمال اور جلال کا ایسا امتزاج تھا جو بہت کم
لوگوں میں نظر آتا ہے۔ شہاب صاحب سراپا جمال تھے۔ مفتی صاحب بھی زیادہ تر جمال تھے لیکن
دو دفعہ مجھے ان کے جلال کو دیکھنے کا موقع ملا۔ رابطہ کے انتظامی معاملات میں منشا سے ان کے
اختلافات ہوگئے۔ منشا یوں تو مفتی صاحب کا بڑا معتقد تھا اور یوں بھی اس کی شخصیت میں نفاست
کا پہلو بہت نمایاں ہے لیکن معلوم نہیں کیا ہوا وہ بھی اکڑ گیا، مجھے مفتی صاحب نے بلایا میں گیا تو وہ
بہت غصے میں تھے۔ بولے 'منشا جانتا نہیں میں کیا ہوں' میں نے بڑی مشکلوں سے انہیں ٹھنڈا کیا

اور طے ہوا کہ تین اراکین کی ایک خصوصی کمیٹی بنائی جائے جو اس مسئلے کو حل کرے۔ کمیٹی میں جمیل جالبی، ضیا جالندھری اور میں شامل تھے۔ چند دنوں میں مفتی صاحب کا غصہ اتر گیا اور معاملات ٹھیک ہو گئے۔ ممتاز مفتی اپنی نسل کے ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نئے لکھنے والوں سے اپنا رابطہ آخر دم تک قائم رکھا۔ مرنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے انہوں نے حلقہ ارباب ذوق میں اپنا افسانہ پڑھا۔ بعض نوجوانوں نے افسانے پر بڑی سخت تنقید کی، لیکن مفتی صاحب کے ابروں پر بل بھی نہ پڑا۔ اس معاملے میں ان کی قوت برداشت بہت زیادہ تھی۔ یہ شاید حلقہ کی ٹریننگ تھی۔ مجھے یاد ہے بہت پہلے وہ ایک بار حلقہ میں افسانہ پڑھنے آئے افسانہ اچھا تھا، لیکن اس زمانے میں ہم لوگوں کو اپنی سینئر نسل خواہ مخواہ بری لگتی تھی۔ ہم لوگوں نے جن میں سمیع آہوجہ، مظہر الاسلام اور میں شامل تھے۔ افسانہ پر بڑی تنقید کی، شاید کچھ ذاتی باتیں بھی ہوئیں، لیکن مجال ہے مفتی صاحب کے چہرے پر کوئی تاثر آیا ہو۔ جلسہ ختم ہوا تو وہ ہمارے ساتھ چائے پینے شالیمار میں چلے آئے اور اس دوران حلقہ کی تنقید کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

جس زمانے میں، میں ان کے زیادہ قریب ہوا وہ افسانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھتے تھے، کہتے تھے کچن چلانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ مجھے ہمیشہ ڈانٹتے کہ تم نے خود کو صرف افسانے تک محدود کر لیا ہے کچھ اور بھی لکھو اور دوسرے یہ کہ لاہور کے پرچوں تک خود کو محدود نہ کرو، کراچی اور دوسرے شہروں سے نکلنے والے پرچوں میں بھی افسانے بھیجو۔ میری تنقید نگاری پر بہت چڑتے تھے، کہتے تھے افسانہ نگار کو نقاد ہونے سے بچنا چاہیے۔ یہ علمی کام ہے عادت پڑ جائے تو افسانے کا نرول پن ختم ہو جاتا ہے۔ ادب کے ساتھ ساتھ انہیں ہومیوپیتھی اور روحانیت سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ مجھے بھی ایک دو بار الرجی کی دوا دی، لیکن مجھے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ان کی روحانیت بابوں تک محدود تھی۔ جس میں کرشماتی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ ان ہی کے توسط سے میں پروفیسر سعید اختر سے ملا۔ گوجر خان میں رہتے۔ مجھے بار بار کہتے کہ ان سے ضرور ملو۔ میں ایک

دن فون کر کے گوجر خان پہنچ گیا۔ پروفیسر سعید اختر ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد رہ چکے ہیں۔ اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس راہ پر چل نکلے ہیں۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں تصور وقت پر کچھ الجھنوں کا شکار تھا۔ میں نے اس موضوع پر ان سے گفتگو کی۔ ادب کے استاد ہونے کی وجہ سے وہ بات تو سمجھ رہے تھے لیکن ان کے جوابات سے میری تسلی نہ ہوئی۔ انہوں نے مجھے کچھ ذاتی باتیں بھی بتائیں جو بعد میں غلط ثابت ہوئیں۔ تصور وقت پر میرا ایک مکالمہ باغ حسین کمال سے بھی ہوا۔ باغ حسین کمال سے میری واقفیت اس زمانے سے تھی جب وہ اصغر مال کالج میں اردو کے استاد تھے۔ پھر وہ چکوال چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ بعد معلوم ہوا کہ روحانی سفر نے ان کی شخصیت ہی بدل دی ہے۔ وفات سے ایک سال پہلے وہ پنڈی آئے تو ان کے بیٹے تابش کمال کے توسط سے ان سے ایک لمبی ملاقات ہوگئی۔ ادھر ادھر کی باتوں سے نکل کر میں اپنے موضوع پر آ گیا اور ان سے تصور وقت کی وضاحت چاہی وہ بھی کوئی معقول جواب نہ دے سکے بس کچھ روحانی قصے سنا کر چپ ہو گئے۔ مفتی صاحب بھی روحانیت کے حوالے سے منطقی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ انہیں روحانیت کا وہ پہلو مرغوب تھا جس سے انہونے واقعات کی نشاندہی ہو، انہونی کو سمجھنے کی خواہش ان کے اکثر افسانوں میں بھی ملتی ہے۔

ایک بار منٹو کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ مفتی نے کہا منٹو ایک شعبدے باز تھا، خود ہی کوشش کر کے مقدمے بنواتا تھا تاکہ شہرت ملے ورنہ وہ افسانہ نگار ہی کیا جو پکڑا جائے، مجھے دیکھو میں اپنے افسانوں میں جنس کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کر جاتا ہوں، مجال ہے کہیں کوئی گرفت ہو جائے، یہ بات سچ بھی تھی مفتی صاحب کو اپنا مفہوم لفظ کے باطن میں چھپانے کا فن آتا تھا۔ تصور لذت کے حوالے سے ایک بار ان سے بڑی طویل گفتگو ہوئی، کہنے لگے میں اور بانو قدسیہ مل کر کوک شاستر لکھنا چاہتے تھے، مرد کی لذت کا حصہ میں نے اور عورت کی لذت کا حصہ بانو قدسیہ نے لکھنا تھا لیکن ہمارا یہ منصوبہ ادھورا ہی رہ گیا۔ مفتی صاحب ہی کے توسط سے

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے بھی رابطہ میں کئی ملاقاتیں ہوئیں ۔ پرانے قصہ گو کی جو تعریف اور روایت ہم تک پہنچی ہے اشفاق احمد اس پر پورے اترتے ہیں ۔ایک بار رابطہ کی محفل میں کسی نے ان سے روم کے سفر کا پوچھ لیا ، اشفاق احمد ایک گھنٹہ سے زیادہ بولتے رہے اور سامعین دم سادھے سنتے رہے۔قصہ ختم ہوا تو انور زاہدی میرے کان میں کہنے لگے...... ''معلوم نہیں اس میں سے سچ کتنا ہے''۔

مفتی صاحب طعنے دے دے کر لکھواتے تھے ۔رابطہ میں کچھ پڑھے دیر ہو جاتی تو پیچھے پڑ جاتے کہتے لکھو لکھو...... لکھنا ہی ہماری زندگی ہے جیتے جی مردہ نہ بنو رابطہ کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ اس بہانے ہر ماہ کچھ نہ کچھ سنا جائے ، کچھ نہ کچھ لکھا جائے ۔ کہتے تھے حلقہ کی تنقید بڑی علمی ہو گئی ہے پھر ہنستے ''علموں بس کریں او یار'' مفتی صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ مقامی حضرات کے علاوہ بہت سے لوگوں سے ان کی خط و کتابت تھی ۔ ایک بار کہنے لگے ''میں نے ایک شخص کے سوا کبھی کسی کو عیدی نہیں دی''۔

میں نے پوچھا...... ''وہ خوش نصیب کون ہے؟

بولے...... ''میرا ڈاکیا، میری تو زندگی ہی ڈاک پر ہے''

مفتی صاحب کے ملنے والوں میں ایک بڑی تعداد خواتین کی بھی تھی ۔وہ جانے ان سے کیا باتیں کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کی گرویدہ ہو جاتیں ۔پہلی بار رابطہ کا کھانا میرے یہاں ہوا تو اس زمانے میں، میں کشمیری بازار میں رہتا تھا۔ہال میں بنے ہوئے گنبد کو دیکھ کر بھی متاثر ہوئے ۔ہم ہر چھ مہینے بعد اسے دھوتے تھے اس لیے اس کی چمک دمک اسی طرح قائم تھی۔ مفتی صاحب کھانے کی پلیٹ لے کر گنبد کے چبوترے پر بیٹھ گئے ۔پھر میری بیوی رخسانہ سے کہنے لگے...... ''یہ تاج محل ہے اور تم ممتاز محل''

مفتی صاحب بڑی ہمت والے شخص تھے۔ گردے کے آپریشن کے بعد اس حالت

ہیں رابطے کی مجلسوں میں آتے تھے کہ نلکی لگی ہوئی ہے۔ لیکن مجال ہے ان کی شوخی میں کوئی فرق پڑے۔ مرنے سے شائد دو تین دن پہلے رابطہ میں ان کی نوے ویں سالگرہ منائی گئی۔ مفتی صاحب کی صورت سے لگ رہا تھا کہ خاصے بیمار ہیں مگر ان کی چہلیں اسی طرح تھیں۔ ایک ایک کا نام لے کر جملہ بازی جاری تھی۔ اس وقت کسی کو اندازہ بھی نہ تھا کہ ہم آخری بار انہیں دیکھ رہے ہیں۔

یوں تو مفتی صاحب کے کئی مرید اور مریدنیاں تھیں لیکن ڈاکٹر ابدال بیلا میں ان کی بہت سی باتیں تھیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مفتی جی کی کراماتی روحانیت پرستی کے پہلو بہ پہلو ابدال بیلا شریعت کا بڑا پابند ہے۔ وہ رابطہ کا باقاعدہ رکن تھا۔ اس حوالے سے وہ جب بھی اسلام آباد میں ہوتا ہر ماہ اس سے ملاقات ہوتی۔ اس نے مفتی جی پر ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے حق مریدی خوب نبھایا۔ پیشہ کے اعتبار سے تو وہ فوج میں ڈاکٹر ہے لیکن اس کی نفیس طبیعت کو دیکھ کر فوجیوں سے ساری نفرت ختم ہو جاتی ہے۔

رابطہ میں ایک اور ڈاکٹر بھی تھے، انور زاہدی۔ انور زاہدی سے میری علیک سلیک اس زمانے سے تھی، جب وہ ملتان میں تھا۔ اوراق کے حوالے سے ہمارا ایک رشتہ قائم تھا چنانچہ جب اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو اس نے مجھے بھیجا۔ اس کے والد مقصود زاہدی سے بھی ایک تعلق ترقی پسندی کے حوالے سے تھا، چنانچہ جب یہ لوگ مستقلاً اسلام آباد آ گئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ بھابھی بھی بڑی نفیس خاتون ہیں۔ رابطہ کے قیام کے بعد تو ہر ماہ ملاقات لازمی ہو ہی گئی۔ ادبی مشاغل کے علاوہ ہم دونوں میں ایک اور قدرِ مشترک بھی ہے اور وہ ہے الرجی۔ انور زاہدی اور میں دونوں الرجی کے پرانے مریض ہیں اور اکثر مارچ اپریل میں سانس کی تکلیف میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر لیتے ہیں۔

وقار بن الٰہی سے بھی پرانی سلام دعا تھی لیکن رابطہ کے بعد ملاقاتوں میں ایک تواتر

آ گیا۔ وقار جس زمانے میں نقوش میں چھپ رہے تھے ہم لوگ ابھی افسانے کی دنیا میں ایڑیوں کے بل رینگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ درمیان میں وقار نے لکھنا کم کر دیا بلکہ ایک طویل عرصہ تک کچھ نہیں لکھا۔ رابطے نے جن لوگوں کو فعال کیا ان میں وقار شامل ہیں۔ مفتی جی کہتے تھے رابطہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے یا کم لکھ رہے ہیں انہیں طعنے دے دے کر لکھوایا جائے اور وہ واقعی بوڑھیوں کی طرح طعنے دیتے بھی تھے۔ اگلی نشست کے لئے باقاعدہ پروگرام کا اعلان کیا جاتا اور اگر کوئی پروگرام کے مطابق اپنی تخلیق پیش نہ کرتا تو مفتی جی اس کی خوب خبر لیتے۔ وقار بن الٰہی نے رابطے میں کئی افسانے پڑھے۔

وقار بن الٰہی کی طرح رابطہ نے نذیر احمد سے بھی کئی مضامین لکھوائے۔ نذیر احمد جب ملتان میں کسی کالج میں پڑھاتے تھے تو جدید افسانے پر ان کے دو تین مضمون فنون میں چھپے تھے، اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مفتی جی کی ایک بھانجی فریدہ نذیر احمد ان سے بیاہی ہوئی تھیں۔ سروسز کا امتحان پاس کر کے وہ اسلام آباد آ گئے۔ مفتی جی انہیں بھی خوب سناتے تھے کہ لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ رابطہ نے نذیر احمد کو بھی متحرک کر دیا اور انہوں نے بھی مختلف موضوعات پر کئی مضامین پڑھے۔ مفتی جی کے انتقال کے بعد ان کی ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے۔ جس میں ممتاز مفتی کے شخصی اور فنی پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

رابطہ کے ایک اور متحرک رکن ضیا جالندھری تھے۔ رابطہ کی گفتگو میں ان کی نکتہ آفرینیاں ایک سماں باندھ دیتیں۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں جب وہ کراچی تھے تو اکثر پنڈی آتے اور حلقہ کی میٹنگ میں شریک ہوتے۔ رابطہ کے بعد ان سے مستقل تعلق کا ایک موقع مل گیا۔

رابطہ نے مجھے دو اہم اور بڑے لکھنے والوں سے قریب ہونے کا موقع دیا، جو رابطہ کے بغیر شائد ممکن نہیں تھا، ان میں سے ایک ڈاکٹر وحید قریشی اور دوسرے ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ وحید قریشی جب اورینٹل کالج میں شعبہ اردو کے صدر تھے تو میری ان سے پہلی ملاقات

ہوئی تھی۔ میں اور مشتاق قمر، وزیر آغا کے ساتھ ان کے پاس گئے۔ آغا صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور وحید قریشی سے کہا کہ یہ دونوں پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ موضوع کی بات چلی تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ اردو نثر میں اسالیب بیاں کا ارتقا پر کام کر لیں اور مشتاق قمر، میرا جی پر۔ ہم دو تین دن لاہور میں رہے اور خاکے بنا کے قریشی صاحب کو دے آئے۔ اس کے بعد دو ایک بار اور ان سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ وحید قریشی مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں ہو کر اسلام آباد آئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا، پھر وہ رابطہ میں شامل ہوئے تو ہر ماہ ملاقات لازمی ہوگئی۔ وحید قریشی جیسا فعال شخص میں نے بہت کم دیکھا ہے، ان کو دیکھ کر پہلی رائے یہ ہی ہوتی ہے کہ ان سے تو ہلا بھی نہیں جاتا ہوگا لیکن مقتدرہ کو ایک بڑا ادارہ بنانے میں انہوں نے جو محنت کی ہے اس کی داد ان کے دشمن بھی دیتے ہیں۔ وہ بڑے کمال کے منتظم ہیں۔ صبح آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتے اور حاضری کا رجسٹر اپنے کمرے میں منگوا لیتے۔ ان کے زمانے میں مقتدرہ نے بے شمار سیمینار کرائے۔ اردو زبان کا شور مچ گیا۔ ان کے اس رویے سے کئی صاحبان عالیشان ناراض ہو گئے۔ وہ اپنی تقریروں میں بیوروکریسی کی انگریزی پرستی پر سخت تنقید کرتے تھے، اس پر انہیں وارننگ بھی دی گئی کہ آہستہ چلیں لیکن وحید قریشی کہاں باز آنے والے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ملازمت میں توسیع نہ ہو سکی بلکہ ایک جوائنٹ سیکرٹری سطح کے شخص کی طرف سے انہیں حکم نامہ ملا کہ دوپہر تک چارج چھوڑ دیں۔ ایک عظیم سکالر کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے اور جوائنٹ سیکرٹری بھی کون تھا نذیر احمد۔ کہتے ہیں نا کہ بیوروکریسی ایک خاندان ہے جس کے سارے رکن ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوتے ہیں۔ وحید قریشی کی سخت گیری ان کی ذات کے لیے نہیں تھی بلکہ مقتدرہ کے مجموعی مفادات کے لیے تھی۔ وہ اپنی ذات میں اتنے نرم اور نفیس ہیں کہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے رہیں ان کی علمیت اور شخصیت کا سحر آپ کو اپنی بُکل میں دبائے رکھے گا، لیکن جیسا میں نے کہا منتظم وہ بلا کے سخت تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ماتحت

ان سے خاصے ناخوش تھے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جنہیں وہ خود لے کر آئے تھے ان کی الوداعی پارٹی میں شریک نہیں ہوئے۔ باقی لوگوں سے تو مجھے غرض نہیں لیکن انعام الحق جاوید اور اعجاز راہی کی عدم شرکت کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ اس حوالے سے بھی کہ اعجاز راہی کو جن حالات میں انہوں نے مقتدرہ میں ملازمت دی وہ انہی کا حوصلہ تھا۔ اعجاز راہی کو یونین کی سرگرمیوں کی وجہ سے اور کچھ گواہی کی اشاعت کی بنا پر پی آئی اے سے نکال دیا گیا تھا۔ اکادمی کی ایک کانفرنس میں جس کا افتتاح ضیاالحق نے کیا تھا، وہ تقریب کے اختتام پر ضیاالحق کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں کے درمیان تلخ مکالمہ ہوا۔ اعجاز راہی کے عتاب میں اضافہ ہو گیا لیکن وحید قریشی نے اس کی پرواہ کیے بغیر اعجاز راہی کو مقتدرہ میں ملازمت دے دی حالانکہ دونوں کے نقطہ نظر میں زمین آسمان کا فرق تھا، یہ وحید قریشی کی عظمت تھی۔

وحید قریشی کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی مقتدرہ کے چیئرمین ہوئے۔ نیا دور کے حوالے سے میرا ان سے تعارف تھا۔ "نیا دور" کے کئی شماروں میں میری کہانیاں چھپ چکی تھیں اس لیے جب وہ اسلام آباد میں آئے تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن اسلام آباد قیام اور رابطہ میں ملاقاتوں کے بعد ان کی شخصیت کے کئی نئے گوشے کھلے۔ جمیل جالبی، وحید قریشی کے مقابلے میں زیادہ سیانے اور ست قدم تھے، انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا کہ مقتدرہ کا کام اردو زبان کو نافذ کرنا نہیں، یہ حکومت کا کام ہے، ہمارا کام تو گھوڑا تیار کرنا ہے، سواری کرنا نہیں۔ جمیل جالبی صاحب آدمی تھے اس کے برعکس وحید قریشی عوامی تھے، ان کا دفتر ہر کسی کے لئے کھلا رہتا تھا، دروازہ کھولیں اور اندر چلے جائیں، وحید قریشی مسکراتے ہوئے آپ کا استقبال کریں گے۔ جالبی نے درمیان میں پی اے بٹھا دیا۔ اجازت کے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ شروع شروع کے دنوں کی بات ہے نیشنل بک کونسل کا ایک سیمینار تھا، میں اور جلیل عالی بھی موجود تھے۔ محفل ختم ہوئی تو جالبی صاحب جنہوں نے سیمینار کی صدارت کی تھی بولے..... "دفتر چلیں

وہاں گپ شپ ہوئی''۔ تھوڑی دیر بعد میں اور جلیل لی مقتدرہ کے دفتر پہنچ گئے۔ پی اے بولا'' ذرا انتظار کرنا پڑے گا، جالبی صاحب ابھی مصروف ہیں''۔ ہم نے پانچ دس منٹ انتظار کیا اور ملے بغیر چلے آئے۔ جب گھر پہنچا تو جالبی صاحب کا فون آیا بولے ..... ''تم لوگوں نے شاید برا منایا ہے۔ میں ایک دفتری معاملے میں الجھا ہوا تھا، بہر حال معذرت'' اس کے بعد ان سے ایسے بے تکلف تعلقات ہوئے کہ میں ان کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا تھا۔ جالبی صاحب کے پاس بیٹھ کر لطف آتا ہے۔ اسلام آباد سے ان کے چلے جانے سے واقعی ایک خلا کا احساس ہوا۔

ہمارے قومی زوال کا گراف دیکھیں کہ مقتدرہ کے پہلے صدر نشین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ پھر ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی، جالبی صاحب کے بعد افتخار عارف مقتدرہ کے صدر نشین ہوئے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی بچے کو پگڑی پہنا کر دادا کی جگہ بٹھا دیا جائے۔ افتخار عارف سے میرا پہلا تعارف کسوٹی کے ایک پروگرام میں ہوا تھا۔ وہ اور عبید اللہ بیگ ٹی وی سے یہ پروگرام کرتے تھے۔ کسی ایک شخصیت کے حوالے سے سوال پوچھے جاتے تھے۔ میری شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ ایک آدھ سوال کی بچت پر میں جیت گیا۔ اس کے بعد سنا کہ افتخار عارف بی سی سی آئی کے اردو مرکز لندن میں چلے گئے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ چھپا تو کسی ذریعے سے انہوں نے مجھے بھی بھجوایا۔ ۷۷ء کے مارشل لا کے دوران اردو مرکز کے بارے میں یہاں اچھی رائے نہ تھی۔ لندن پہنچے ہوئے بہت سے جلاوطن دانشور شام کو وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ فارغ بخاری نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ وہ طویل جلاوطنی کے بعد لندن سے لوٹے تو میری ان سے ایک طویل ملاقات ہوئی۔ بے شمار ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اردو مرکز لندن کا ذکر آیا تو فارغ بخاری کہنے لگے'' اردو مرکز کے حوالے سے مجھے ایک بات کا زندگی بھر افسوس رہے گا''۔ میں نے تفصیل پوچھی تو بولے'' لندن میں کوئی باقاعدہ کام تو تھا نہیں۔ صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلتے تو مختلف جگہوں پر سر مارتے۔ وہاں اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ دفتر

میں آپ کی میزبانی کرے، چنانچہ میں بھی اوروں کی طرح اپنے جیسے دوسروں کے دروازے کھٹکھٹاتا اور شام کو تھکا ہارا اردو مرکز پہنچتا کہ وہ اُن دنوں ہم جیسوں کی ایک بیٹھک تھی۔شام کو بہت سے لوگ گپ شپ کے لیے وہاں آتے تھے، ان میں شاعر ادیب بھی تھے، جلاوطن سیاسی لیڈر بھی۔ افتخار عارف ہمیں خوش آمدید کہتے اور ایک آدھ پیگ پیش کرتے ہوئے دن بھر کی مصروفیات کا احوال پوچھتے۔ میں کہتا صبح ناہید خان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر کھر صاحب کے پاس بھی چلا گیا تھا۔ افتخار عارف بڑے رسان سے پوچھتے سنایئے اپنی پارٹی کے کیا احوال ہیں۔کیا کچھ ہونے جا رہا ہے۔ میں بھولپن میں دن بھر کی سنی سنائی باتیں دہرا دیتا اور میں ہی نہیں دوسرے لوگ بھی یہی کرتے۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اکٹھی کی ہوئی معلومات یہاں فیکس ہو جاتی ہیں۔ مجھے دیر بعد سمجھ آئی کہ آخر اردو مرکز کس خوشی میں ہماری میزبانی کرتا ہے“۔

اسلام آباد میں کاسہ لیسوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہا ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہنا اور جانے والے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ جب غلام ربانی آگرو اکادمی کے چیئر مین تھے تو اسلام آباد کا کوئی فنکشن ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ وہ چیئر مین نہ رہے تو اسلام آباد میں رہائش کے باوجود کسی محفل میں ان کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہی حال پریشان خٹک کا تھا اور یہی صورت فخر زمان کی بھی رہی۔ پیپلز پارٹی کے معتوب زمانے میں جب زمان پنڈی آتے تو تین چار لوگوں کے سوا کوئی اُن سے ملنے کا روادار بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں میں حسن عباس رضا، شعیب خالق، اعجاز راہی اور میں شامل تھے۔ فخر زمان اکادمی کے چیئر مین ہوئے تو ان کے گرد ایک جمگھٹا لگ گیا۔ اسلام آباد کا کوئی بھی ادبی فنکشن ہوتا ان کی صدارت پکی، لیکن جب وہ اکادمی سے علیحدہ ہوئے تو اب اسلام آباد آتے ہیں تو کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ انہیں ملنے چلا جائے۔ ہم جیسے ہی دو چار چاہنے والے آج بھی ان کی راہ دیکھتے ہیں۔ افتخار عارف کو مقتدرہ کا صدر نشین بنانے میں فخر زمان کا

کردار بنیادی تھا۔ الطاف احمد قریشی نے مجھے اس کی تفصیل بتائی ۔ کہنے لگے ہماری پہلی چوائس تو ڈاکٹر جمیل احمد خان تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ افتخار عارف کا نام قریشی نے تجویز کیا تھا اور وجہ یہ کہ اس جیسا تابع فرمان شخص کوئی نہیں ملے گا لیکن فخر زمان کو یہ کہاں معلوم تھا کہ کچھ عرصہ بعد وہ دونوں چیئر مین نہیں ہوں گے اور تابع فرمانی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

رابطہ کے ساتھیوں میں محمود اختر اور بلقیس محمود بھی شامل تھے ۔ محمود اختر مضامین، انشائیے اور بلقیس محمود شعر کہتی تھیں ۔ دونوں بڑے اچھے میز بان اور محبت کرنے والے دوست تھے ۔ افسوس بلقیس محمود عارضہ دل سے فوت ہو گئیں ۔ محمود اختر اب بھی رابطے میں آتے ہیں۔ رابطہ کی خواتین اراکین میں سے فریدہ کے میاں حفیظ اور شمیم اکرام الحق سے تو پہلے سے شناسائی تھی ۔ حفیظ احمد صحافت سے سول سروس کی طرف آئے تھے۔ الطاف قریشی اور مسعود اللہ سے ان کی پرانی یاری تھی چنانچہ ان لوگوں کے توسط سے میرا بھی ان کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ الطاف قریشی جس زمانے میں حلقہ کے سیکرٹری تھے فریدہ حفیظ نے دو تین اچھی کہانیاں حلقہ میں پڑھیں ۔ گواہی میں بھی ان کی کہانی شامل تھی ۔ شمیم اکرام الحق سے شناسائی اس وقت سے تھی جب وہ شمیم سہگل کے نام سے شعر کہتی تھیں ۔ شبنم مناروی انہیں حلقہ میں لے کر آئے ۔ پھر وہ شمیم اکرام الحق بن کر صحافت سے وابستہ ہو گئیں ۔ ان دونوں کے علاوہ رابطہ کی خواتین اراکین میں شبانہ گیلانی اور نیلوفر اقبال تھیں ۔ دونوں افسانہ نگار ہیں ۔ آخری دور میں کچھ اور خواتین بھی رابطہ کی رکن بن گئیں ان میں نگہت سلیم، ثروت محی الدین اور شبانہ حبیب شامل ہیں ۔ رابطہ بنیادی طور پر تو ایک ادبی انجمن ہی ہے لیکن اس کا ماحول بڑا گھریلو سا ہے ۔ اس کی محفلوں میں ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور سب لوگ خود کو ایک دوسرے کے قریب سمجھتے ہیں۔

مفتی جی کی وفات کے بعد رابطہ ایک عرصہ تک معطل رہا۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ جب رابطہ کا آغاز ہوا تو پچیس تیس آدمیوں کے کھانے پر تین چار سو کا خرچ آتا تھا۔ مجھے یاد

ہے جب پہلی بار میرے یہاں رابطہ کا اجلاس ہوا تو شیور مرغ چودہ روپے کلو تھا۔آہستہ آہستہ اخراجات بڑھتے گئے۔ایک تو تیس اشخاص کا بندوبست کرنا۔دوسرے مالی معاملات ،نتیجہ یہ نکلا کہ جس کی باری ہوتی وہ کسی نہ کسی بہانے سے ٹالنے کی کوشش کرتا۔دوسری وجہ یہ کہ مفتی جی رابطہ کے بنیادی محرک اور بہت ہی فعال تھے۔مقررہ تاریخ سے ایک دو دن بھی ادھر اُدھر ہوتے تو وہ شور مچا دیتے۔فون پر فون کرتے۔ڈانٹتے کہ دیر کیوں ہوگئی ہے فون کرتے ...... "رشید یہ کیا ہو رہا ہے۔منشا سے پوچھو" میں کہتا ...... "مفتی جی ابھی بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں" مفتی صاحب کے بعد رابطہ بے جان ہوگیا۔ایک عرصہ تک بند رہا۔پھر شہابہ گیلانی کو سیکرٹری بنا کر طے کیا گیا کہ کھانے کی بجائے صرف چائے کا اہتمام کیا جائے اب رابطہ چل تو نکلا ہے لیکن بے جان ،اس کی جان تو مفتی صاحب تھے۔ان کے بعد رابطہ محض ایک روایت کا تسلسل ہے۔

رابطے میں اعجاز راہی ،جلیل عالی ،احسان اکبر بھی شامل تھے ،بعد میں نوازش علی بھی اس کے رکن بن گئے لیکن ان کا ذکر میں اور حوالوں سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔رابطہ سے باہر بھی ہمارا ایک رابطہ یعنی شام کی محفل تھی۔شالیمار اجڑا تو دو گروپ بن گئے۔میں ،احمد داؤد ،حسن عباس رضا ،قمر جاوید ،ایوب میرزا ڈیلائٹ میں بیٹھنے لگے۔جلیل عالی ،احسان اکبر ،احمد جاوید ، شفیع ضامن ،یوسف حسن اور آصف ڈار نے داتا ریسٹورنٹ میں محفل جمالی۔

ہماری نشستوں میں احمد داؤد کی سرگرمیاں بہت مشکوک ہوتی جارہی تھیں اور وہ اکثر بدتمیزی پر بھی اتر آتا۔ایک دن ایوب میرزا سے اس کی تکرار ہوگئی۔میں اور ایوب میرزا وہاں سے اٹھ کر داتا میں آبیٹھے۔شروع شروع میں اجنبیت سی رہی لیکن لیکن آہستہ آہستہ ہم اس محفل کا حصہ بن گئے۔جلیل عالی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی۔وہ سی بی کالج واہ کینٹ میں اردو کا لیکچرر ہو کر آیا تو میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔جلیل عالی اور مشتاق قمر دونوں ایک ہی دن کالج پہنچے۔شروع ہی سے ایک ایسی غلط فہمی ہوگئی جس کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک عالی

سے تعلقات میں ایک دوری سی رہی ۔ ہوا یہ کہ اُسی زمانے میں کالج میگزین کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس کے خلاف سٹیشن کمانڈر کو درخواست دی گئی کہ اس میں حکومت دشمن مواد شامل ہے۔ مجھے یہ غلط فہمی ہوئی کہ اجمل صدیقی کے ساتھ جلیل عالی بھی شامل ہے چنانچہ میں نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے نصرت میں عالی کے خلاف ایک کالم لکھ دیا۔ یوں ابتدا ہی سے ہمارے درمیانی ایک خلیج حائل ہوگئی جس کا کوئی جواز نہ تھا۔ اے ء میں، میں واہ سے تبدیل ہوکر سر سید کالج پنڈی میں آ گیا۔ یوں عالی سے براہ راست تعلق تو ختم ہو گیا لیکن ادبی محفلوں میں میل ملاقات جاری رہی ۔ یہ شدید قسم کی نظریاتی آویزش کا زمانہ تھا۔ دوستی دشمنی کے معیار بھی نظریاتی وابستگی تھی ۔ انہی دنوں ایک دن اعجاز راہی نے مجھے کہا...... ''دیکھو بھئی تم سے اب تعلقات زیادہ عرصہ نہیں چل سکتے'' میں نے پوچھا...... ''کیوں''؟

بولا...... ''تمہاری سرگرمیاں بڑی مشکوک ہیں''۔

میں نے کہا...... ''مثلاً''

کہنے لگا...... ''تم رجعت پسندوں سے بھی ملتے ہو اور میں نظریے پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا''۔

دوستی تو ہماری خیر کیا ختم ہوتی ہاں کچھ دن دوری رہی پھر وہی معمول شروع ہو گیا۔ اس نظریاتی آویزش نے مجھے عالی سے خاصا دور رکھا۔ جب عالی ٹرانسفر ہوکر سر سید میں آیا تو ہم ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے لیکن حلقہ کی سیاست کی وجہ سے دو علیحدہ علیحدہ کیمپوں میں ہونے کی وجہ سے ہمارے تعلقات میں کوئی گرم جوشی پیدا نہ ہوئی ۔ اس دوران پی این اے کی تحریک شروع ہوگئی اور اینٹی اور پرو پیپلز پارٹی رویہ بہت شدید ہو گیا۔ مارشل لا لگا تو یہ آویزش اپنے عروج پر تھی ۔ اسی دوران ہم نے پاکستانی ادب کا کام شروع کیا۔ اس کے خلاف نوائے وقت میں خبر لگی اور ادارتی نوٹ بھی لکھا گیا۔ اس بار پھر مجھے غلط فہمی ہوئی کہ اس میں جلیل عالی کا ہاتھ ہے، حالانکہ بعد میں

معلوم ہوگیا کہ یہ کام ہمارے ایک ساتھی عرفان صدیقی نے کیا تھا۔ یوں ایک طویل عرصہ تک ہمارے درمیان ایک بے نام دشمنی سی رہی لیکن مختلف محفلوں میں گفتگو کرتے ہوئے کالج میں، خالی اوقات میں مختلف موضوعات پر بات چیت میں مجھے اندازہ ہوا کہ عالی کے بارے میں میرا تعصب درست نہیں۔ شاید اسے بھی ایسا ہی اندازہ ہوا ہو۔ دراصل ہم دونوں ہی انتہا پسند نہیں۔ بلکہ ایک لبرل سوچ رکھتے ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی شروع ہوگیا۔ بھابھی حسینہ بہت ہی مہذب اور پڑھی لکھی خاتون ہیں، محبت اور ایثار کا جذبہ رکھنے والی۔ عالی کی والدہ بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ مجھے ان سے ایک انس سا ہوگیا۔ مجھے ان میں اپنی امی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا رویہ بھی یہ تھا کہ مجھے اور رخسانہ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ رابطہ شروع ہوا تو میں اور جلیل عالی دونوں ہی اس میں شامل ہوئے یوں تعلقات کی ایک نئی نہج شروع ہوئی جو ابھی تک قائم ہے۔ جلیل عالی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات میں بڑا واضح ہے۔ اس کی شخصیت میں جمال اور جلال دونوں پہلو ہیں لیکن جلالی کیفیت کبھی کبھی ہی ابھرتی ہے۔ بحث کا بڑا شوقین ہے اور جب تک مخالف اس کی بات کا قائل نہ ہو جائے وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شام کی محفل میں کسی موضوع پر بات چل نکلتی تو محفل کے اختتام تک جاری رہتی۔ ہم تو گھر جا کر بھول بھال جاتے لیکن عالی دوسرے دن وہیں سے آغاز کرتا جہاں بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اقبال اور قائداعظم اس کی کمزوری ہیں۔ ایک بار وہ، میں، یوسف حسن اور احمد جاوید پشاور گئے۔ ہمارے ایک دوست ہمیں علاقہ غیر میں لے گئے۔ ان کا جاننے والا ایک شخص شراب کی دکان کا مالک تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو سامنے دیوار پر گاندھی جی کی تصویر لگی تھی۔ عالی نے پوچھا...... ''آپ نے گاندھی کی تصویر کیوں لگائی ہے''۔ اس پر بات شروع ہوگئی۔ صاحب دکان نے قائداعظم کے خلاف کچھ سخت باتیں کر دیں۔ عالی نے جواباً گاندھی کے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ فضا خاصی مکدر ہوگئی۔ میں نے عالی

کے کان میں کہا ''یہاں سے ہم نے چل کر جانا ہے یا بکس میں بند ہو کر''۔

بڑی مشکلوں سے ہم نے عالی کو چُپ کرایا لیکن واپسی میں سارے راستے وہ نظریہ پاکستان، ہندوؤں کے رویے، قائداعظم اور اقبال کے افکار پر گفتگو کرتا رہا۔ کھانے کے دوران بھی یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جب ہم اپنے کمرے میں آئے تو وہاں بھی اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ایک بج گیا آخر تنگ آ کر میں نے اُس سے کہا ''عالی صاحب، گاندھی کی تصویر میں نے تو نہیں لگائی''۔

ڈاکٹر نوازش علی سے میری ملاقات عالی کے توسط سے ہوئی۔ اُس کی بیگم طاہرہ نوازش، حسینہ بھابھی کے کالج ہی میں پڑھاتی تھیں۔ نوازش حشمت علی اسلامیہ کالج میں تھا۔ عالی کے گھر ہی دونوں میاں بیوی سے پہلی ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ تعلقات فیملی سطح پر ہو گئے۔ اس وقت نوازش فراق پر کام کر رہا تھا۔ میں بھی میراجی کا موضوع لیے بیٹھا تھا۔ نوازش کی تنقید بڑی متوازن ہے۔ ہمارے نئے نقادوں میں اس کا نام اور کام اس حوالے سے بڑا اہم ہے کہ ایک تو وہ بہت سے نقادوں کی طرح سرسری تنقید نہیں لکھتا۔ تخلیق کو پڑھ کر اس کے اندر اتر کر اس کا مزاج آشنا ہو کر اس توازن سے بات کرتا ہے کہ مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔ طاہرہ بھابھی بعض ڈشیں پکانے کی بڑی ماہر ہیں۔ اور جب بھی کوئی ایسی ڈش تیار کرتیں ضرور بلاتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین ہیں اور ایسے لوگ بہت اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں۔

بڑی بات یہ کہ تعلقات نبھانا اور آنچ کھانا ان کو آتا ہے۔ فراق پر ان کا کام صرف پی ایچ ڈی کی سطح تک محدود نہیں بلکہ یہ مقالہ وسعتِ مطالعہ اور تحقیقی کاوشوں کا ایسا عمدہ نمونہ ہے کہ یونیورسٹی کی سطح پر ایسا کام کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ نوازش کی دوسری دلچسپی مجید امجد ہے اور مجید امجد پر تواتر سے مضامین لکھ کر انہوں نے کئی نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔ کبھی کبھی موڈ میں ہوتے

ہیں تو دوستوں کو گھر بلا کر پائے اور بونگ کھلاتے ہیں۔ کھلاتے جاتے ہیں اور پکانے کی تعریفیں کرواتے جاتے ہیں۔

کھانے پینے کے حوالے سے فضل الٰہی بہار بھی باغ و بہار شخصیت ہے۔ اس کا تخلیقی میدان تو پنجابی شاعری ہے لیکن گفتگو کا بادشاہ ہے۔ جس محفل میں ہو جان ڈال دیتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی رفاقت کا طویل سلسلہ ہے۔

یوسف حسن سے میرا پہلا تعارف اوراق سے ہوا تھا۔ بعد میں یوسف حسن فنون کی طرف چلا گیا اور ایسا گیا کہ وزیر آغا کے نام سے بھی چڑ ہو گئی۔ لاہور میں حلقہ ارباب غالب کی بنیاد رکھی۔ شروع شروع میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ حلقہ، حلقہ ارباب ذوق کے ردّ کے طور پر قائم ہوا ہے۔ میں ایک عرصہ تک اس کے جلسوں میں نہیں گیا۔ جب داتا میں بیٹھنا شروع کیا تو اُس وقت آصف ڈار جوائنٹ سیکرٹری اور یوسف حسن سیکرٹری تھے۔ اب میں نے بھی وہاں باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا۔ بلکہ ایک زمانے میں، میں اس کی مجلس عاملہ میں بھی شامل رہا۔ یوسف حسن کی دو بڑی کمزوریاں ہیں۔ ایک ترقی پسندی دوسرے جہلم۔ جہلم کے نام پر فوراً اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے تخلیقی معاملات بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ دنیا بھر میں نظریاتی آویزش ختم ہو چکی ہے لیکن یوسف حسن ابھی تک اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تم برما کے جنگلوں میں پھنسے ہوئے وہ جاپانی سپاہی ہو جس کو ابھی تک معلوم نہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ نظریاتی وابستگی بلکہ پختگی کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا دوست اور ساتھی ہے۔

یوسف حسن کے ساتھ ایک اور دوست جس کے ساتھ زندگی کے اتار چڑھاؤ کے کئی لمحے مشترک ہیں شفیع ضامن ہیں۔ میری ان سے باقاعدہ ملاقات داتا ہی میں ہوئی۔ اس سے پہلے نام ہی کی شناسائی تھی۔ ایک زمانے میں ہم سب باقاعدگی سے شام کو داتا میں اکٹھے ہوتے تھے۔ شفیع ضامن فوج میں صوبیدار تھے۔ ایم اے اردو کر کے وہاں سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اسلام آباد

کالج فار بوائز میں لیکچرر ہو گئے۔ ان کی بیٹی کوئی نہیں پانچ بیٹے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے ''جس گھر میں بیٹی نہ ہو وہاں تقدس اور احترام نہیں ہوتا'' میں نے پوچھا ''وہ کیسے بولے ''لڑکوں کا گھر یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہاسٹل ہے'' اچھی شاعری کے ساتھ ساتھ عمدہ خاکے لکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ شخصیت کے اندر اتر کر ایسی باتیں نکال لاتے ہیں جو اگرچہ سامنے کی ہوتی ہیں لیکن ان کے نفسیاتی محرکات سے ہم لاعلم ہوتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہم دونوں اب ایک ہی کالج میں ہیں۔

اُس زمانے میں داتا میں باقاعدگی سے آنے والوں میں احمد جاوید بھی تھا۔ یوں تو احمد جاوید سے ایک تعارف منظور عارف کے حوالے سے بھی تھا کہ وہ ان کا بھانجا اور داماد تھا، دوسرا تعارف افسانہ نگاری کے ذریعے تھا لیکن ایک عرصہ تک اُس نے میرزا حامد بیگ کے ساتھ مل کر ڈیڑھ اینٹ کی اپنی الگ مسجد بنائے رکھی۔ لیکن بعد میں وہ میرزا سے علیحدہ ہو کر داتا کی منڈلی میں آ گیا۔ احمد جاوید ادب کے علاوہ موسیقی میں بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے اور کلاسیکی موسیقی کے رموز و نکات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ایک عرصہ تک ہماری روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اسلام آباد جانے کے بعد یہ سلسلہ کافی حد تک ختم ہو گیا۔

میرزا حامد بیگ سے پہلی ملاقات اُس زمانے میں ہوئی جب وہ مری میں پڑھا رہا تھا۔ عموماً ہفتہ کی شام کو پنڈی آ جاتا اور احمد داؤد کی بیٹھک میں قیام کرتا، شالیمار اور حلقہ کی نشستوں میں شریک ہوتا۔ ذہین و فطین اور اچھا افسانہ لکھنے والا، لیکن ضرورت سے زیادہ شہرت پسند، اسی احساس نے اُسے آہستہ آہستہ ہم سے دور کر دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس اجتماع میں اس کی انفرادیت ابھر کر سامنے نہ آ سکے گی۔ نظریاتی طور پر وہ مجھ سے بڑا قریب تھا اور ہمارے ہی گروپ کی حمایت سے وہ حلقہ کا سیکرٹری بھی بنا۔ اس کے ساتھ بھی میرے فیملی ریلیشن تھے۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا لیکن مرزا کا اپنا ایک انداز اور تعصبات تھے جس کی وجہ سے

ہمارے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ دور دور رہا۔ مرزا کے ساتھ زاہد نوید حلقہ کا جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ یہ بھی اُس زمانے میں باقاعدگی سے شالیمار میں بیٹھنے والوں میں سے تھا۔ مرزا اور وہ بعد میں گارڈن کالج میں اکٹھے ہو گئے۔

جمیل یوسف سے بھی غائبانہ تعاوف اوراق کے حوالے سے تھا، اس زمانے میں وہ چٹا گانگ میں ایگزیکٹو آفیسر تھا، غالباً ۷۰ء میں وہ واہ آ گئے۔ اُس زمانے میں ہمارے کالج کنٹونمنٹ کے تحت چلتے تھے اس حوالے سے وہ ہمارے باس تھے، لیکن میرا اُن کا رشتہ باس کا نہیں دوستی کا تھا۔ میں اکثر دوپہر کو ان کے ہاں چلا جاتا اور کھانا کھا کر پنڈی آتا، کبھی کبھار وہ پنڈی کے لیے تیار ہو جاتے اور ہم کار میں نہیں ہوائی جہاز میں آتے وہ یوں کہ جمیل یوسف کار کو جہاز کی رفتار سے چلاتے تھے۔ اُس زمانے میں سڑک بھی چھوٹی تھی۔ واہ سے نکلتے جو دم سادھتا تو پنڈی آ کر سانس لیتا۔ جمیل یوسف بڑے عاشق مزاج تھے۔ خاتون دیکھی اور ریجھ گئے۔ ویمن کالج میں انگریزی کی ایک لیکچرار امت الکریم تھی۔ ہماری ایسوسی ایشن کی نائب صدر تھیں۔ غلام سرور صدر اور میں جنرل سیکرٹری تھے، ایک بار ہم کسی کام سے جمیل یوسف سے ملنے گئے۔ اس کے بعد جمیل یوسف نے خاتون کو تحفے بھیجنے شروع کر دیے ایک بار کتابوں کا بنڈل بھیجا اُس نے مجھے بلایا اور بولی کسی طرح میری جان چھڑا دیں، میں اس طرح کی عورت نہیں۔ میں نے جمیل یوسف سے بڑی ناراضگی کا اظہار کیا اور خاتون کی جان چھڑائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوفہ تو ایرک سپرین کے عشق میں مبتلا ہیں وہ ایرک صاحب کی شاگردہ تھیں۔ الطاف احمد قریشی بھی اسی زمانے میں ایرک سپرین کی کلاس میں تھے۔ اُنہوں نے مجھے ساری روداد سنائی کہ خاتون ابھی تک کنواری بیٹھی ہے کہ شادی کروں گی تو ایرک صاحب ہی سے۔ ایرک سپرین کہتے میری اور اپنی عمر دیکھو لیکن عشق نہ پچھے عمراں۔ آخر انہوں نے ہتھیار پھینک دیے اور ایرک سپرین سے اعجاز سپرین بن کر خاتون سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ اسلام آباد کالج میں

آ گئیں ۔ بعد میں ایوب میرزا کے حوالے سے میری سپرین صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں ۔ وہ بہت واضح نظریات رکھنے والے ترقی پسند تھے ۔جمیل یوسف نے ایک دفعہ اور مجھے بری طرح پھنسایا ۔ ہوا یوں کہ کوئی خاتون ان کے دفتر میں ملنے آئی ۔ دونوں کا پنڈی آنے کا پروگرام تھا ۔ جمیل یوسف کی بیگم میاں کے کوائف سے واقف تھی ۔ انہیں کچھ شک پڑ گیا ۔ جمیل یوسف مجھے کہنے لگے تم اس خاتون کو پنڈی لے جاؤ اور سلور گرل میں ، میرا انتظار کرو ۔ میں بیوی کو ٹال کر پہنچتا ہوں ۔ میں موصوفہ کو لے کر پنڈی آ گیا اور ہم دونوں سلور گرل میں جا بیٹھے موصوفہ کہنے لگی ، ''مجھے تو کھانا کھانا ہے'' ۔ مینیو منگوایا ۔ اُس نے اپنی مرضی سے تین چار ڈشوں کا آڈر دے دیا ۔ کھانا کھا چکے تو میں نے گھڑی دیکھنا شروع کی ، جوں جوں وقت گزرتا میرا حال برا ہوتا جاتا ۔ میں نے دل میں بل کا اندازہ کیا اور باتھ روم میں جا کر ساری جیبیں ٹٹولیں ۔ پھر اپنے آپ سے کہا ''لگتا ہے آج ہوٹل کی ساری پلیٹیں مجھے ہی دھونا پڑیں گی'' لیکن شکر ہے کہ جمیل یوسف پہنچ گئے ۔

ایک حوالے سے یہ بڑی بے فکری کے دن تھے ۔ اپنی ذات کی کوئی پرواہ نہ تھی ۔ ہماری گفتگو کا محور مرکز ملکی حالات اور دنیا بھر میں تبدیلی لانے کی خواہشوں سے عبارت تھا ۔ دراصل ہماری اکثریت سیلف میڈ تھی ۔ نچلی سطح سے اوپر جانے کی تمنا تو تھی لیکن محنت کے ساتھ ۔ ایسے ہی ساتھیوں میں سے ایک بشیر سیفی بھی تھا ۔ میری جب اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو لکھنے والوں کی انجمن اپنے عروج پر تھی ۔ وہ ، نسیم سحر اور خاور اعجاز ڈرتے ڈرتے انجمن کے جلسوں میں آئے ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی جھجک دور ہوئی تو گفتگو میں بھی شریک ہونے لگے ۔ سیفی اُس وقت میٹرک میں تھا ۔ میری طرح اُس نے بھی ملازمت کے دوران اپنی تعلیم مکمل کی اور ڈاکٹر بشیر سیفی بن گیا ۔ بشیر سیفی کا مزاج بڑا جلالی ہے ۔ جمال کا پہلو کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا ہے ۔ میں شاید اُس کے ان چند دوستوں میں سے ہوں جو اس کے جلال کی زد میں نہیں آیا بلکہ جمالی پہلوؤں ہی

سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اسی مزاج کا ایک اور دوست اکبر حمیدی بھی ہے۔ وہ شہر میں رہ کر بھی دیہاتی اخلاق کا قائل ہے۔ دوستی یا دشمنی پر یقین رکھتا ہے۔ کچھ اوراق کے حوالے سے اور کچھ مزاجوں کی مناسبت سے ہم نے ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کیا۔ میں نے اس کے جلال کی ایک جھلک اُس وقت دیکھی جب ممتاز مفتی سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ کچھ غلط فہمی اور کچھ بعض دوستوں کی ''مہربانی'' سے حلقہ اسلام آباد کے ایک الیکشن کے موقع پر یہ دونوں حضرات مدِ مقابل بن گئے۔ لیکن کچھ اور دوستوں کی مداخلت سے بات زیادہ آگے نہ بڑھی۔

○

شہاب، مفتی جی اور پھر اشفاق احمد وغیرہ کے حوالے سے ادب میں جس روحانیت کی بازگشت عرصہ تک سنائی دیتی رہی ہے۔ وہ کوئی فکری یا نظری تجربہ نہیں بلکہ کراماتی اور کرشماتی سلسلہ ہے۔ تصوف کی ایک صورت تو ہمارے صوفیا کے یہاں ملتی ہے جس میں کائنات پر ایک روحانی حوالے سے غور و فکر کیا جاتا رہا ہے۔ انسان اور خالق کے رشتوں کی تلاش غیر منطقی ہونے کے باوجود اپنی ایک منطق رکھتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کی روحانیت بابوں تک محدود ہے جس میں کرامت اور کرشمہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، میں نے مفتی جی سے کئی بار روحانیت کے فکری اور نظری پہلوؤں پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بات کو اڑانے کے ماہر تھے۔ کبھی اس موضوع کی طرف نہیں آئے بلکہ کوئی نہ کوئی حیران کر دینے والا واقعہ سنا دیتے۔ دیکھا جائے تو ترقی پسندوں کی طرح ان کے بھی سٹڈی سرکل ہیں اور ان سٹڈی سرکلوں میں جانا بھی اب ایک فیشن ہو گیا ہے۔ شہر کے پوش علاقوں میں اکثر اس طرح کے اجتماع ہوتے ہیں، جن میں زندگی کے مسائل پر تو کوئی گفتگو نہیں ہوتی بس ایک مژدہ سنا دیا جاتا ہے کہ روحانیت کے اثر میں ان کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ بے عملی کی یہ تعلیم سارے معاشرے میں پھیل گئی ہے۔ مذہب کا نام لینے والے اور مذہب کی مخالفت کرنے والے تقریباً سبھی یہی کام کر رہے ہیں۔

○

مفتی جی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ ''علی پور کا ایلی'' کو آدم جی انعام نہیں ملا۔ ان کے خیال میں یہ ادبی سیاست تھی۔ لیکن بعد میں انہیں اکادمی کا انعام ملا۔ اس کی بھی عجیب روداد ہے۔ ان دنوں میں غلام ربانی آگرو کے پاس، جو اُس زمانے میں ڈی جی تھے، بیٹھا تھا۔ احمد ندیم قاسمی آ گئے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد قاسمی نے آگرو سے کہا ''کہ مجھے اکادمی سے ایک شکایت ہے''۔ آگرو نے پوچھا ''کیا''

قاسمی بولے ''کمیٹی نے جس کتاب کو سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اسے پہلے نمبر پر کر کے انعام دے دیا گیا ہے۔ آخر یہی کرنا ہے تو کمیٹیاں بنانے کا کیا فائدہ؟۔

قاسمی اُس سال انعام کمیٹی میں شامل تھے۔ آگرو نے جواب دیا'' دراصل جس کتاب کو انعام دیا گیا ہے اُس کے مصنف کے بارے میں خیال تھا کہ معلوم نہیں اگلے سال ہوں گے بھی یا نہیں''۔

قاسمی بولے ''یہ تو کوئی معیار نہیں''۔

یہ مصنف مفتی جی تھے اور انعام کے لیے باقاعدہ لابی کی گئی تھی۔ ہمارے یہاں انعامات کا سلسلہ ہمیشہ ہی مشکوک رہا ہے۔ کوئی بھی انعام ایسا نہیں جس کے بارے میں تنازع پیدا نہ ہوا ہو۔ خود میں دو سال تک اکادمی کی انعامی کمیٹی کا رکن رہا ہوں۔ اس کی بھی دلچسپ روداد ہے۔ ایک دن میں کالج سے آیا تو معلوم ہوا کہ کوئی دو بڑی بوریاں چھوڑ گیا ہے۔ ساتھ اکادمی کا ایک خط تھا کہ آپ کو انعامی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ اس سال کی کتابیں ارسال ہیں۔ بوریاں کھولیں تو معلوم ہوا چار سو سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں ادب سے متعلق ہی نہ تھیں۔ کئی کتابیں ایسی تھیں جن کا چوتھا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ میں نے چھانٹی کر کے پندرہ کتابیں الگ کیں۔ دوسرے سال بھی یہی ہوا۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس میں میری دو

کتابیں بھی شامل تھیں جو اسی سال چھپی تھیں۔ بھیجنے والوں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ جسے منصف بنایا جارہا ہے خود اس کی کتابیں بھی مقابلے میں شامل ہیں۔ میں نے انہیں تو ایک طرف کیا اور دیگر دو حضرات کو بھی لکھا کہ انہیں مقابلے میں شامل نہ کیا جائے۔ میں نے اکادمی کے متعلقہ شعبہ کو تجویز دی کہ آپ اتنی کتابیں بھجوا کر یہ کیسے توقع کرتے ہیں کہ مہینہ بھر میں آپ کو درست جواب مل جائے۔ اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ آپ پہلے ایک چھانٹی کمیٹی بنائیں جو صرف دس بارہ کتابیں منتخب کرے۔ تجویز کو پسند کیا گیا لیکن عمل نہ ہوا۔ انعام کمیٹیوں میں تو اراکین کہہ کہہ کر اپنے پسندیدہ نام منظور کراتے ہیں۔ وزیرِاعظم انعامات کے سلسلے میں مشہور تھا کہ ایک صاحب جو اس کمیٹی کے رکن تھے، کے گھر کمیٹی کے اراکین کا اجلاس ہوا۔ بات شروع ہوئی تو صاحب خانہ نے کہا چھوڑیں جی کتابیں کون پڑھتا پھرے گا۔ ہم یہاں پانچ حضرات ہیں اپنا اپنا ایک نام بتا دیجیے۔ سب ہی اس سے اتفاق کریں گے کیونکہ انعام بھی اتنے ہی ہیں۔ اکثر کمیٹی کے رکن تو بس شوپیش ہی ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک کتاب کو انعام کے لیے نامزد کیا گیا۔ شنید یہ تھی کہ کمیٹی کے صدر نے زبردستی اراکین سے اسے منظور کرایا۔ بات چونکہ خاصی متنازع تھی اس لیے اکادمی نے مجھے یہ کتاب ایک سیکریٹ لیٹر کے تحت بھیجی کہ فائنل رائے دیں کہ اسے انعام ملنا چاہیے یا نہیں۔ میں نے بڑی تفصیل اور دلائل سے جواب دیا کہ اس کتاب کو انعام نہیں ملنا چاہیے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اسے انعام مل گیا اور مجھے چار ہزار معاوضہ کا چیک۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انعام لینے والا گروپ اتنا مضبوط اور بااثر تھا کہ اُس نے میرے خط کو داخل دفتر کر دیا۔ حالیہ برسوں میں بھی انعامات کی یہ صورت ہے کہ انعام کا اعلان ہونے سے پہلے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کسے کسے نوازا جارہا ہے اور اس میں بڑے بڑے درویشوں کے نام ہیں۔

○

اہلِ قلم کانفرنسوں میں مدعوئین کا معیار کیا تھا، یہ ایک خفیہ معاملہ ہے جس کے بارے

میں صرف اکادمی کے افسران ہی جانتے ہوں گے اس لئے کہ بعض بہت اہم اہل قلم نظر انداز کر دیے جاتے اور ایسے لوگ مدعو ہوتے جنہیں انکے شہر والے بھی نہیں جانتے۔ شخصی اختلافات اپنی جگہ لیکن فہرست بناتے ہوئے جس طرح گروپنگ کا خیال رکھا جاتا تھا اس پر ہمیشہ اعتراض ہوئے۔ پنڈی اسلام آباد کے اہل قلم کے ساتھ تو ایک اور ہاتھ بھی کیا جاتا کہ کچھ کو بطور مندوب اور کچھ کو بطور مہمان بلایا جاتا۔ یہ بدعت مسیح الدین صدیقی کے دور میں ہی شروع ہوگئی تھی، جسے فخر زمان نے ختم کیا اور نذیر ناجی نے بھی فخر زمان کی روایت پر عمل کیا یعنی مہمان اور مندوب کے فرق کو ختم کر دیا۔ مسیح الدین صدیقی کے زمانے میں شاید دوسری یا تیسری اہل قلم کانفرنس میں، میں اور منصور قیصر گیٹ پر پہنچے تو ہمیں کہا گیا کہ ہماری نشستیں گیلری میں ہیں۔ ہم گیلری میں چلے گئے، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ تو مہمانوں کی گیلری ہے۔ یہ افتتاحی اجلاس تھا۔ ضیاالحق کی تقریر کے بعد جب سب چائے کیلئے جانے لگے تو منصور قیصر نے مسیح الدین صدیقی کو آڑے ہاتھوں لیا کہ کل کے لونڈے تو مندوب ہیں اور ہم سینئر لوگ مہمان۔ مسیح الدین صدیقی نے روایتی بیوروکریسی کے انداز میں اس کا قصوروار ماتحت عملہ کو ٹھہرایا اور بڑی معصومیت سے کہا کہ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ بعد میں خالد اقبال یاسر نے بتایا کہ فہرست میں یہ ساری تبدیلیاں موصوف نے خود کی تھیں۔ اس سے ایک اگلی کانفرنس میں احسان اکبر مدعو نہیں تھے۔ میں نے اس پر خالد اقبال یاسر سے احتجاج کیا کہ نظریاتی اختلاف اپنی جگہ لیکن احسان اکبر کا مقام و مرتبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ انہیں بطور مندوب کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے۔ اس بار بھی وہی آئیں بائیں شائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ احسان اکبر نے حلقہ کے کسی جلسہ میں اکادمی کے کسی شاعر کی غزل پر کچھ زیادہ تنقید کر دی تھی۔ چنانچہ جب مدعوئین کی فہرست بنائی جانے لگی تو اُن صاحب نے احسان اکبر کا نام کاٹ دیا۔ اکادمی کے انعامات کا حال تو میں لکھ چکا ہوں کہ کیسے انعام یافتگان کی فہرست پہلے ہی بن جاتی ہے۔ پہلے یہ طریقہ تھا کہ دو یا تین جج مقرر کر کے

انہیں کتابیں بھجوادی جاتی تھیں ۔ اب ان جج صاحبان کی میٹنگ بھی بلائی جاتی ہے جس میں بلا تکلف اپنی اپنی پسند کے نام تجویز کروائے جاتے ہیں ۔ ایک صاحب جن کی حیثیت اس میٹنگ میں خواجہ کی سی ہوتی ہے کہ وہ تقریباً اب مستقل طور پر ججوں کی کمیٹی کے رکن ہیں، دوسروں کو مجبور کر کے یا" قائل " کر کے انعامات تقسیم کرواتے ہیں ۔لطف کی بات یہ ہے کہ ایک میٹنگ میں شامل ادیب اگر کسی کو لائف ایوارڈ کا انعام دیتا ہے تو اگلی میٹنگ میں انعام لینے والا میٹنگ کا رکن ہوتا ہے اور وہ اس کو انعام دلواتا ہے جس نے پہلی میٹنگ میں اس کا نام تجویز کیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کو جس سال انعام ملا وہ خود بھی کمیٹی کے چیئرمین تھے سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جس وقت قاسمی صاحب کو انعام دینے کا فیصلہ ہوا ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کمرے میں چلے جائیں ۔ ستم ظریفی یہ کہ قاسمی صاحب کو انعام دینے کے ساتھ ساتھ کمیٹی میں شرکت کا معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔

اہلِ قلم کانفرنس میں شریک ہونے اور نہ ہونے والوں کے بارے میں بحث و گفتگو تو ہوتی ہی رہی ہے اور اس میں جھوٹ سچ دونوں پہلو شامل ہوتے ہیں لیکن بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنس میں تو کمال ہی ہو گیا۔اس کانفرنس میں دنیا بھر سے اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا تھا۔ شنید یہ تھی کہ بڑے بڑے اہلِ قلم شرکت کریں گے۔کانفرنس ہوئی تو سب سے بڑا مسئلہ زبان کا آن پڑا۔ترجمان تھے نہیں اور باہر سے آنے والوں کی اکثریت ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتی تھی ، چنانچہ کانفرنس ٹولیوں کی صورت میں بٹ گئی ۔اردو بولنے والے تو ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے ،لیکن باہر سے آنے والوں سے کوئی رابطہ نہ تھا کہ نہ ہی وہ ہماری زبان سمجھتے تھے نہ ہم انکی ۔تیسرے دن خان پور ڈیم پر کھانے کا پروگرام تھا۔درمیان میں ٹیکسلا کی سیر بھی تھی۔کوسٹر میں میرے ساتھ خاطر غزنوی بیٹھے ہوئے تھے۔اگلی سیٹ پر ایک غیر ملکی جوڑا تھا۔ میں نے خاطر سے کہا،" یہ لوگ بھی کیا کہیں گے کہ ہم کیسے غیر مہذب ہیں کہ ان سے کوئی بات

نی نہیں کررہے، لیکن زبان کی مجبوری ہے۔ آپ تو کئی زبانیں جانتے ہیں، ذرا کوشش تو کریں کہ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔"

خاطر نے بات کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی چین سے آئے ہیں۔ خاطر کو ٹوٹی پھوٹی چینی آتی تھی۔ میں نے اُن سے کہا، "ان سے پوچھیں یہ کیا لکھتے ہیں۔"

خاطر غزنوی نے پوچھا تو صاحب بولے، "میں تو کچھ بھی نہیں لکھتا، میں تو انجنیئر ہوں۔"

"اور آپ کی بیگم"، خاطر نے دوبارہ پوچھا۔

"یہ بینکار ہیں۔"

"تو آپ کانفرنس میں کیسے آئے؟"

جواب ملا "آپ کے سفیر ہمارے دوست ہیں، ایک دن انہوں نے کہا، پاکستان کی سیر کرنا ہے، ہم نے کہا کیوں نہیں، سفیر بولے وہاں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہورہی ہے۔ آپ دونوں کو بھجوا دیتے ہیں، سو ہم آ گئے۔"

معلوم نہیں اس کانفرنس میں باہر سے آنے والوں میں سے کتنے ادیب اور کتنے سفیروں کے دوست تھے۔ رسول حمزہ کے علاوہ میں تو کسی کے نام سے واقف نہ تھا۔

اس کانفرنس کی تیاری کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔ ایک دن صدیق شبلی کا فون آیا کہ تمہارا فلاں افسانہ ادبیات میں چھپا تھا، اس کی دو تین سطریں پڑھی نہیں جارہی ہیں"۔

میں نے پوچھا، "کیا ضرورت پڑ گئی"۔

بولے، "کانفرنس کے لئے پاکستانی ادب کا ایک فارسی ترجمہ کرنا ہے، اس میں یہ کہانی بھی شامل ہے"۔

میں نے کہا، "تلاش کرتا ہوں، دو تین دن میں آپ کو اس کی کاپی بھجوا دوں گا"۔

بولے، "نہیں بھئی، اسی وقت تلاش کرو۔" میں نے پرسوں کتاب مکمل کر کے اکادمی

کو دینا ہے"۔

میں نے حیرت سے پوچھا، "لیکن اتنی جلدی ترجمہ کیسے ہوگا"۔

بولے، "اکادمی نے مجھے پوری کتاب کے لئے تین دن دیئے ہیں، میں بس یہ کر رہا ہوں کہ جملہ پڑھتا ہوں اور اسے فارسی میں لکھتا جاتا ہوں"۔

دو دن بعد میں کسی کام سے اکادمی کے دفتر گیا۔ اسی زمانے میں مظہر الاسلام ڈی جی تھے۔ اس کے کمرے میں ایک طرف مسعود قریشی بیٹھے ہوئے تھے ان کے ہاتھ میں ایک مسودہ تھا اور وہ سامنے بیٹھے پی اے کو انگریزی میں ڈکٹیشن دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پاکستانی ادب کا انگریزی ترجمہ ہو رہا ہے، یعنی مسعود قریشی اردو جملہ پڑھتے پھر فوراً ہی اس کا انگریزی ترجمہ لکھوا دیتے۔ ترجمہ کا یہ طریقہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ اس پر یاد آیا کہ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ ایک بار وہ اور دانی مولوی نذیر احمد کے پاس گئے تو دیکھا کہ مولوی صاحب کچھ پریشان سے ہیں۔ پوچھا، کیا بات ہے؟ کہنے لگے ایک ترجمہ کر رہا ہوں لیکن ایک لفظ کا مناسب ترجمہ نہیں ہو رہا۔ ہم نے پوچھا، "کونسا لفظ" بولے، "stallion" دانی نے جھٹ سے کہا، "کالا گھوڑا"، مولوی صاحب کو غصہ آ گیا بولے، "کیا مجھے معلوم نہیں، لیکن یہ مناسب ترجمہ نہیں"۔ فرحت اللہ بیگ کہتے ہیں کہ کوئی ہفتہ بھر بعد نذیر احمد نے بتایا کہ سوچ سوچ کر ایک لفظ ملا تو ہے لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں۔

میرا جی کے تراجم کا بھی ایک طریقہ تھا۔ ایک بار انہوں نے ایک دس سطری نظم کو تین سطروں میں اور ایک چار پانچ سطری نظم کو پندرہ سولہ لائنوں میں ترجمہ کیا، کسی نے پوچھا تو کہنے لگے۔ میں شاعر کا اسلوب تو ترجمہ نہیں کر سکتا البتہ اس کے خیال اور موضوع کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر زبان کی اپنی لفظیات اور محاورہ ہوتا ہے، چنانچہ دس سطری نظم کا خیال اردو محاورہ میں تین سطروں میں آ گیا ہے جبکہ پانچ سطری نظم کو مجھے پندرہ لائنوں میں منتقل کرنا پڑا۔

اکادمی نے جلدی میں جو تراجم کرائے وہ اتنی جلدی میں تھے کہ معلوم نہیں کہ ترجمہ ہو کر تخلیق کیا سے کیا بن گئی ہوگی۔

افتخار عارف جب نئے نئے اکادمی میں آئے اور ان کے گرد کاسہ لیسوں کا ہجوم اکٹھا نہیں ہوا تھا، تو وہ دو ایک بار میرے گھر بھی آئے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں کوئی نئی تجاویز دی جائیں۔ ایک بار فتح محمد ملک بھی ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک تو اکادمی کا اصل کام پاکستان ادب کو دوسری زبانوں میں متعارف کروانا ہے اس لئے اگر اکادمی پاکستانی لٹریچر کے نام سے چھ ماہ یا سال بعد ایک انتخاب انگریزی میں چھاپنے کا اہتمام کرے تو یہ بڑی عمدہ بات ہوگی۔ افتخار عارف کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور انہوں نے اس کام کا ڈول ڈال دیا۔ طریقہ یہ رکھا کہ ہر بار ایک مہمان مدیر پاکستانی ادب کا انتخاب کر کے اسے ترجمہ کرے یا کرائے۔ ہمارے یہاں اس طرح کے کاموں میں طور یہ ہوتا ہے کہ مرتب اپنی ایک فہرست بنا لیتا ہے اور پھر اس فہرست میں شامل لوگوں سے پوچھتا ہے کہ آپ کی کسی تخلیق کا انگریزی ترجمہ ہوا ہے۔ جواب اثبات میں ملے تو وہ ترجمہ منگوا لیتا ہے اور کتاب مرتب کر کے ادارے کے حوالے کرتا ہے اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ترجمہ کیسا ہے۔ اس کا معیار کیا ہے اور اصل سے اس کی مناسبت کتنی ہے۔ "پاکستانی لٹریچر" کے تیسرے یا چوتھے کے شمارے کے مہمان مدیر عالم گیر ہاشمی تھے۔ اس شمارے میں میرا نام بھی شامل تھا۔ ہاشمی نے مجھے فون کیا کہ اگر میرے کسی افسانے کا انگریزی ترجمہ ہوا ہے تو بھجواؤں لیکن ساتھ ہی اس کا اردو متن بھی ہو۔ میں نے انہیں ایک کہانی بھجوائی۔ دوسرے دن انہوں نے فون کیا کہ بھائی یہ ترجمہ تو درست نہیں، آپ کی کہانی کا مزاج اور موضوع تو اس میں آیا ہی نہیں۔ میں نے ایک اور کہانی مع اردو متن بھجوائی۔ اس بار بھی ان کا یہی اعتراض تھا۔ تیسری اور چوتھی کہانی پر بھی انہوں نے یہی اعتراض دہرایا۔ بالآخر طے ہوا کہ وہ میری کہانی کا ترجمہ اپنے طور پر کروائیں گے۔ یہ کہانی "ڈوبتی پہچان" تھی، جس کا

ترجمہ انہوں نے ثمینہ احمد سے کرایا۔ اس سے پہلے چار لوگ اس کہانی کا انگریزی ترجمہ کر چکے تھے لیکن ثمینہ احمد کے ترجمہ پڑھکر مجھے خود فرق کا احساس ہوا۔ عالمگیر ہاشمی کا مرتب کیا ہوا یہ شمارہ غالبًا "پاکستانی لٹریچر" کا سب سے عمدہ اور معیاری پرچہ تھا کہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے ترجمے نہیں چھاپے بلکہ ہر ترجمے کو اسکے اردو متن سے ملا کر دیکھا، پرکھا اور پھر شامل کیا۔ ترجمہ واقعی ایک مشکل فن ہے۔ جب تک دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل نہ ہو اور زبانوں کے ساتھ ساتھ ثقافتی مزاج سے آشنائی نہ ہو ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ میرا جی کہتے تھے کسی تخلیق کار کا اسلوب تو دوسری زبان میں منتقل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ موضوع اور خیال کو اسکی مکمل صحت کے ساتھ دوسری زبان میں ترجمہ کر دیں، اور اس کے لئے بھی ایک طویل ریاضت اور سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اکادمی نے بین الاقوامی کانفرنس کے لئے جو ترجمے کرائے اسکی صورت یہ تھی کہ ایک ایک کتاب کا ترجمہ ایک ایک دن ہوا۔

○

ساٹھ کی دہائی کے بعد نئے رویوں اور رجحانات کے ساتھ ساتھ بعض نئی اصناف کا بھی بڑا شہرہ ہوا۔ ان میں سے انشائیہ اور نثری نظم نے تو مباحث کے طویل سلسلے شروع کئے۔ انشائیہ کے ساتھ ہی وزیر آغا کا نام ذہن میں آیا ہے کہ اردو میں انشائیہ کی موجودہ صورت فن کے موجد وہی ہیں۔ ان کے ساتھ جن دوسرے لوگوں نے انشائیہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ان میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے علاوہ انور سدید، غلام جیلانی اصغر، انجم نیازی، اکبر حمیدی، حامد برگی سے سلیم آغا قزلباش تک لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ مشتاق قمر نے اپنا آغاز طنز و مزاح اور افسانے سے کیا تھا، پھر وہ انشائیے کی طرف آ گئے لیکن جمیل آذر نے اپنا آغاز انشائیہ ہی سے کیا۔ "برساتی" سے "شاخ زیتون" اور پھر تازہ ترین انشائیوں تک انہوں نے انشائیہ کے مزاج کو جس طرح سمجھا اور برتا ہے اس نے اردو انشائیہ کو ایک پہچان عطا کی

ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں کے پس منظر میں دیہات اور دیہاتی امیجری کا بڑا دخل ہے۔ اس کے برعکس جمیل آذر کے انشائیے شہری زندگی اور اس کے ماحول سے متعلق ہیں۔ مجھے انکے انشائیوں کی جو بات خاص طور پر پسند ہے وہ درمیانے طبقے کے مسائل اور ان کا اظہار ہے۔ جمیل آذر محبت کرنے والے پرخلوص دوست ہیں۔ رخسانہ کو ہمیشہ بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں انکی سائیکل بڑی مشہور تھی۔ وہ اپنی اس سائیکل پر سارے شہر کا چکر لگا آتے تھے۔ نائک پور والے گھر میں تو اکثر آتے تھے۔ ایک دن سائیکل پر گلستان کالونی بھی آ نکلے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ آپ اتنی دور سائیکل پر آئے ہیں۔ بولے، یہ سائیکل نہیں میری کار ہے۔ انگریزی ادب کے استاد ہیں۔ اردو میں لکھتے ہیں اس لئے ان کی تحریروں میں ایک گہرائی ہے۔ انشائیے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تنقید میں بھی اپنی ایک انفرادیت قائم کی ہے۔

○

افتخار عارف جب ڈی جی کے طور پر اکادمی میں آئے تو ان کی مشاورت کا دائرہ خاصا وسیع تھا چنانچہ اس دور میں کئی نئے کام شروع ہوئے جن میں مشاہیر پر مختصر کتابچے چھاپنے کا ایک منصوبہ بھی تھا۔ کچھ مسودے لکھوائے بھی گئے لیکن اس دور میں کوئی کتاب چھپ نہ سکی۔ فخر زمان نے اپنے کام کو خاصا پھیلا دیا اور اکادمی کو ملکی سطح سے نکال کر بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے کی کوشش کی۔ بین الاقوامی اہل قلم کانفرنس اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی، لیکن بوجوہ اس کے خاطر خواہ نتائج نہ نکلے، البتہ مشاہیر پر کتابیں لکھوانے کا سلسلہ جاری رہا۔ فخر زمان کے دور میں اردو ادب کو غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا لیکن "جلدی" نے اس منصوبے کے مناسب نتائج نہ نکلنے دیئے۔ نذیر ناجی نے مشاہیر والا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اس کی فہرست میں اضافہ کر دیا۔ میں اُس نذیر ناجی کو جانتا تھا جو ساٹھ کی دہائی میں ہمارے ساتھ "سات رنگ" اور دوسرے ادبی پرچوں میں نئی نظمیں لکھتا تھا اور نئی لسانی تشکیلات کی بحثیں

کرتا تھا۔ کالم نویس نذیر ناجی سے میرا کوئی رابطہ نہ ہوسکا کہ اُس زمانے میں وہ پیپلز پارٹی سے الگ ہوکر نوائے وقت میں شامل ہوگئے تھے۔ مجھے ان کے بہت سے کالموں سے اختلاف تھا چنانچہ جب وہ اکادمی کے چیئرمین ہوئے تو میں عرصہ تک ان سے نہیں ملا، بلکہ ایک بار بھی انکے دفتر نہیں گیا، صرف دو ایک محفلوں میں مختصر ملاقات ہوئی۔ پہلی بار وزیرِ اعظم ایوارڈ کانفرنس میں میرا خیال تھا کہ وہ میرا نام تک نہیں جانتے ہونگے کہ ساٹھ کی دہائی کے بعد وہ ایک عرصہ تک ادب سے براہِ راست متعلق نہیں رہے بلکہ وہ کل وقتی صحافی بن گئے تھے، لیکن جب میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ میرا نام رشید امجد ہے تو وہ ہنس پڑے اور بولے، اب آپ ڈاکٹر رشید امجد ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحافت میں جانے اور لکھنے کا سلسلہ چھوڑنے کے باوجود انکا ادبی مطالعہ اور ادبی ذوق قائم ہے۔

اکادمی میں دو ایسے شخص آئے جو اپنے سیاسی تعلقات کی وجہ سے بڑے طاقتور اور بااثر تھے۔ یہ فخر زمان اور نذیر ناجی ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ ان دونوں کے زمانوں میں اکادمی میں خاصا کام ہوا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اکادمی میں ادیبوں کی جو طبقاتی فہرست سازی ہوتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ ان دونوں نے خاصے کام کئے۔ دونوں کے زمانے میں ادیبوں کے بہت سے مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ پنڈی کے ادیبوں کو خیال آیا کہ یہاں ٹی ہاؤس طرح کی کوئی جگہ نہیں۔ وو گیز ختم ہوا تو شالیمار آباد ہوگیا۔ شالیمار کے بعد داتا میں محفلیں جمنے لگیں، پھر شہر میں شمع ہوٹل میں اکٹھ ہونے لگا لیکن شمع اجڑا تو بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ میں نے ایک محفل میں نذیر ناجی سے کہا کہ آپ نے ٹی ہاؤس کے لئے بہت کچھ کیا ہے انہیں نیا فرنیچر لیکر دیا ہے۔ یہاں کے ادیبوں کے لئے بھی کچھ کردیں۔ بولے "بیوروکریسی کے ہاتھوں زچ ہوں، کوئی منصوبہ بناؤں، فنڈ ہی نہیں ملتے، تاہم آپ کسی دن اکادمی آئیں، اس موضوع پر بات کرتے ہیں"۔ لیکن اس کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چند دنوں بعد ہی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور اکادمی پھر ایک پُر

خلوص شخص سے محروم ہوگئی۔نذیر ناجی سے میرے کبھی ذاتی تعلقات نہیں رہے لیکن انکی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اکادمی کے تخت پر بیٹھ کر دوسروں کی طرح خود کو بڑا ادیب ثابت کروانے کی کوشش نہیں کی ،ایک عجز انکے اندر ہمیشہ موجود رہا۔چند جزوی اختلافات سے قطع نظر میرے نزدیک فخر زمان اور نذیر ناجی کا دور اکادمی کا بہترین زمانہ ہے۔

○

ادبی دوستوں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ میرے خاندانی مراسم رہے ہیں ،ان میں غلام سرور کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ نسیم احمد اور شیراز مرزا شامل ہیں۔غلام سرور سے تو پرانی محلہ داری بھی تھی اس لئے کالج کے بعد وہ اور ان کی بیگم اکثر ہماری طرف آجاتے یا ہم لوگ شام کو ان کے یہاں چلے جاتے۔گلستان کالونی میں آئے تو سب سے پہلے جن لوگوں نے ہمیں خوش آمدید کہا ،ان میں خواجہ نسیم اور شیراز تھے۔یہ دونوں حضرات ہم سے چند ماہ پہلے ہی اس علاقے میں آئے تھے۔ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ ایسا بڑھا کہ تینوں خاندان ہفتے میں دو بار ضرور کسی ایک گھر میں اکٹھے ہوتے۔خواتین اپنی گپ شپ لگاتیں اور ہم تینوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے۔خواجہ نسیم اور شیراز مرزا کی بیگمات بھی بڑی نفیس اور مہذب خواتین ہیں۔چنانچہ تقریباً تیرہ چودہ برسوں سے ہمارے تعلقات میں وہی گرم جوشی اور محبت موجود ہے۔بچوں کے مسائل سے گھروں کے معاملات اور ملکی اور بین الاقوامی موضوعات بھی کچھ ہماری گفتگو کا حصہ ہوتے ہیں۔شیراز صاحب اب کچھ عرصہ سے امریکہ میں ہیں لیکن ڈاکٹر نسیم اور ان کی بیگم سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ڈاکٹر نسیم کے توسط سے ایک اور شخص سے بھی ملاقات کی تجدید ہوئی۔یہ گلزار آفاقی اور ان کی بیگم ہیں۔تجدید یوں کہ ایک زمانے میں جب احمد داؤد، حسن عباس رضا نیشنل کونسل آف آرٹس میں تھے تو گلزار آفاقی بھی ان کے ساتھ تھے اور ان سے اکثر ہم کو ملاقات ہوتی تھی لیکن پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ڈاکٹر نسیم سے ان کے تعلقات بہت گہرے

ہیں چنانچہ ان کے توسط سے یہ ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر بحال ہو گیا۔ گلستان کالونی کے ایک اور دوست جواب مرحوم ہو گئے ہیں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ محمد شفیق تھے۔ انہوں نے یہاں گھر بنانا شروع کیا تو گفتگو کا آغاز ہوا۔ معلوم ہوا کہ بڑے واضح نظریاتی شخص ہیں اور عملاً ترقی پسند۔ مزدور تحریکوں سے بھی رابطہ ہے۔ ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں ان کے ساتھ ہی اختر اقبال نے بھی گھر بنانا شروع کیا۔ یہ بھی ایک زمانے میں نیشنل کونسل آف آرٹس میں تھے۔ پیپلز پارٹی کے عاشق ورکروں میں سے۔ چنانچہ ہمیشہ مار کھائی اور فائدہ کوئی نہ اُٹھایا۔ ہم تینوں کا ایسا گروپ بنا کہ شام کو ہم اکٹھے شمع میں آتے اور راستے میں بھی سیاست اور ادب ہمارا موضوع ہوتا۔ پھر یہ سلسلہ یوں ٹوٹا کہ شفیق صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بظاہر چوٹ ٹانگ پر آئی تھی لیکن گردوں پر بھی چوٹ لگی تھی۔ ٹانگ کی ہڈی جوڑنے کے لئے بے ہوش کیا گیا تو ہوش ہی میں نہ آئے۔ ان کی موت کے کتنا ہی عرصہ بعد تک میں ایک عجیب طرح کی اداسی میں رہا۔

○

پچھلی ایک دہائی میں ساختیات کی بحث بڑے زور وشور سے ہوئی ہے لیکن کسی نے بھی ساختیاتی مطالعے کرنے کی کوششیں نہیں کیں۔ زیادہ تر مضامین ترجمہ ہیں۔ میں کسی نئے رویے یا رجحان کا مخالف نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی نیا رویہ یا رجحان کسی نہ کسی حوالے سے ہمارے تہذیبی مزاج سے متعلق ہونا چاہیے۔ ساختیات سے اردو والوں کی پہلی شناسائی لنڈا ونگ کے ذریعے ہوئی۔ یہ خاتون اسی (۸۰ء) کی دہائی میں جدید اردو افسانے پر کام کرنے کے سلسلے میں امریکہ سے پہلے بھارت اور پھر پاکستان آئی۔ ساختیات کا لفظ پہلی بار لوگوں نے اسی سے سنا۔ لنڈا نے کچھ افسانوں کا ساختیاتی مطالعہ بھی کیا۔ اس نے انتظار حسین، انور سجاد، خالد حسین اور میرے افسانوں پر بھی اس حوالے سے مضامین لکھے تھے۔ ان مضامین میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ کسی افسانے میں کوئی لفظ کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ لنڈا

نے کچھ چارٹ بھی بنوائے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کسی کہانی میں کسی لفظ کے استعمال کی تعداد کا ذکر کرنے سے اس کی کیا مراد ہے۔ اس سے وہ کیا بتانا چاہتی ہے لیکن اس کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ ساختیات پر اب نئی کتابیں اور بے شمار مضامین موجود ہیں لیکن عملی کام نہ ہونے کے برابر ہے یعنی ابھی تک کسی نے یہ زحمت نہیں کی کہ کسی فن پارے یا فنکار کا ساختیاتی مطالعہ کر کے یہ بتائے کہ اس مطالعے کے نتیجے میں اس فن پارے یا فنکار کا کون سا نیا پہلو سامنے آیا ہے جو اب تک نظروں سے اوجھل ہے۔ جہاں تک ساختیات کا تعلق ہے اس کے ڈانڈے تو ہماری مشرقی تنقید میں موجود ہیں۔ ہمارے تذکروں کا رویہ یہی تھا۔ ساختیات کی بحث ابھی چل رہی تھی کہ ردِ ساختیات بھی شروع ہو گئی۔ ابھی ساختیاتی مطالعے شروع ہی نہیں ہوئے تھے کہ ردّ کی بات بھی ہونے لگی۔ بہر حال اس حوالے سے وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، فہیم اعظمی، قمر جمیل نے بڑے معلوماتی مضامین لکھے ہیں، لیکن یہ موضوع زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا کہ اکثر بحثوں میں بات شخصیت اور ان کے نظریات تک ہی محدود رہی ہے۔ اسی طرح جدیدیت سے ردّ جدیدیت تک کی بحثوں میں بھی شخصی تنازعہ زیادہ دکھائی دیتا ہے، جدیدیت تو اب جا کر کہیں واضح ہونے لگی ہے۔ مقدار میں سے معیار کے چناؤ کا وقت آیا ہے اور ہم نے اس کے ردّ کی باتیں بھی شروع کر دی ہیں۔ یہ مغرب کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا رویہ نہیں بلکہ بھونڈی نقالی اور سرخیل بننے کی ذاتی تمنا یا انا ہے۔

○

کوٹہ سسٹم نے ہمارے سیاسی نظام میں نت نئے مسائل تو پیدا کیے ہیں، ادب میں بھی کوٹہ سسٹم کی وجہ سے بعض دوسرے درجے کے ادیب قومی سطح پر آ گئے ہیں۔ اکادمی کے لیے کوئی انتخاب کرتے وقت، یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ بھائی ذرا پسماندہ علاقوں کا بھی خیال رکھنا۔ میں جب مزاحمتی ادب کا انتخاب کر رہا تھا تو فخر زمان نے مجھے ایک لفافہ دیا کہ اس میں کچھ ایسی

تخلیقات ہیں جو پسماندہ علاقوں کے ادیبوں کی ہیں اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں بھی انتخاب میں شامل کر لیا جائے، کیونکہ یہ خبر عام ہوگئی ہے کہ اکادمی یہ انتخاب چھاپ رہی ہے۔ میں نے فخر زمان سے کہا کہ ضیاء، مارشل لاء کے خلاف اتنا کچھ لکھا گیا کہ اگر کم از کم فنی معیار مقرر کر کے بھی انتخاب کیا جائے تو کئی جلدیں بنیں گی۔ میں جو انتخاب کرانا چاہتا ہوں وہ ایسا ہو کہ فنی اقدار پر تو پورا اترے، چنانچہ میں اگر آپ کے دیے ہوئے لفافے سے استفادہ کر سکا تو ضرور ورنہ معذرت۔ فخر زمان نے اصرار نہیں کیا۔

ضیاء کے بعد بڑے بڑے لوگوں نے دعوے کئے کہ انہوں نے مارشل لاء میں بڑی ذہنی اذیت برداشت کی ہے اس لئے انہیں اس کا صلہ ملنا چاہئے۔ ایک صاحب نے تو باقاعدہ پمفلٹ نما رسالہ شائع کر کے اپنے اشعار چھاپے جو بقول ان کے ضیاء، مارشل لاء میں لکھے گئے تھے۔ ان دنوں ایک لطیفہ بھی مشہور تھا کہ کسی محفل میں ایک صاحب نے کہا کہ میں بتا نہیں سکتا کہ میں نے مارشل لاء میں کتنی ذہنی اذیت اٹھائی ہے۔ اس پر ایک اور صاحب جو ضیاء دور میں بڑے مراعات یافتہ تھے بولے، آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو ضیاء سے کوئی رعایت لیتے ہوئے میں محسوس کرتا تھا۔ ایک ہمارے دوست اظہر جاوید ہیں کہ مسلسل مارشل لاء کے خلاف لکھا، امروز کی نوکری جاتی رہی اور جب خلعتیں بٹنے کا وقت آیا تو وہ خرقہ پہن کر ایک طرف ہو گئے۔ مزاحمتی ادب کا انتخاب کرتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کون سی نظم شامل کروں۔ انہوں نے ایک نظم کی نشاندہی کر دی۔ انتخاب چھپ گیا تو اکادمی سے ناراض ہو گئے۔ اپنی جگہ وہ ٹھیک تھے کہ اکادمی نے کتاب بھیجنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی حالانکہ فخر زمان سے یہ طے ہوا تھا کہ جن حضرات کی تخلیقات انتخاب میں شامل ہوں گی ان کو اعزازی کاپی بھجوائی جائے گی۔ اظہر جاوید نے وکیل کے ذریعے نوٹس بھجوا دیا کہ میری اجازت کے بغیر نظم کیوں شامل کی گئی ہے۔ مظہر الاسلام اُس زمانے میں ڈی جی تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ میں

نے جواب دیا کہ میں نے تو اظہر جاوید سے پوچھ لیا تھا بلکہ میں اس کی جو نظم شامل کرنا چاہتا تھا اس نے اس کی بجائے دوسری نظم شامل کرنے کو کہا تھا۔ مظہر نے کہا تو پھر یہ ساری باتیں اسٹامپ پیپر پر لکھ دو تاکہ عدالت میں پیش کی جا سکیں۔ فخر زمان کے زمانے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نذیر ناجی اکادمی میں آئے تو انہوں نے بڑی بردباری اور سلیقہ سے یہ مسئلہ حل کر لیا۔ مزاحمتی ادب کی تقریب ہوئی تو سٹیج پر فخر زمان کے ساتھ غضنفر مہدی بھی براجمان تھے۔ مرتب کی حیثیت سے میں بھی موجود تھا۔ فخر زمان کے بائیں غضنفر مہدی اور دائیں طرف میں تھا۔ مجھے بڑا محسوس ہوا کہ کل تک جو لوگ ضیاء کے قصیدے پڑھتے تھے وہ آج بھی اسی طرح سٹیج پر موجود ہیں چنانچہ جب میری باری آئی تو انتخاب کے بارے میں چند باتیں کہہ کر میں نے کہا کہ صدر صاحب اب میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق انتخاب سے تو نہیں لیکن اس تقریب کے حوالے سے ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ غضنفر مہدی مارشل لاء کے وزیروں کے ساتھ اسی طرح سٹیج پر بیٹھ کر ان کی زبان بولتے تھے اور یہ آج بھی وہیں بیٹھے ہیں اور اب مزاحمتی ادب کی حمایت کر رہے ہیں اس پر ہال میں تو واہ واہ کا شور گونج اٹھا لیکن غضنفر مہدی ناراض ہو گئے۔

○

اوراق نکلنے سے پہلے میں عارف عبدالمتین کے مقام و مرتبہ سے تو واقف تھا لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اوراق کی وجہ سے ان سے تعلقات کا سلسلہ شروع ہوا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ میں جب بھی لاہور جاتا چشتیہ ہائی سکول میں ان کی رہائش گاہ پر حاضری دیتا اور وہ بھی جب پنڈی آتے تو غریب خانے پر تشریف لاتے۔ میں ان دنوں نانک پورہ والے گھر میں رہتا تھا۔ قریب ہی اکال گڑھ میں انکے ایک دوست تھے جن کے یہاں وہ ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ دوست اب ایک بیکری چلاتے ہیں۔ انہوں نے ہی "ماحول" کے نام سے پنڈی سے ایک ادبی پرچہ شروع کیا تھا۔ عارف عبدالمتین بہت ہی نفیس، دھیمے لہجے میں بات کرنے والے، محبت سے

بھرے ہوئے شخص تھے۔ عارف عبدالمتین کے بعد میں نے جس شخص میں یہ نفاست، دھیما پن اور محبت دیکھی وہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات اہل قلم کانفرنس میں ہوئی تھی، ہمارے نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن وہ ہمیشہ بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے اور انتہائی محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ عرصہ سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن انہوں نے اب بھی مجھے یاد رکھا ہوا ہے اور جب بھی انکی کوئی نئی تصنیف آتی ہے تو عطا فرماتے ہیں۔ عارف صاحب کے توسط سے حسن بخت سے بھی انہیں دنوں ملاقات ہوئی وہ عارف صاحب کے ساتھ ہی چشتیہ ہائی سکول میں پڑھاتے اور گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ ایک شام شالیمار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ ایک نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوئے معلوم ہوا کہ یہ انکا بیٹا ہے اور آئی ایس ایس بی کے لئے کوہاٹ جارہا ہے یہ راشد حسن رانا تھا۔ راشد حسن رانا کی دو تین نظمیں اوراق میں چھپ چکی تھیں اس لئے میں اسکے نام سے آشنا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ فوج میں نہیں گیا ورنہ معلوم نہیں وہ فوج کا کیا حشر کرتا۔ ایک عرصہ بعد راشد حسن رانا قائداعظم یونیورسٹی کے شعبہ مطالعہ پاکستان میں آ گیا۔ اب اس نے اردو کے ساتھ پنجابی شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ پنجابی ہی کی طرف آ گیا۔ راشد حسن رانا جملے بازی میں جواب نہیں رکھتا۔ یہ بڑے مزے کے دن تھے بے فکری، ادبی بحثیں اور دنیا بھر میں انقلاب لانے کے لئے سہانے خواب، اب کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک سرد آہ نکلتی ہے۔

○

شام کو شالیمار میں جانا عبادت کی طرح تھا۔ آندھی ہو یا بارش شالیمار یاترا میں فرق نہ پڑتا۔ میری شادی کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک شام میرے سسر کیانی صاحب آ گئے۔ سات بجے تو میں نے اُن سے کہا "آپ بیٹھیں، میں ذرا شالیمار سے ہو آؤں"۔ رخسانہ نے بہت کہا کہ آج نہ جائیں مگر میں نہ مانا اور کیانی صاحب کو گھر چھوڑ کر شالیمار چلا گیا۔ مرحوم جب تک زندہ

رہے ا شد مجھے چھیڑ تے کہ بھئی شالیمار تمہیں اتنا عزیز ہے کہ تم نے میری پرواہ بھی نہیں کی۔

اس زمانے میں کبھی بھی ایک دو بجے سے پہلے گھر آنا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار جانے کیا ہوا، شاید کوئی بھی شالیمار نہیں آیا، میں نو بجے تک انتظار کر کے گھر چلا آیا۔ امی پریشان ہو گئیں۔ کبھی میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتیں، کبھی گالوں پر، اور بار بار پوچھتیں "تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا"۔ تنگ آ کر میں نے کہا "ہوا کیا ہے"۔ بولیں "آج تو جلدی گھر آ گیا ہے۔ ضرور تیری طبیعت خراب ہے۔"

کئی بار یوں ہوتا کہ جیب بالکل خالی ہے، میں پیدل ہی چل پڑتا۔ شالیمار میں کوئی نہ کوئی تو موجود ہی ہوتا، چائے مل جاتی۔ ایک بار یوں ہوا کہ مجھے بخار تھا اور موسم بھی ابر آلود، جیب خالی۔ میں ماں کے منع کرنے کے باوجود نکل پڑا۔ شالیمار کے قریب ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ بارش تیز ہو گئی۔ اس دن کوئی بھی نہ آیا۔ میں کونے والی میز پر اکیلا بیٹھا، دروازے کو تکتا رہا کہ کوئی آئے تو چائے کی پیالی ملے۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور بخار کی تپش سے میرا جسم بھی گرم سے گرم تر ہونے لگا۔ بارش رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ساڑھے دس بج گئے۔ بیروں نے بتیاں بجھانی شروع کر دیں۔ میں اپنے آپ کو کوستا باہر نکلا۔ بارش کے رکنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ آدھا گھنٹہ برآمدے میں کھڑا رہا۔ آخر تنگ آ کر بارش کے سمندر میں اتر پڑا۔ راستے بھر خود کو گالیاں نکالتا رہا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے یہ حال تھا کہ سارے جسم سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کئی دن بیمار رہا۔ ٹھیک ہوتے ہی پھر وہی شالیمار۔

اس زمانے میں شب نوردی کا یہ حال تھا کہ امی کے بار بار روکنے کے باوجود شام ہوتے ہی یوں لگتا جیسے کوہ ندا سے آواز آ رہی ہے اور میں "آ رہا ہوں" کہتا شالیمار کی طرف دوڑ پڑتا۔ شادی ہوئی تو مہندی کی رات بھی میں نو بجے شالیمار سے لوٹا۔ امی کا غصے کے مارے برا حال کہ کم سے کم آج کے دن تو گھر میں رہتے۔ چند دن گزرے تو امی نے رخسانہ سے کہا کہ میں

تو اسے شام کو باہر جانے سے نہ روک سکی ،اب یہ کام تم کرو۔ میں ایک رات حسب معمول دیر سے لوٹا تو باہر کا دروازہ بند ، دستک دی تو اندر سے رخسانہ نے کہا "دیر سے کیوں آئے ہیں ، دروازہ نہیں کھلے گا" میں نے کہا "اچھی بات ، میں جارہا ہوں" اُس دن کے بعد میں دو دن گھر ہی نہیں گیا۔ رات داؤد کی بیٹھک میں سوجاتا تیسرے دن علیا چاچا صبح صبح کالج آئے اور خوب سنائیں ۔اس کے بعد رخسانہ سے ایک خاموش سمجھوتہ ہوگیا۔ امی خوب ہنسیں اور بولیں ''تمہیں کوئی ٹھیک نہیں کرسکتا۔'' برسہا برس یہ سلسلہ یوں ہی رہا،لیکن اب ایک تو ہمت جواب دے گئی ہے اور دوسرے یہ شب نورد بھی بکھر گئے ہیں،وہ بھی کیا دن تھے ،وقت چہرے ہی نہیں بدلتا، عادات واطوار بھی تبدیل کر دیتا ہے۔اب تو یہ باتیں خواب لگتی ہیں،ایک ایسا خواب جسے دیکھنے کو بار بار جی چاہتا ہے۔

○

ہر شخص پر افراط وتفریط کے دور تو گذرتے ہی رہتے ہیں۔ایک زمانے میں ہم بھی بڑے انتہا پسند تھے اور مختلف آراء میں کھل کر اپنے تعصبات کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے۔ جوش کے بارے میں ہماری رائے اچھی نہ تھی۔ "یادوں کی برات" آئی تو یہ رائے اور پکی ہوگئی۔ انہی دنوں ایک شام میں اور سرور کامران کیفے میں گئے تو سلطان رشک ایک اجنبی شخص کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ اُس نے ہمارا تعارف کروانے کی بجائے کہا یہ حضرات جوش کو نہیں مانتے۔ اُن شریف آدمی نے بغیر سوچے سمجھے کہا جو شخص جوش کو نہیں مانتا وہ جاہلِ مطلق ہے۔ ہمیں تاؤ آگیا۔ بحث شروع ہوگئی اور ایک دوسرے کے خلاف وہ گرما گرمی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اس دوران سلطان رشک مسکراتا اور لقمے دیتا رہا۔ بڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحب اختر انصاری اکبرآبادی تھے جو حیدرآباد سے آئے تھے۔ سلطان رشک نے شرارتاً اُنکا تعارف نہیں کروایا تھا۔

○

حفیظ جالندھری انا کا عجیب وغریب نمونہ تھے۔ کوئی چیز انکے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو بپھر جاتے۔ عزیز ہاشمی کے ساتھ انکے بڑے گہرے مراسم تھے۔ جب بھی پنڈی آتے، ان ہی کے یہاں قیام کرتے۔ ماجد الباقری کے حوالے سے میری بھی ان سے شناسائی تھی۔ حفیظ صاحب آتے تو عزیز ہاشمی کچھ دوستوں کو بلا لیتے۔ ان ملاقاتوں میں حفیظ صاحب کھل کر گفتگو کرتے۔ باتوں، شعروں کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی سناتے۔ ایک بار نیشنل سنٹر میں مشاعرہ تھا۔ حفیظ صاحب صدارت کر رہے تھے۔ سامعین میں کالجوں کے کچھ لڑکے اور خواتین بھی تھیں۔ ہر شاعر ہوٹنگ کا نشانہ بنتا۔ حفیظ صاحب نے دو تین بار انہیں روکا لیکن لڑکے کہاں باز آتے تھے۔ آخر حفیظ اٹھ کر مائیک کے پاس گئے اور ایسی بے نقط سنائیں کہ تمام خواتین شرم کے مارے ہال سے نکل گئیں۔ اس کے بعد کوئی شاعر ہوٹ نہیں ہوا۔ اکادمی کی کانفرنس کا آخری پروگرام ایوان صدر میں چیدہ چیدہ ادیبوں کا کھانا ہوتا تھا۔ کھانے سے پہلے چھوٹا سا مشاعرہ بھی ہوتا۔ ضیاء الحق کا دور تھا۔ حفیظ بھی موجود تھے۔ شاید ضیاء الحق صحیح طرح اُن سے نہیں ملے۔ حفیظ کے چہرے پر ایک ناگواری سی تھی۔ جب انکی باری آئی تو بولے، "اب میں ایسی چیز پڑھوں گا کہ ضیاء الحق کو بھی کھڑا ہونا پڑے گا"۔ اس کے بعد انہوں نے ترانہ شروع کر دیا اور ٹھہر ٹھہر کر مصرعے دہرا دہرا کر اُسے اتنا طویل کر دیا کہ ختم ہونے پر لوگوں نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ معلوم نہیں ضیاء الحق پر کیا گذری۔

○

رابطہ کے ساتھیوں میں پرتو روہیلہ سے شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے حوالے سے ایک الگ تعلق تھا۔ اُنکے گھر رابطہ کا اجلاس ہوتا تو وہ اور انکی بیگم ایک ایک کو پوچھتے۔

میرے گھر جتنے بھی جلسے ہوئے اُن میں دونوں میاں بیوی آئے۔ پرتو روہیلہ غالب کے قدردانوں میں سے ہیں۔ اس حوالے سے بھی ان سے ایک انسیت ہے۔ عمدہ نظم کہتے ہیں۔ مجلسی آدمی ہیں۔ رابطہ کے فعال رکن ہیں۔

اتنے سارے لوگوں کا ذکر کرتے کرتے دفعتاً رحمان شاہ عزیز یاد آ گئے ہیں۔ اب ان کو فوت ہوئے بھی عرصہ گذر چکا ہے لیکن انکی یادیں اسی طرح تروتازہ ہیں۔ شاہ جی نیوی کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے۔ بیوی بچے کراچی میں، یہاں بھائی کے پاس رہتے تھے۔ یار دوست شخص تھے۔ پینے پلانے کا شوق تھا اور کبھی کبھی اسی حالت میں محفلوں میں بھی چلے آتے۔ ایک بار لکھنے والوں کی انجمن کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں صدارت کر رہا تھا۔ افسانہ پڑھا گیا تو بحث شروع ہوئی۔ شاہ جی نے مداخلت کر کے کہا کہ منٹو کے افسانوں پر بات ہونا چاہئے۔ میں نے ان کی توجہ دلائی کہ گفتگو اس افسانے پر ہو رہی ہے منٹو پر گفتگو پھر کبھی ہوگی مگر شاہ صاحب کا اصرار تھا کہ گفتگو ہوگی تو منٹو پر ہی ہوگی۔ منٹو کے بعد تو افسانہ لکھا ہی نہیں گیا۔ بڑی مشکلوں سے انہیں چُپ کرایا۔ شاہ صاحب ہماری شام کی نشستوں کے ریگولر ساتھی تھے۔ انکے افسانوں کا ایک ہی مجموعہ شائع ہوا ہے۔

جن لوگوں کے مجموعے وقت پر شائع نہ ہو سکے اور اس کا انکو خاصا نقصان ہوا ان میں اقبال کوثر بھی شامل ہیں۔ جس زمانے میں شالیمار کی محفلیں عروج پر تھیں، اقبال کوثر پنڈی میں ہی تھے۔ سپریم کورٹ میں بھٹو کا کیس آخری مراحل میں تھا۔ شام کو منظور عارف اور اختر حسین جعفری کے قانونی دلائل سننے والوں میں اقبال کوثر بھی شامل تھے پھر وہ جہلم واپس چلے گئے اور روزانہ کا رابطہ ٹوٹ گیا۔

شاعر دوستوں میں سے سلطان صبروانی سے شعر کا تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیریت بھی ایک مشترکہ رشتہ ہے۔ کشمیریوں کے ذوق و مزاج کے مطابق انہیں کھلانے کا شوق ہے۔ کھلاتے جاتے ہیں اور تعریفیں کرواتے جاتے ہیں۔ مخلص دوست اور عمدہ شاعر ہیں۔

ضمیر جعفری کو لوگ مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اُنکے سنجیدہ کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔ انکی شخصیت میں ایک عجیب تضاد تھا۔ سر جھکانے پر آتے تو جھکتے ہی چلے جاتے، سر اٹھاتے تو پھر شان ہی اور ہوتی۔ ایک اہل قلم کانفرنس میں ضیاءالحق سے کہنے لگے "ایک بات کرنا چاہتا ہوں"۔

ضیاءالحق نے کہا، "جعفری صاحب کہیئے"۔

بولے "آپ نے چکوال میں کیڈٹ کالج بنانے کا اعلان کیا ہے"۔

ضیاءالحق کی باچھیں کھل گئیں۔ "جی ہاں"

بولے "ایک کیڈٹ کالج پر جتنے اخراجات آئیں گے ان سے کئی عام کالج بن سکتے ہیں"۔

ضیاءالحق نے کہا "جعفری صاحب کیڈٹ کالج سے جو نسل نکلے گی وہ عام کالجوں سے تو نہیں نکل سکتی۔ کیڈٹ کالج کی تربیت سے لیڈرشپ پیدا ہوگی"۔

ضمیر جعفری بولے "آپ کہاں سے آئے ہیں، آپ نے تو ٹاٹ کے سکول میں پڑھا ہے"۔

ضیاءالحق چُپ ہوگئے۔

ضمیر جعفری دوستوں کے دوست تھے۔ کسی کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے۔ میرے انکے ساتھ بہت گہرے مراسم نہ تھے اس کے باوجود جب بھی ملتے "پاکستانی ادب" کی تعریف کرتے۔ انہوں نے گلزار جاوید کے اشتراک سے "چہارسو" نکالا تو کئی بار اسکے گوشے کے لئے کہا۔ میں بھی اپنی مصروفیت کی وجہ سے توجہ نہ دے سکا۔ بالآخر گلزار جاوید نے اصرار کر کے گوشہ مرتب کر ہی لیا۔ گلزار جاوید خود ایک افسانہ نگار ہیں اور "چہارسو" کو ایک عبادت سمجھ کر نکال رہے ہیں۔ ضمیر جعفری سے انکی عقیدت کا یہ حال ہے کہ انکی وفات کے بعد بھی پرچہ پر بانی مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے انکا نام درج ہوتا ہے۔ گلزار جاوید ادیبوں کے قدردان ہیں۔ پنڈی آنے والے اکثر ادیبوں کو اپنے گھر مدعو کرتے ہیں اور فون کر کے دوستوں کو جمع

کرتے ہیں۔ اس دورِ بے مروت میں ایسا خلوص قابلِ احترام ہی تو ہے۔

جمیلہ شاہین بڑی ذہین خاتون تھیں۔ میں نے انکے عروج وزوال کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ حلقہ میں انکے مضامین نئی نئی بحثوں کا آغاز بنے۔ یہ انکے عروج کا زمانہ تھا پھر جانے کیا ہوا کہ انکا زوال شروع ہوگیا۔ وہ سی بی کالج میں پڑھاتی تھیں، ٹی وی کا آغاز تھا۔ انہوں نے بھی ایک سیریل شروع کردی۔ غالباً ٹی وی ہی میں انہیں نشہ کی لت پڑی۔ پھر یہ حال ہوا کہ ملازمت بھی جاتی رہی۔ پیسے پیسے کو محتاج ہوگئیں۔ ایک شام میں صدر مارکیٹ کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اچانک سامنے آگئیں۔ میری قمیض کے بٹن کو پکڑ لیا اور بولیں "مجھے ایک روپیہ دو"۔ میری جیبیں خالی تھیں، روپیہ کہاں سے دیتا۔ انکا یہ حال کہ روپیہ کی تکرار کئے جارہی ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے گریبان چھڑایا۔ ابھی آتا ہوں کہہ کر جان چھڑائی۔ لیکن ساری رات نہ سوسکا۔ یاد آتا کہ وہ کیسا زمانہ تھا جب وہ بڑے طمطراق سے حلقہ میں آتی تھیں اور اب؟

ایک زمانہ میں وہ تقریباً گھر میں بند ہوگئی تھیں، وہ یا ان کا کتا۔ میں نے اس پر "ریت، کرسی اور موت" کے عنوان سے کہانی لکھی تھی۔ انکو اس حال پر پہنچانے میں بہت سے شاعروں کا بھی حصہ ہے جو جگہ کی تلاش میں شام کو بوتل لے کر انکے گھر پہنچ جاتے تھے۔ شروع میں ممکن ہے وہ نہ پیتی ہوں مگر آہستہ آہستہ وہ ان محفلوں میں عملاً شامل ہوگئیں۔ پھر لوگ تو چلتے بنے اور انکو لت لگ گئے۔ آخر آخر تو وہ ہیروئن کی عادی ہوگئی تھیں۔ ایسی ذہین خاتون کا یوں برباد ہونا واقعی ایک المیہ ہے۔

ضیغم زیدی کے ساتھ اکثر سیاسی گپ شپ ہوتی ہے۔ وہ بڑے عمدہ فوٹوگرافر ہیں۔ ان کی ایک یادگار تصویر ہے جس میں ایوب خان تقریر کررہے ہیں اور بھٹو صاحب غور سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔ ضیغم نے فوٹوگرافی میں تخلیق نو کا ذائقہ پیدا کردیا ہے۔ اس کتاب کے سرورق کی تصویر بھی انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ کراچی کے دوستوں میں سے سید مظہر جمیل، مسلم شمیم، راحت سعید اور

مبین مرزا سے ایک نظریاتی وابستگی ہے۔ سید مظہر جمیل اردو فکشن کے بہت ہی زیرک نقاد ہیں۔ انکی کتاب ''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' اپنے موضوع کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار سندھ کے مسئلہ کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید میں بھی ایک اضافہ ہے۔ مظہر جمیل بڑی نفیس شخصیت کے مالک ہیں۔ دوست نوازی اور مہربانی کے ساتھ ساتھ انکساری انکی وہ خوبیاں ہیں جو دشمنوں کا دل بھی موہ لیتی ہیں۔

مسلم شمیم ان ترقی پسندوں میں سے ہیں جو کتاب کی بجائے زندگی کو نظریہ کا ماخذ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انتہا پسندی کی بجائے بڑے دھیمے پن مگر مستقل مزاجی سے اپنا مشن جاری رکھا ہے۔ دوستوں کے دوست اور مجلسی آدمی ہیں۔ سرور میں آئیں تو خوب چہکتے ہیں۔ بھٹو صاحب کے بہت قریب رہے ہیں مگر انہوں نے ان تعلقات کا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ سچے اور کھرے شخص ہیں۔

راحت سعید سے میرا تعلق خاصا پرانا ہے۔ جس زمانے میں اعجاز راہی پی آئی اے کراچی آفس میں تھا راحت سعید سے ملاقات کی کوئی سبیل نکل ہی آتی۔ پھر جب وہ پی آئی اے سے نکالا گیا اور اُس نے وقار النساء سکول کے سامنے گھر لیا تو راحت سعید وہاں دو تین بار آئے۔ میں انہیں بڑا متوازن ترقی پسند سمجھتا ہوں۔ ایڈونچرازم کی بجائے وہ ترقی پسندی کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں اور اسی لئے ترقی پسند تحریک میں ان کا کام اور مقام بہت ہے۔ حسن عابد بھی پرانے ترقی پسند ہیں۔ ان کی شاعری ان کے نظریات کی ترجمان ہے۔ وہ اور ان کے دوست ارتقاء کے ذریعے جو خدمت سرانجام دے رہے ہیں اس نے ترقی پسند تحریک کو ایک نیا مزاج عطا کیا ہے۔ ارتقاء کا پورا گروپ ہی متوازن لوگوں کا ہے۔ یہ لوگ زبانی جمع خرچ کی بجائے کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ارتقاء نے روشن خیالی کی جو شمع روشن کی ہے اس کی چمک انہی لوگوں کے دم قدم سے ہے۔

مبین مرزا سے پہلا تعارف ''مکالمہ'' کے حوالے سے ہوا۔ پھر افسانہ اس تعارف کی ایک مضبوط بنیاد بن گیا۔ ملاقات ہوئی تو ان کی نفاست نے دل موہ لیا۔ وہ افسانے کے زیرک

نقاد بھی ہیں اور تنقیدی حوالے سے اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔ "مکالمہ" جدید طرزِ فکر کے ساتھ ساتھ ایک نظریاتی پہچان بھی رکھتا ہے۔

اعجاز راہی کے وقارالنساء والے گھر میں امراؤ طارق سے بھی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں پولیس میں تھے۔ اُن دنوں ایم کیو ایم کے بڑے چرچے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ یکدم ایم کیو ایم کہاں سے نکل آئی" کہنے لگے "کراچی کے لوگوں کے لئے بھی یہ ایک سوال ہے۔ ایک دن اٹھے تو سارے کراچی میں ایم کیو ایم کے بینر لگے ہوئے تھے"۔ امراؤ طارق عمدہ افسانے لکھتے ہیں۔ پولیس کی ملازمت چھوڑ کر اب انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

امراؤ طارق کے توسط سے فردوس حیدر سے بھی غائبانہ تعارف ہوا۔ بعد میں اہلِ قلم کانفرنسوں میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ افسانے کے ساتھ ساتھ مضامین بھی لکھتی ہیں اور اپنے خیالات میں بڑی واضح ہیں۔ ترقی پسند رویوں کے حوالوں سے زاہدہ حنا کے کام سے بھی مجھے دلچسپی رہی ہے۔ ان سے زیادہ ملاقاتیں تو نہیں ہوئیں۔ ہاں ان کے افسانے، مضامین اور کالم میرے مطالعے کا حصہ ہیں۔

کراچی کے دوستوں میں سے راغب شکیب اور انکی بیگم سیما شکیب سے میرا تعارف اس زمانے میں ہوا جب راغب سرگودھا میں تھے۔ اوراق ہمارے درمیان ایک ایسا رابطہ تھا جس نے ہمیں ایک دوسرے سے غائبانہ متعارف کروا دیا۔ کراچی جا کر انہوں نے "ارتکاز" نکالا تو یہ سلسلہ دوبارہ بحال ہو گیا۔ وہ اور ان کی بیگم پنڈی آئے تو میرے یہاں بھی آئے۔ شعروشاعری اور کراچی کی ادبی سیاست کے حوالے سے طویل گفتگو ہوئی۔

کراچی کے بے شمار لکھنے والوں سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ کسی کی تحریر تو ایک تعارف ہوتی ہی ہے لیکن جن لکھنے والوں سے کئی بار ملنا ہوا اور ان کی تحریروں نے بھی متاثر کیا، ان میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر سحر انصاری اور حمایت علی شاعر کے نام اس وقت ذہن

میں آ رہے ہیں۔

پنڈی کے ترقی پسندوں میں متوازن سوچ رکھنے والوں میں سے روش ندیم نے اپنی شاعری اور مضامین سے سب کو چونکایا ہے۔ وہ نظریاتی وابستگی کے ساتھ ساتھ ادب کے سنجیدہ طالب علم ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "ٹشو پیپر پر لکھی نظمیں" موضوع بحث بنا ہے اور یہ کسی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس پر گفتگو ہوتی ہے۔

ارشد معراج اور تابش کمال بھی نئی نسل کے ایسے ابھرتے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شعری پہچان بنالی ہے۔ ارشد معراج کا زیادہ میلان نظم کی طرف ہے۔ تابش غزل اور نظم دونوں میں رواں ہیں۔ تصوف کی روایت انہیں اپنے والد باغ حسین کمال سے ورثہ میں ملی ہے۔

غلام نبی اعوان ان دوستوں میں سے ہیں جنہیں میں ان کی اُصول پسندی کی وجہ سے پسند کرتا ہوں۔ فوجی ملازمت ان کے ادبی ذوق کو ختم نہ کرسکی۔ انکے خاص میدان تنقید اور ہلکی پھلکی نثر ہے۔ میجر سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ایک دن میں نے پوچھا، "آپکے ساتھی تو اس سے کہیں نکل گئے اور آپ میجری پر ہی رک گئے"۔ بولے "یہ بھی غنیمت ہے کہ میجر بن گیا ورنہ میرے طور طریقے ایسے تھے کہ میں یہاں بھی نہ پہنچتا"۔ یہ بات واقعی سچ ہے۔ وہ اُصولوں کے معاملے میں سینئر کے سامنے بھی ڈٹ جاتے تھے۔ ایک بار کسی میٹنگ میں انکے کمانڈنٹ نے اصولوں کے حوالے سے بڑی موثر تقریر کی اور آخر میں کہا کہ میں نے کبھی کسی غلط کام کی سفارش نہیں کی"۔ یہ کھڑے ہوگئے اور بولے "سر آپ نے اسی ہفتہ تین ایسی چٹیں بھیجی ہیں جن میں غلط کاموں کی سفارش کی گئی ہے"۔ اگلے دن اُنکی ٹرانسفر ہوگئی۔ کھاریاں میں ملٹری پولیس کے انچارج تھے۔ ایک کار روزانہ گرلز کالج کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ پتہ کرایا تو معلوم ہوا کسی بڑے فسر کا بیٹا لڑکیوں کی ٹوہ میں آتا ہے۔ انہوں نے مقامی کمانڈر کو اطلاع کرنے کی بجائے سیدھا جی ایچ کیو کو لیٹر لکھ دیا۔ دو تین ... بعد ڈیٹی ہوگئی اور پھر ٹرانسفر۔ ملازمت کے دوران ان کا بستر

انکے کندھوں پر ہی رہتا تھا۔ اس بے سروسامانی میں بھی ادبی ذوق کو مرنے نہیں دیا۔ جب بھی موقع ملتا ادبی محفلوں میں آنکلتے۔ ملتان میں قیام کے دوران عرش صدیقی، انوار احمد اور اے بی اشرف کی محفلوں میں شامل ہوتے۔ خود بتاتے ہیں کہ شروع شروع میں یہ لوگ مجھے انٹیلی جنس کا آدمی سمجھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ انہیں یقین آگیا کہ یہ سر پھرا واقعی آتش ادب کا سوختہ ہے۔

ڈاکٹر انور نسیم سے ایک تعارف افسانے کے حوالے سے تھا لیکن ان سے باقاعدہ ملاقات شاہین کے توسط سے ہوئی۔ دونوں ایک عرصہ کینیڈا میں ساتھ رہے بعد میں انور نسیم اسلام آباد آگئے۔ ان کی دلچسپی افسانے سے ہٹ کر سائنس کی طرف ہوگئی۔ جنیٹک انجینئرنگ میں وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ افسانے سے ان کی دلچسپی اب صرف پڑھنے کی حد تک رہ گئی ہے۔

○

چائنیز کلچرل سنٹر میں پنڈی اسلام آباد کے کچھ ادیب مدعو تھے۔ ایک عرصہ بعد بار کا منہ دیکھا تھا چنانچہ سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ جلیل عالی نے کوک پر اکتفا کیا۔ واپسی میں آفتاب اقبال شمیم اور انعام الحق کہنے لگے ہمیں گھر چھوڑ دیں۔ جلیل عالی تو پنڈی سے ساتھ آئے تھے۔ ضیاء الحق کا زمانہ تھا اور اسلام آباد میں جگہ جگہ پولیس ناکے لگے ہوئے تھے۔ افغانیوں کی وجہ سے کئی دھماکے ہو چکے تھے۔ ہم پشاور موڑ کے قریب پہنچے تو آگے ایک لمبی قطار تھی۔ معلوم ہوا کہ چیکنگ ہو رہی ہے۔ میری گاڑی کا نمبر پشاور کا تھا جو ویسے ہی ہر جگہ چیک کیا جاتا تھا۔ میں نے سوچا آج مارے گئے۔ ہمیں نشہ میں دیکھ کر تو پولیس والے فوراً ہی دھر لیں گے۔ اتنے میں انعام الحق جاوید نے جو نشہ میں دھت تھا کھڑکی سے منہ نکال کر کہا۔ " کون ہے جسے ہماری گاڑی روکنے کی جرات ہوئی ہے "۔ آفتاب اقبال شمیم نے اسے گردن سے پکڑ کر اندر کیا۔

اچانک مجھے ہنسی آگئی اور میں ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔ آفتاب اقبال شمیم نے غصہ سے پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ میں نے کہا مجھے ہنسی اس بات پر آرہی ہے کہ ہم بے توپی بے اس لئے مارے جائیں گے لیکن عالی گولی پر ہی مارا جائے گا"۔

اتنے میں گاڑی ناکے کے سامنے پہنچ گئی۔ جانے کیا ہوا کہ چیک کرنے والے نے گزر جانے کا اشارہ کیا اور میں گاڑی آگے نکال لایا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ کیا ہوا تھا اور کیوں ہماری گاڑی کو چیک کئے بغیر گزر جانے دیا گیا۔ ایسے ہی موقعوں پر مجھے مفتی جی کی بات یاد آتی ہے کہ کوئی غیبی قوت ہمیشہ تمہاری مدد کرتی ہے۔

○

وقت کے ساتھ ساتھ اظہار کے ذریعے بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ کمپیوٹر نے کتاب کی جگہ سی ڈی کو اہمیت دے دی ہے اس حوالے سے اردو سے محبت کرنے والوں میں بھی یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ نئے ذرائع سے استفادہ کیا جائے چنانچہ سید ظفر اقبال نے اردو بازار کے نام سے ایک ویب سائٹ بنائی ہے جس میں کلاسیکی ادب سے جدید رویوں اور رجحانات تک تمام نمائندہ ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے۔ سید ظفر اقبال ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ مضامین لکھتے ہیں اور بڑی بات یہ کہ اردو سے عشق کرتے ہیں۔

○

امی کی وفات کے بعد ہمارے گھر کا سلسلہ کافی عرصہ اتھل پتھل رہا۔ مشتری کی شادی تو امی کے ہوتے ہی ہو گئی تھی۔ امی فوت ہوئیں تو گھر میں تینوں عورتیں ایک جیسی، علیا چاچا اور میں ایک سے مزاج کے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رخسانہ اور بہنوں میں اکثر ان بن رہنے لگی جس سے گھر کا ماحول بڑا خراب ہو گیا۔ بڑی ورتی کوئی تھی نہیں کہ سمجھاتی۔ علیا چاچا اب گھر کے بڑے تھے لیکن

کچھ مرد ہونے کے ناطے اور کچھ اپنے نرم مزاج کی وجہ سے وہ دونوں طرف کی سن لیتے اور خاموش رہتے۔اسی دوران عشرت کی شادی کی بات چل نکلی اور دو ایک مہینے میں رشتہ طے ہو کر وہ بھی اپنے گھر چلی گئی۔اب صورت حال کچھ بہتر ہو گئی۔علیا چاچا کی دکان تو عرصہ ہوا ٹھپ ہو گئی تھی۔ان کا مزاج بھی کاروبار کا نہیں تھا۔ان کے اپنے ہنر کی مانگ یہاں نہیں تھی۔نتیجہ یہ کہ پہلے دکان بکی، بکی کیا جس کے ساتھ سانجھا تھا اُس نے اونے پونے اپنے نام کرالی۔علیا چاچا کچھ عرصہ منڈی میں ادھر سے سامان لیا اُدھر بیچا قسم کا کام کرتے رہے لیکن یہ بھی ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔اب انہوں نے کشمیری کھانوں کا ہوٹل کھول لیا۔اس میں گاہک کم اور دوست زیادہ جاتے تھے چنانچہ چار چھ ماہ میں یہ کام بھی ختم ہو گیا۔کہنے لگے میں کراچی جانا چاہتا ہوں۔وہاں ایک دو دوست ہیں وہ بلا رہے ہیں۔میں نے بہت منع کیا اور کہا کہ اب آپ آرام کریں میں کام کرنے والا موجود ہوں، وہ احسان اٹھانا نہیں احسان کرنا جانتے تھے۔ضد کر کے کراچی چلے گئے۔ان کے جانے سے دو چار دن پہلے حسن کی پیدائش ہوئی۔کہنے لگے بس مجھے اسی کا انتظار تھا۔میری خواہش تھی کہ بیٹی کے بعد تم بیٹے کے باپ بھی بن جاؤ۔اب میں جاؤں گا۔چلے گئے عرصہ تک ان کی کوئی خبر نہ ملی پھر ایک خط آیا کہ معاملات کچھ ٹھیک ہو رہے کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں جیسے کوئی بندوبست ہوا پتہ لکھوں گا۔یہ پتہ مجھے کبھی نہ ملا۔کراچی جیسے بڑے شہر میں ان کی تلاش ممکن ہی نہ تھی، سال بیت گیا ایک دن ایک صاحب کالج میں مرے پاس آئے۔کہنے لگے ”میں کراچی سے آیا ہوں“۔

نہیں معلوم کیسے اور کس طرح میں سب کچھ سمجھ گیا۔کافی دیر ہم دونوں چپ رہے پھر میں نے پوچھا...... ”کب“۔

بولے ”تین چار ماہ ہو گئے“

میں نے کہا...... ”کیسے“

بولے ''حادثہ ہوگیا تھا''

میں نے کہا ''تو مجھے اطلاع کیوں نہ کی''

کہنے لگے ''وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہتے تھے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بچہ پریشان ہو جائے گا اور بھاگا آئے گا خوامخواہ خرچہ ہوگا''۔

علیا چاچا کو مرتے ہوئے بھی میری فکر تھی۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کے جانے سے میں نے کیا کھو دیا۔

ایک عرصہ تک ہمارے گھر میں عجب طرح کی خاموشی اور سوگواری رہی۔ رخسانہ کا تو ان سے زیادہ تعلق نہ رہا تھا۔ یہی کوئی پانچ چھ سال۔ لیکن ہماری تو زندگیاں ان سے وابستہ تھیں۔ سعدیہ پیدا ہوئی تو ان کی خوشی دیکھے نہ جاتی تھی۔ امی بے چاری تو میرے بچوں کو دیکھنے کی حسرت ہی لیے چلی گئیں۔ علیا چاچا نے دو بچے تو دیکھ لیے۔ حسین دو سال بعد پیدا ہوا۔ آخری دنوں میں ان کے مالی حالات خاصے خراب تھے لیکن روز شام کو سعدیہ کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ اسے گود میں بٹھا لیتے اور اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا۔

علیا چاچا جیسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان جیسا ایثار و محبت کہانیوں ہی میں نظر آتا ہے لیکن میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جنہوں نے یہ ایثار دیکھا ہے۔

○

میری دنیا اب سمٹ کر بہنوں اور اپنے سسرال تک محدود ہوگئی تھی۔ مشتری کے میاں حاجی اسماعیل ٹھیکے داری کرتے ہیں۔ مکان بناتے اور بیچ دیتے ہیں۔ شادی کے سال بھر بعد ان کے یہاں بیٹی ہوئی جس کا نام صائمہ تھا لیکن ہم سب پیار سے اسے گڑیا کہتے تھے۔ امی ابھی زندہ تھیں۔ انہیں گڑیا سے بڑا انس تھا۔ ایک طویل عرصہ بعد ہمارے گھر میں یہ پہلا بچہ تھا۔ گڑیا کے بعد یٰسین اور پھر سلمان ہوا۔ اس کے بعد دو اور بیٹیاں ماریا اور ناجیہ ہوئیں۔ گڑیا نے انگریزی

اور سبین نے حساب میں ایم اے کیا۔ سلمان پہلے فوج میں گیا لیکن کاکول سے واپس آ گیا۔ اب وہ کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس کر رہا ہے۔ ماریہ ایم اے کر رہی ہے اور ناجیہ راولپنڈی میڈیکل کالج میں تیسرے سال میں ہے۔ دوسری بہن عشرت کے میاں ذوالفقار بزنس کرتے ہیں۔ زنکاری بازار میں ان کی ہول سیل کی دکان ہے ان کی دو بیٹیاں ہیں سحر اور آمنہ۔ دونوں گریجویشن کر رہی ہیں۔

میرے سسر محمد اسلم کیانی فوج سے صوبیدار ریٹائر ہوئے تھے ان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑے خوش مزاج اور کھانے کھلانے والے شخص تھے۔ جب تک زندہ رہے میرے ان سے بڑے خوشگوار تعلقات رہے۔ میرا ان کے ساتھ کھانے مقابلہ ہوتا تھا۔ شوگر کے مریض ہونے کی وجہ سے انھیں میٹھے کا پرہیز تھا۔ لیکن وہ میٹھے کے بڑے شوقین تھے۔ کسی نہ کسی بہانے میٹھا چکھ ہی لیتے۔ ایک بار ہم سب کہیں مدعو تھے۔ کھانا کھا کر انھوں نے سب کی نظریں بچا کر پلیٹ میں رس ملائی ڈال لی۔ شمیم انھیں دور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں پلیٹ دیکھ کر دوڑا آیا اور بولا "باؤ جی! یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے رس ملائی ڈال لی ہے۔" بڑی سادگی سے بولے "یار۔ میں سمجھا دہی ہے۔"

میری ساس بظاہر سخت مزاج کی خاتون تھیں لیکن میرے ساتھ کبھی انہوں نے تلخ بات نہ کی۔ دوسرے دونوں دامادوں کے برعکس مجھ سے ان کی خوب بنتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی ایسی بات ہوئی ہو جس کا میں نے برا منایا ہو، سچی بات ہے وہ میری بڑی ہی عزت کرتی تھیں میرے پانچوں سالے بڑے محنتی ہیں چار تو ایک طویل عرصہ تک ملک سے باہر رہے۔ واپس آ کر انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا اور اب کیانی برادران پنڈی میں جانے پہچانے نام ہیں۔ پانچوں میں مثالی اتفاق ہے۔ پرویز کیانی تو اپنے زمانے میں ہاکی کا نامور کھلاڑی رہا ہے۔ اب وہ بھی بزنس کر رہا ہے۔ جاوید کیانی، پرویز کیانی، جمشید کیانی، شمیم کیانی اور نعیم کیانی

پانچوں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ ان کی بیگمات حمیرہ، نسرین، نینا، بلی اور شازیہ مجھ سے بھائیوں کی طرح پیار کرتی ہیں۔ میرے ہم زلفوں میں سے اصغر تو فوت ہو چکے کہ انہیں معدے کا کینسر تھا۔ دوسرے ہم زلف ہارون پاشا دوبئی میں ہیں۔

○

سعدیہ کا ننھا سا وجود اداسیوں اور پریشانیوں میں ایک مہکتا گلاب تھا اس کی نقرئی ہنسی اس بڑے ہال نما کمرے میں جس کے چبوترے میں بیٹھ کر میں خود کو زمین سے اٹھتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ سعدیہ کی گھنٹیوں کی طرح ایک سحر آمیز موسیقی بن گئی۔ وہ ذرا بڑی ہوئی تو میں سنگ مرمر کے چبوترے میں نیم دراز ہو کر اسے اپنے سینے پر لٹا لیتا۔ اس کی کلکاری میری روح میں اتر جاتی۔ اس کی توتلی معصوم باتوں نے مجھے زندگی کی نئی معنویت سے آشنا کیا۔ امی جو مرنے کے بعد بھی سائے کی طرح میرے ساتھ تھیں۔ جیسے سعدیہ کے ننھے منے وجود میں حلول کر گئیں۔ سعدیہ کو اپنے سینے پر لٹا کر مجھے یوں لگتا جیسے میں نے امی کی گود میں سر رکھ دیا ہے۔ سعدیہ نے ہمارے گھر میں توتلی آوازوں اور کلکاریوں سے نئے رنگ بکھیر دیئے۔ اس بڑے کمرے اور سنگ مرمر کے چبوترے پر جہاں میں نے کئی مراقبے کئے تھے اور کئی غیر معمولی کیفیتوں سے آشنا ہوا تھا زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس کمرے کا اسرار عجب طرح کا تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا یہاں ہمارے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے۔ چبوترے پر گنبد کے نیچے، آنکھیں بند کر کے بیٹھنا، کچھ سوچنا، ایک عجب لذت رکھتا تھا۔ کئی بار یوں لگا جیسے میرے برابر کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی میں ڈر بھی جاتا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ پراسراریت میری دوست بن گئی اور میرے ساتھ رہنے لگی۔ میرے کئی افسانوں میں اس کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

○

علیا چاچا کے بعد ہمارے گھر میں کوئی بزرگ نہ رہا۔ دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور تیسری بہن شاہین ہمارے ساتھ تھی۔ رخسانہ کو گھر بنانے کی بڑی فکر تھی میں اس بارے میں زیادہ پر جوش نہ تھا۔ نانک پورہ والے گھر میں میری زندگی کا ایک لمبا عرصہ گزرا تھا اور اس کی ایک ایک دیوار سے مجھے انسیت تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ گھر اوقاف کا تھا وہ مرمت کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے اور گھر کی خستگی ہر لمحے ڈراتی رہتی۔ اپنی جیب سے خرچہ کرتے رہتے تھے لیکن یہ خرچہ الٹا کرایہ بڑھوانے کا موجب بنتا۔ ادیبوں کی ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف سے پلاٹ اسلام آباد میں ملا۔ ہم دونوں میاں بیوی شہر میں کام کرتے تھے۔ اور درمیان میں مری روڈ کا سمندر تھا چنانچہ میں نے اس پلاٹ کو بیچ کر گلستان کالونی میں دس مرلہ کا ایک پلاٹ لے لیا۔ رخسانہ نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا۔ جی پی فنڈ سے قرضہ لیا۔ ہاؤس بلڈنگ سے بھی قرضہ لیا اور گھر بننا شروع ہو گیا۔ میں نے پوری زندگی کوئی کام سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ میرے ساتھ ایک غائبانہ قوت ایسی ہے جو ہمیشہ مجھے گڑھے میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میری امی دور کہیں بیٹھی مجھے دیکھتی رہتی ہیں اور میرے بارے میں دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی افتخار حسین نعیم پیرزادہ بڑی اچھی بات کہا کرتے ہیں کہ جو لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں اللہ ان کے بارے میں زیادہ تردد نہیں کرتا۔ وہ فرشتوں سے کہتا ہے یہ شخص خود اپنے معاملات سنبھال لے گا لیکن ہم جیسے سیدھے سادوں کے بارے میں وہ فرشتوں سے کہتا کہ اس کا خیال رکھنا یہ ضرور خود کو کسی مصیبت میں مبتلا کر لے گا۔ سو کوئی غائبانہ طاقت میرا بھی بہت خیال رکھتی ہے۔

ساری زندگی میں کسی لمبی چوڑی مذہبی بحثوں میں نہیں پڑا۔ خدا کے ساتھ میرا ایک عجیب تعلق ہے ایک بے تکلف دوستی کا۔ میں اس سے لڑتا بھی ہوں، اس سے ڈرتا بھی ہوں اور اس سے بہتری کی توقع بھی کرتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں میرا عقیدہ ایک روایتی

مسلمان ہوں کہ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔ باقی رہا مذہبی شعار، جی چاہتا ہے تو نماز پڑھتا ہوں نہ جی چاہے تو نہیں پڑھتا۔ غالب کی طرح

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد

والی کیفیت ہوتی ہے۔ میرے والد ایک صوفی منش آدمی تھے، رسمی سے زیادہ حقیقی سادگی اور درویشی و فقیری کے قائل۔ عقیدے کے حوالے سے وہ سنی تھے لیکن حضرت علی سے انہیں ایک خاص انس تھا۔ ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ''ضرب حسین'' کے نام سے چھپا بھی ہے۔ اس بارے میں بھی ان کا پیروکار ہوں اور غالب کے لفظوں میں

مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

○

میری تعلیم کا بڑا سلسلہ نانک پورہ والے گھر میں مکمل ہوا۔ ملازمت بھی وہیں سے شروع کی، شادی بھی اسی گھر میں ہوئی اور میرے تینوں بچے سعدیہ (۷۷ء) حسن (۸۲ء) اور حسین (۸۴ء) اسی گھر میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں میرے پاس موٹر سائیکل تھا۔ بریگیڈیر صفدر نواب کے اصرار پر میں نے گاڑی تو لے لی لیکن چلانا نہ سیکھ سکا۔ دو تین بار ایکسیڈنٹ ہوا، آخر اونے پونے بیچ دی، اور دیر تک تنخواہ سے اس کی قسطیں کٹتی رہیں۔ نئے گھر آکر گاڑی کی ضرورت اس لیے بڑھ گئی کہ یہ علاقہ شہر سے خاصا دور تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی کوئی سہولت نہ تھی چنانچہ میں نے پھر کوشش کرکے ایک گاڑی لی، چلانا اب بھی نہیں آتا تھا۔ ہمارے کالج کے ڈرائیور طارق نے کہا کہ میں سکھا دوں گا۔ گھر کے قریب ہی ایوب پارک تھا، اس زمانے میں یہاں ایک کھلا میدان بھی تھا، چنانچہ طارق روز شام کو مجھے اس میدان میں لے جاتا اور رات گئے تک سکھاتا رہتا، مہینہ گزر گیا ایک دن واپسی پر میں نے پھر غلط گیئر لگایا تو طارق نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولا ''سر جی مجھے تو معاف کیجیے، یہ آپ کے بس کی بات نہیں'' بہر حال

کسی نہ کسی طرح بلکہ اس سکھ کی طرح جسے کسی نے سمندر میں دھکا دے دیا تھا، میں الٹی سیدھی ڈرائیونگ سیکھ گیا اور سچی بات ہے اب تیرہ چودہ سال بعد بھی میری یہی حالت ہے۔

اپنے کشمیری ہونے کا میں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ والد صاحب نے تو کلیم ہی داخل نہیں کیا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ واپس جانا ہے۔ ایوب میرزا نے زور دے کا بچوں کا کشمیری ڈومیسائل بنوا دیا۔ سعدیہ نے ایف ایس سی کیا تو اس کی قدر معلوم ہوئی۔ اس کے نمبر اتنے نہیں تھے کہ اوپن میرٹ پر میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی سبین تھی جس کے والد فوج میں کرنل تھے۔ یہ بھی کشمیری تھے، انہوں نے ہی درخواستیں تیار کیں اور مظفر آباد جمع کرا کے آئے۔ یہاں بھی لسٹ میں سعدیہ کا نام نہ آیا۔ وہ ان دنوں بڑی ڈپریس تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں میری ملاقات پروفیسر سعید اختر سے ہوئی ان کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑی غائبانہ باتیں بتاتے ہیں۔ میں نے سعدیہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کوئی مثبت بات نہ کی اور کہا داخلہ کا معاملہ مشکل ہی ہے۔ ہم ان دنوں شمع میں بیٹھتے تھے۔ وہاں ایک صاحب آتے تھے ڈاکٹر حامد سلیم، بنیادی طور پر تو ان کا مضمون فزکس تھا اور اس میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی تھی، لیکن شاعر تھے اور کلاسیکی شاعری سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکیم ضبط قریشی کے صاحبزادے ہیں۔ ضبط قریشی سے پرانی یاد اللہ تھی۔ ایک زمانے میں غلام رسول طارق، صادق نیازی اور ضبط قریشی ساری ساری رات بحث کرتے رہتے تھے، اور ہم سنا کرتے تھے۔ ضبط قریشی شاعری کے ساتھ ساتھ نجوم میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک شام ڈاکٹر حامد سلیم جو اسلام آباد میں رہتے تھے، ان سے ملنے گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے، مجھے تو انہوں نے نہیں پہچانا، کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ میں نے پرانی باتیں یاد دلائیں تو نہیں کچھ کچھ یاد آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اٹھنے لگے تو بولے چلو آپ کا زائچہ بناتے ہیں۔ کافی دیر حساب کتاب کرتے رہے پھر بولے۔ آپ کی پریشانی اگلے ماہ کے آخر تک دور ہو جائے گی اور بھی کئی باتیں

بتا ئیں جو درست تھیں۔ میڈیکل کالجوں میں داخلہ ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اور اب کوئی صورت نہیں تھی، اس لیے میں نے گھر آ کر اس بات کا ذکر نہ کیا۔ یہ مئی کا شروع تھا۔ چند دنوں میں بات بھول بھال گئی۔ شاید جون کا اوائل تھا، کالجوں میں چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ میں دوپہر کو کچھ کام کر رہا تھا کہ بیل بجی، گیا تو ڈاکیا تھا، کہنے لگا۔ ''رجسٹری ہے'' میں نے دستخط کر کے لفافہ لے لیا۔ کھولا تو اس میں سعدیہ کے داخلہ کا خط تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی لڑکی نے اچانک چھوڑ دیا ہے۔ سیٹ خالی ہوگئی اور چونکہ ریزرو سیٹ تھی اس لیے میرٹ پر جو نام سب سے اوپر تھا اس کو کال لیٹر جاری ہوگیا۔ یہ ایک غیر متوقع خوشی تھی۔ دوسرے دن میں سعدیہ اور رخسانہ لاہور پہنچے، ایک آدھ دن کی کارروائی کے بعد سعدیہ ڈنٹیل کالج میں داخل ہوگئی۔ سعدیہ چار سال وہاں رہی۔ ان چار سالوں میں، میں آدھا لاہور اور آدھا پنڈی میں رہا۔ ذرا ذرا سی بات پر فکر مند ہونا میرے مزاج کا حصہ ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔

سونے سے پہلے میں سارے گھر کے دروازے چیک کرتا ہوں، سردیوں کا موسم ہو تو ہیٹر، پانی کے نل۔ ایک بار میں سردیوں میں دو ایک دنوں کے لیے کسی کام سے لاہور آیا ہوا تھا۔ شام کو رخسانہ سے بات ہوئی۔ سونے لگا تو ذہن میں خیال آیا کہ معلوم نہیں کسی نے ہیٹر بند کیے ہیں یا نہیں۔ بارہ بج رہے تھے، کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا، آخر نہ رہا جا سکا۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نیچے اترا۔ پرانی انارکلی میں فون کی ایک دکان کھلی تھی۔ فون کیا تو رخسانہ گھبرا گئی، بولی ''خیر تو ہے نا'' میں نے کہا ''ہاں خیر ہی ہے، ہیٹر بند کر دیے ہیں نا؟'' اُسے اتنا غصہ آیا کہ کوئی بات کیے بغیر ٹھک سے فون بند کر دیا۔ سعدیہ چار سال ہوسٹل میں رہی اور چار سال میری جان پر بنی رہی، آخر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی طے ہوا، سعدیہ آخیر سال میں تھی تو اس کا رشتہ آ گیا۔ احسن سول انجینئر ہے۔ اس کے والد رفیع کیانی بھی الیکٹرک انجینئر ہیں اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں، چھوٹا بھائی محسن بنک میں ہے اُس نے سی اے کیا ہوا ہے والدہ تدریس کے

شعبہ سے متعلق تھیں اور بطور پرنسپل ریٹائر ہوئی ہیں۔ یہ ہماری طرح سادے لوگ ہیں اس لیے میں نے رشتہ داروں کی اس رٹ کے باوجود کہ اتنی جلدی کیا ہے بات پکی کر دی۔ لگتا ہے ایک گھر میں دوسرے گھر کا دروازہ کھل گیا ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۹ء کو سعدیہ کی شادی ہوئی۔ یہ میری ملازمت کا آخری سال بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ ملازمت کے دوران دو کام ہو جائیں تو یہ بڑی خوش بختی ہے، ایک گھر بن جائے اور دوسرے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں کام بروقت ہو گئے۔ حسن، حسین پڑھ رہے ہیں اور اپنا مستقبل خود بنا لیں گے۔ اسی سال ایک اور غیر متوقع خوشی ملی کہ ریٹائرمنٹ سے چند ماہ پہلے میں پروفیسر بن گیا۔ غیر متوقع یوں کہ سنیارٹی میں میرا نام چھٹے نمبر پر تھا اور پوسٹیں تین تھیں۔ عموماً ایک ایک پوسٹ کے لیے تین تین نام بھجوائے جاتے ہیں چنانچہ میرا نام بھی کورنگ امیدواروں میں تھا، اتفاق یہ کہ کچھ لوگوں کی اے سی آریں خراب تھیں، سو میرا نمبر آ گیا۔ اسی رات جس دن میٹنگ ہوئی امین بھٹی نے فون کیا۔ میں نے اٹھایا تو بولے ''مبارک ہو''

میں نے پوچھا...... ''کس بات کی مبارک''

بولے...... ''تمہاری پرموشن ہوئی ہے''

بھٹی صاحب دو سال پہلے ریٹائر ہو چکے تھے اور انہوں نے عسکری کالج کے نام سے اپنا کالج کھول لیا تھا۔

○

حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ ایک گہرا تعلق تو میرے لیے ہمیشہ ماں کی طرح مقدس رہا ہے کہ میری ساری ادبی تربیت وہیں ہوئی ہے اور جو دو چار الٹے سیدھے لفظ لکھنا آتے ہیں، وہ میں نے حلقہ ہی سے سیکھے ہیں۔ حلقہ کی ایک اور عطا برداشت اور رواداری ہے۔ یہ ایک ایسی

ٹریننگ ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں میرے کام آئی۔ نوے کی دہائی تک حلقہ پر ہمارا اثر قائم رہا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ حلقہ کی ساری سیاست میری ذات کے گرد گھومتی تھی تو یہ کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ ہر سال حلقے کے عہدیداروں کا فیصلہ میں کرتا تھا اور دوست ساتھ دیتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ہمارا مضبوط گروپ کمزور ہونا شروع ہو گیا۔ میری شخصیت میں نمایاں ہونے کا پہلو نہیں۔ میں تو محفل میں چھپ کر پیچھے بیٹھنے والوں میں ہوں اسی وجہ سے میں کسی تقریب کا صدر یا مہمان خصوصی بننے سے انکار کرتا ہوں کہ میں لکھ کر تو پڑھ سکتا ہوں، مجمع کے سامنے بول نہیں سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں استاد ہوں، پچاس ساٹھ لڑکوں کی کلاس کا سامنا کر لیتا ہوں لیکن کسی تقریب میں یہ حوصلہ نہیں ہوتا۔ زندگی میں، میں نے دو چار تقاریب میں صدر یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی ہے، ان میں سے تین تقاریب کرنل مقبول حسین کی کتابوں کی تھیں، مجھے خود حیرت ہے کہ میں مان کیسے گیا، معلوم نہیں کرنل صاحب کی شخصیت میں کیا خوبی ہے کہ جب انہوں نے مجھے کہا کہ " میرے شعری مجموعہ کی رونمائی ہے اور آپ نے صدارت کرنا ہے" تو میں کچھ نہ بولا میرا خیال تھا کہ عین موقع پر انکار کر دوں گا یا جاؤں گا ہی نہیں لیکن میں چلا گیا اور الٹے سیدھے دو چار لفظ بھی بول آیا۔ اگلی بار پھر یہی ہوا۔

بعض لوگ لکھنے میں بڑے باکمال ہوتے ہیں لیکن سٹیج سے گھبراتے ہیں۔ کرنل محمد خان میں بھی یہی بات تھی۔ وہ اول تو صدارت کرتے ہی نہیں تھے ایک بار ہم انہیں زبردستی حلقہ میں لے آئے کرنل صاحب نے گفتگو کی بجائے لکھا ہوا ایک صفحہ پڑھ دیا۔ ممتاز مفتی بھی صدارت سے بہت بھاگتے تھے۔ آخری زمانے میں لوگ انہیں زبردستی گھسیٹ لاتے تھے، مفتی صاحب ہمیشہ لکھا ہوا صدارتی خطبہ پڑھتے تھے۔ لیکن نجی محفلوں میں ان کی گفتگو ایسی بے تکان اور مسلسل ہوتی کہ وہ بولتے اور دوسرے سنتے۔ رابطہ میں، میں نے ان کے افسانے ہی نہیں سنے ان کی خوبصورت باتیں بھی سنیں۔

○

ہمارے ادیبوں شاعروں کی نفسیات میں یہ بات شامل ہے کہ معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں اور بعض اوقات تو وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ شرم آتی ہے۔ صاحبان اقتدار کی خوشامد، چاپلوسی کے کئی واقعات ایسی ادبی محفلوں میں نظر آجاتے ہیں جہاں کوئی بڑی سماجی شخصیت مہمان یا صدر کی حیثیت سے موجود ہو۔ ایک خاتون ثاقبہ رحیم الدین ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کی بھتیجی اور ڈاکٹر محمود حسین کی صاحبزادی، علمی خانوادے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ادبی ذوق رکھتی ہیں لیکن درمیانے درجے کی لکھنے والی ہیں۔ ان کے میاں جنرل رحیم الدین بلوچستان کے گورنر بھی رہے ہیں اور ضیاالحق کے سمدھی بھی ہیں، اس حوالے سے ثاقبہ رحیم الدین کی سماجی حیثیت تو بہت تھی اس لیے اکثر تقاریب میں انہیں صدر یا مہمان خصوصی بنایا جاتا تھا۔ مقتدرہ قومی زبان کے ایک خالصتاً علمی فنکشن میں وہ مہمان خصوصی اور ڈاکٹر سید عبداللہ صدر تھے۔ مہمان خصوصی نے صدر سے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مائیک پر آئے تو انتہائی عجز سے بولے ...... ''اتنی بڑی سکالر کی اس علمی گفتگو کے بعد میں کیا عرض کروں'' پھر انہوں نے ثاقبہ رحیم الدین کی شان میں دیر تک قصیدہ خوانی کی۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوست نے میرے کان میں کہا...... ''اس بڈھے سے پوچھو اب تم نے کیا لینا ہے۔ عزت، شہرت، مقام سب کچھ تمہارے پاس ہے، اب ایسی خوشامد کیوں کر رہے ہو'' ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے اور میرے خیال میں وہ ایک سچے اور کھرے شخص ہیں اور اس کھرے پن کی سزا بھی انہوں نے بھگتی ہے لیکن تعریف و توصیف میں وہ بھی پیچھے نہیں یہ شاید ان کی نوکری کی مجبوری ہو اور ڈاکٹر جمیل جالبی کو بھی میں نے اس دربار میں سرنگوں دیکھا۔ خاتون ہونے کے حوالے سے عزت و تکریم اپنی جگہ لیکن علمی محافل اور گفتگو میں بہرحال معیار علمی ہی ہونا چاہئے۔

اسی طرح کے اور بھی کئی بڑے بڑے نام ہیں۔ وزیروں کے سامنے میں نے انہیں ہاتھ باندھے دیکھا۔ شاید درباداری کی روایت ہمارے ادیبوں میں سے پوری طرح نکل نہیں پائی۔ ہمارا ادیب شہرت اور فائدے کے لیے راستے تلاش کرتا رہتا ہے، کالم نویسی بھی اس کا ایک راستہ ہے۔ کالم نویس سب کو بلیک میل کرتے ہیں۔ افسران بالا کا تو نقطہ نظر یہی ہے کہ اگر صحافی اور کالم نویس ان کے ساتھ ہیں تو کوئی ان کی کارکردگی پر انگلی نہیں رکھ سکتا، ہر جگہ ان کی بلے بلے ہوگی۔ چنانچہ بہت سے ادیب شاعر بھی کالم نویس بن گئے ہیں کہ یوں مالی فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور شہرت الگ۔ لیکن یہ شہرت ادب کے حوالے سے نہیں صرف پی آر کے حوالے سے ہوتی ہے۔ ادب میں مقام ومرتبہ کا تعین بھی اب سماجی مرتبہ کے حوالے سے ہونے لگا ہے۔ بڑی کرسی پر بیٹھا ہوا چھوٹا ادیب بھی بڑا اور عظیم ہے۔ اکادمیوں اور دوسرے اداروں کے چیئرمین کی کرسی پر بیٹھے ہوئے معمولی ادیب بھی گوناگوں خوبیوں کے مالک بن گئے ہیں اور انہی اداروں میں چھوٹی چھوٹی پوسٹوں پر کام کرنے والے اچھے لکھاری کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ شہزاد منظر مرحوم نے ایک بار بتایا کہ انجمن ترقی اردو کے اکثر جلسوں میں وہ اور ادیب سہیل صرف سامع ہوتے ہیں کہ وہ چھوٹے درجے کے افسر ہیں اور کئی لوگ جو سرے سے کچھ لکھتے ہی نہیں اور جنہوں نے صرف دوسروں کے شعر یاد کئے ہوئے ہیں آگے آگے ہوتے ہیں۔

ادبی حلقوں اور شام نشستوں کی میں ایجنسیوں کے لوگوں کا ذہنی معیار کیسا ہوتا تھا اس کے دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ اس واقعہ کے راوی فارغ بخاری ہیں۔ پشاور سے نکلنے والا جریدہ ''سنگ میل'' ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ ادارہ میں فارغ بخاری اور رضا ہمدانی شامل تھے اور شمارے کے سرورق پر ادارہ اور اس کے نیچے ان دونوں کے نام ہوتے تھے، انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو سنگ میل کی اشاعتیں بھی ممنوع قرار پائیں۔ پولیس ان دونوں حضرات کو پکڑ کر لے گئی۔ دو دن بعد تھانیدار نے فارغ بخاری کو بلایا اور کہنے لگا ''فارغ صاحب میں

آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور انشا اللہ آپ کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی، آپ میری صرف اتنی مدد کر دیں کہ اپنے تیسرے ساتھی کو پکڑوا دیں۔ دو کو تو ہم نے پکڑ لیا ہے لیکن تیسرے کے لئے ہم نے سارا شہر چھان مارا ہے''۔

فارغ بخاری نے پوچھا ''تیسرا کون''

تھانیدار بولا'' ادارہ۔ جس کا نام سب سے اوپر لکھا ہوا ہے''۔

ادیبوں پر سرکاری نوازشات کا دروازہ یوں تو ایوب حکومت میں قدرت اللہ شہاب کے توسط سے کھل چکا تھا اور گلڈ میں بڑے بڑے سکہ بند ترقی پسند جوش و جذبے کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اکادمی ادبیات کا قیام بھٹو دور میں ہوا۔ اکادمی کا پہلا ڈائریکٹر احمد فراز کو بنایا گیا۔ اُس زمانے میں مشہور تھا کہ اکادمی صرف فراز کے لیے بنائی گئی ہے۔ پاکستان میں اس طرح کا کوئی کام بہت ماورا بھی نہیں کہ ہمارے یہاں اکثر ادارے اشخاص کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ احمد فراز انتہائی ست شخص ہیں چنانچہ ان کے دور میں اکادمی صرف اپنے بورڈ تک محدود رہی۔ ضیاالحق کے زمانے میں مسیح الدین صدیقی اس کے ڈائریکٹر جنرل ہوئے۔ یہ شخص عہدہ کے لحاظ سے وزارت تعلیم کا جوائنٹ سیکرٹری تھا چنانچہ اس نے آتے ہی اپنے بیوروکریٹک انداز سے اکادمی کو دفتر کی حد تک تو فوراً فعال بنا دیا۔ پھر اُس نے ادیبوں سے مشاورت کا سلسلہ شروع کر دیا پہلی مشاورت اسلام آباد میں ہوئی جس میں ممتاز مفتی اور ضمیر جعفری نے وہ کاسہ لیسی کی کہ ہمارے سر شرم سے جھک گئے۔ اس سے مسیح الدین صدیقی نے لفٹ لے لی اور اسی میٹنگ میں اختر امان کو ایک سوال پر جھاڑ دیا، اس پر میں اور منشا کھڑے ہو گئے اور ہم نے مسیح الدین صدیقی سے وہ سلوک کیا کہ انہیں ساری عمر یاد رہے گا۔ دفتری معاملات میں ایک ترقی یہ ہوئی کہ چیئرمین کا عہدہ بنا کر شفیق الرحمٰن کو چیئرمین بنا دیا گیا۔ وہ بنیادی طور پر جرنیل اور انتہائی مردم بیزار شخص تھے اس لئے عملاً تمام اختیارات مسیح الدین صدیقی ہی کے ہاتھ میں رہے۔

مسیح الدین صدیقی بڑے زمانہ شناس شخص تھے۔ زبان کے بڑے میٹھے۔ پہلی نشست میں ہمارے رویے سے انہیں سمجھ آ گئی کہ ادیبوں سے گفتگو کیسے کرنا ہے۔ اہل قلم کانفرنس کا آغاز انہی کے دور سے ہوا۔ پہلی کانفرنس بہت سوچ سمجھ کر ایک منصوبے کے تحت بھٹو کی پھانسی کے فوراً بعد رکھی گئی تاکہ دنیا کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ پاکستان کے ادیب حکومت کے ساتھ ہیں اس کانفرنس میں کئی لوگ شریک نہ ہوئے۔ مسیح الدین صدیقی نے حسن عباس رضا کے ذریعے جو اس زمانے میں اکادمی میں تھا کئیوں کو دھمکی بھی دی کہ سرکاری ملازم کے لیے صدر پاکستان کی دعوت کو رد کرنا جرم ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے نہ جانا تھا نہ گئے۔ دوسری تیسری کانفرنس میں کئی لوگ جو پہلی بار شریک نہیں ہوئے تھے شامل ہو گئے اور آخر آخر تو یہ کانفرنس ادیبوں کا میلہ بن گئی جس پر کسی نے پھبتی کسی تھی کہ یہ ''میلہ مویشیاں'' ہے۔ ان کانفرنسوں کا ایک منفی اثر ہوا، وہی جو مشرقی پاکستان کے ادیبوں کا دورہ مغربی پاکستان سے ہوتا تھا یعنی جب پس ماندہ علاقوں کے ادیب اسلام آباد آتے اور یہاں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں دو ایک راتیں گزارتے اور طرح طرح کے کھانے کھاتے تو ان کے دل میں مرکز کے خلاف ایک نفرت بیدار ہوتی۔ وہ اسلام آباد کی سہولتوں کا مقابلہ اپنے علاقوں سے کرتے اور یہ سمجھتے کہ پنجاب اور اسلام آباد سب کا حصہ لوٹ کر کھا رہا ہے۔ جب احمد فراز دوسری بار اکادمی کے چیرمین ہوئے تو میں نے انہیں تجویز دی کہ اسلام آباد میں بڑی کانفرنس کروانے کی بجائے مختلف علاقوں میں چھوٹی کانفرنسیں کروائی جائیں۔ کسی دیہات میں، کسی قصبے میں وفود کو دال روٹی کھلائی جائے اور کھلے آسمان تلے چار پائیوں پر سلایا جائے تاکہ ایک طرف تو قومی یک جہتی کو فروغ ملے اور دوسری طرف ادیب ایک دوسرے کے علاقوں اور ان کے مسائل سے آگاہ ہوں۔ احمد فراز نے اس تجویز کو بڑا پسند کیا لیکن ان کی روایتی سستی نے اس پر عمل نہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گیارہ بجے دفتر آتے۔ دو ایک گھنٹے بیٹھتے اور پھر کھانا کھانے چلے جاتے۔ عملاً اکادمی کا سارا نظام ڈائریکٹر جنرل کے ہاتھ میں ہوتا۔

شفیق الرحمٰن کے بعد پریشان خٹک اکادمی کے چیئر مین ہوئے ۔ یہ بھی بڑے باکمال شخص تھے ۔ زبان کے میٹھے اور کام کرنے والے ۔ چونکہ خود ادیب ہونے کا دعویٰ نہ تھا اس لیے ادیبوں کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ اگر کوئی ایسا شخص اُن سے ملنے آجاتا جس کو وہ جانتے تک نہ ہوتے لیکن مجال ہے اس پر ظاہر ہوتا ۔ ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔ ایک شخص اندر آیا ۔ پریشان خٹک اٹھ کر اس سے گلے ملے اور بڑے احترام سے بٹھایا کچھ دیر بعد وہ صاحب باتھ روم گئے تو میرے کان پر جھک کر پوچھا...... ''یہ کون صاحب ہیں؟'' ۔

ایک اور بار میں ان کے پاس بیٹھا تھا ۔ پی اے کو کسی علاقے کے ڈپٹی کمشنر کے نام خط لکھا رہے تھے کہ فلاں صاحب کے علاج کے سلسلے میں تعاون کیا جائے ۔ میں نے پوچھا ......''اس خط کا کوئی اثر ہوگا'' بولے ......''اثر تو کیا ہونا ہے ہاں ادیب بھائی خوش ہو جائے گا'' ان کا طریقہ یہ تھا کہ جو بھی ادیب شاعر ان سے ملنے آتا اُس سے کہتے ''کوئی پروجیکٹ تجویز کریں ۔ اکادمی آپ کو کچھ پیش کرنا چاہتی ہے'' ۔ اس کا ایک فائدہ اور ایک نقصان ہوا ۔ فائدہ یہ کہ کئی اچھے مسودے لکھے گئے اور نقصان یہ کہ اتنے سارے کام کو چھاپنے کے لئے فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے اکادمی مسودوں کا قبرستان بن گئی ۔

خٹک کے بعد غلام ربانی آگرو چیئر مین بنے یہ چونکہ سندھی ادیب تھے اس لیے اردو ادیبوں کے مقام و مرتبہ سے انہیں زیادہ آگاہی نہ تھی اور نہ ان کی سیاست سے باخبر تھے اس لیے ان کے دور میں بھی ادیبوں کی بڑی پذیرائی ہوئی ۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد افضل وزیر تعلیم تھے ۔ ڈاکٹر صاحب آئیڈیاز کے آدمی ہیں ۔ میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات کراچی میں بک کونسل کے سیمینار میں ہوئی ۔ میں اور منشا وہاں نئے لکھاریوں کی ورکشاپ میں مضمون پڑھنے گئے تھے ۔ ڈاکٹر افضل نے اختتامی جلسے کی صدارت کی اور اپنے خطبہ صدارت میں میرے انتخاب ''پاکستانی ادب'' کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ۔ جلسہ ختم ہوا تو میں نے اپنا تعارف کروایا ۔ ڈاکٹر صاحب

نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ بولے ''کسی کالج کی سطح پر اتنا بڑا کام بہت ہی قابل تعریف ہے'' وزیر صاحبان اس طرح کی باتیں فوراً بھول جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر افضل نے اسلام آباد آتے ہی ڈاکٹر اقبال حسین، جو اس زمانے میں نیشنل بک کونسل کے ڈی جی تھے، کو کہا کہ میرا نام مختلف کمیٹیوں میں شامل کیا جائے۔ اعجاز راہی بھی اس زمانے میں نیشنل بک کونسل میں تھا۔ ڈاکٹر افضل کتابوں کے فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے بک پرموشن کے لیے کوئی سکیم تیار کریں۔ اعجاز راہی نے سکیم بنائی جو منظور ہو گئی۔ اس کے تحت مختلف ادیبوں سے کتابیں خریدنے کا پروگرام بنایا گیا۔ کونسل کتابیں خرید کر مختلف لائبریریوں کو مفت بھجوائے گی۔ پہلی سکیم میں فتح محمد ملک، منشا یاد، خالدہ حسین اور میری سو سو کتابیں خریدی گئیں۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا اقبال حسین، خالدہ حسین کے شوہر تھے۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہمارے کالج کے لائبریرین نے مجھے بلایا۔ میں ان دنوں لائبریری کا انچارج بھی تھا۔ میں ان کے دفتر گیا تو کہنے لگے نیشنل بک کونسل نے کتابوں کے یہ بنڈل بھیجے ہیں کہ تمام سٹاف اراکین میں یہ کتابیں تقسیم کر دی جائیں۔ بنڈل کھولے تو ساری کتابیں خالدہ حسین کی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے بنڈل ہر کالج میں بھیجے گئے ہیں۔ اعجاز راہی سے پوچھا تو اس نے آف دی ریکارڈ بتایا کہ اقبال حسین صاحب نے اس سکیم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راتوں رات خالدہ حسین کی کتاب چھپوائی اور کئی ہزار چھپوائی۔ مرضی سے قیمت رکھی اور سارا فنڈ اس کی خریداری پر خرچ کر دیا۔ اب یہ کتابیں پاکستان بھر کے کالجوں میں بھجوا دی گئی ہیں۔ یوں ایک اچھی سکیم روایتی طرزِ عمل کی وجہ سے بے کار ہو گئی۔

ڈاکٹر افضل کو کئی نئی باتیں سوجھتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ میں نے پوچھا...... ''کیا''۔

بولے...... ''حج ایک ایسا موقع ہے جب دنیا بھر کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد تو ایک دوسرے کے مسائل میں شرکت کرنا، ان سے آگاہ ہونا، تجاویز

مرتب کرنا ہے لیکن ہمارا حج صرف رسومات تک محدود ہو گیا ہے۔ اگر اس موقع پر دنیا بھر کے مسلمان دانشوروں کا ایک سیمینار بھی ہو تو کیسا ہے''۔

میں نے کہا ''یہ تو بہت ہی اچھی تجویز ہے، لیکن اس پر عمل کیسے ہو گا''

بولے ''میں ضیاالحق سے بات کرتا ہوں اگر وہ مان گئے تو رابطہ اسلامی کو اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پہلے اس کے لیے بنیادی کام کرنا پڑے گا۔ میں اس کے لیے ایک گروپ بنانا چاہتا ہوں اور تم اس کے کنوینر ہو گے۔ اگر تم رضا مند ہو تو کام شروع کرتے ہیں''۔

میں نے کہا ''بالکل ٹھیک، مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

اگلے دن اکادمی کے دفتر میں اس گروپ کا پہلا اجلاس ہوا۔ جس کی باقاعدہ صدارت ڈاکٹر افضل نے کی۔ اراکین میں غلام ربانی آگرو، منشا یاد، اختر امان اور میں شامل تھے۔ اس اجلاس میں مجھے باقاعدہ کنوینر بنایا گیا، طے ہوا کہ اس سال حج کے موقع پر دنیا بھر کے دانشوروں کا دو روزہ اجلاس مکہ مکرمہ میں ہو۔ پہلا افتتاحی اور آخری اختتامی جلسہ ہو۔ درمیان والے جلسوں میں امت مسلمہ کے مسائل جن میں ادب، تہذیب، ثقافت سبھی پہلو شامل ہوں، پر مضامین پڑھے جائیں اور گفتگو ہو۔ میرے ذمہ لگایا گیا کہ پہلے سیمینار کے موضوعات اور ان کے خاکے تیار کروں۔ میں نے تین چار دن رات رات بھر جاگ کر یہ سارا کام کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر افضل نے ضیاالحق سے بھی بات کر لی۔ اگلے جلسے میں، میں نے ساری تفصیل کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ سب نے بڑی تعریف کی، ڈاکٹر افضل تو اچھل پڑے بولے...... ''ہم ایک بڑی روایت کی بنیاد رکھنے جا رہے ہیں''۔

میں نے کہا...... ''میری کچھ تجاویز ہیں، ایک یہ کہ جب تک سارا پروگرام مکمل نہ ہو جائے یہ بات پریس میں نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ اس کمیٹی میں سے کوئی بھی پہلے سیمینار میں شامل نہ ہو تا کہ یہ الزام نہ لگے یہ کام اپنے لیے کیا گیا ہے۔ تیسرے پاکستان سے جو دانشور شریک ہوں

۔۔۔واقعی اس مقام و سطح کے ہوں کہ ان پر انگلی نہ رکھی جا سکے"۔

سب نے اس سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر افضل نے فائل مجھ سے لے لی کہ اگلے چند دنوں میں وہ رابطہ اسلامی سے مل کر اسے فائنل کرا لیں گے۔ ہماری اس کمیٹی میں اختر امان بھی تھا جو نوائے وقت کے ادبی صفحے کا انچارج تھا۔ طے ہو جانے کے باوجود اس نے اگلے ہفتہ یہ خبر چھاپ دی۔ بس پھر کیا تھا، ایک شور مچ گیا۔ اکادمی اور ڈاکٹر افضل کو فون آنے شروع ہو گئے کہ کون کون جا رہا ہے۔ میرا نام اس میں شامل ہے یا نہیں۔ یہاں تک کہ سراج منیر نے ضیاالحق تک سے بات کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اتنے اہم کام میں انہیں کیوں نہیں شریک کیا گیا۔ بلکہ ایک مارشل لا مخالف شخص کو کیوں اس کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا۔ اتنا گند اچھالا کہ ڈاکٹر افضل نے یہ منصوبہ ہی ختم کر دیا۔

ایک اور بار ڈاکٹر افضل کے ذہن میں خیال آیا کہ کتابوں کے فروغ کے لیے ایک ایسا اخبار یا رسالہ جاری ہونا چاہیے جو صرف کتابوں کا تعارف کروائے اور ان پر صحیح تبصرہ کرے۔ اس کمیٹی میں میرے ساتھ منشا، اعجاز راہی، غضنفر مہدی، عنایت کبریا وغیرہ شامل تھے۔ دو تین اجلاس ہوئے بنیادی خاکے بن گئے، لیکن اس اخبار کا مدیر کون ہوگا اس پر دو ایک حضرات نے ایسا پھڈا ڈالا کہ یہ سکیم بھی کاغذوں ہی میں دفن ہو گئی۔ ڈاکٹر افضل میں بڑی خوبیاں تھیں لیکن ان کے بعض خیالات سے اتفاق ممکن نہ تھا۔ مثلاً ایک یہ کہ وہ تعلیم کو نجی شعبے کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ سرکاری شعبے میں فیسیں بہت کم ہیں جن کی وجہ سے ایسے لوگ بھی داخلہ لے لیتے ہیں جن کا پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، میں نے اس مسئلے پر ان سے بڑی لمبی بحثیں کیں کہ یہ یورپ نہیں۔ یہاں عام آدمی کے پاس اتنے ذرائع ہی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکے۔ ڈاکٹر افضل کا ایک کام ناقابل معافی ہے وہ یہ کہ اُس زمانے میں اردو میڈیم شروع ہو گیا تھا اور طے تھا کہ ۸۵ء کے بعد انگریزی میڈیم میں کوئی

امتحان نہیں ہوگا۔تمام سکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی ہو چکی تھی۔ پہلی جماعت سے ذریعہ تعلیم بھی اردو ہو گیا تھا۔ڈاکٹر افضل نے ایک نیا راستہ نکالا کہ جو ادارے کسی باہر کی یونیورسٹی سے ملحق ہیں وہ ۸۵ء کے بعد بھی انگریزی میڈیم جاری رکھ سکتے ہیں۔اس رعایت سے اداروں نے فائدہ اٹھایا اور ہر پرائیویٹ ادارے نے او لیول اور اے لیول کے بورڈ لگا لیے اور یوں ایک چور دروازہ کھل گیا۔اس کے بعد اردو کا معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔پاکستان میں دو تین مواقع ایسے تھے جب اردو ہماری قومی زبان بن سکتی تھی لیکن اب اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ صوبوں میں اردو کے خلاف اتنی نفرت ہے کہ وہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا سکتے ہیں اردو کو نہیں، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا علاقائی زبانوں سے کوئی جھگڑا ہی نہیں، لیکن اب یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ کالاباغ ڈیم کی طرح اردو بھی اب کبھی پاکستان کی سرکاری زبان نہیں بن سکتی۔یہ بھی قابل غور پہلو ہے کہ پاکستان بننے کے پہلے آٹھ دس سال تو اردو بولنے والے ہی صاحب اقتدار تھے انہوں نے کیوں اردو کو سرکاری زبان نہیں بنایا، اس لیے کہ یہ ایک طبقاتی مسئلہ تھا۔اردو کے سرکاری زبان بننے سے علی گڑھ پیچھے ہو جاتا اور ٹاٹ والے سکول آگے آجاتے۔اردو کو متنازعہ بنانے میں خود اہل زبان کا بڑا ہاتھ ہے۔شروع شروع میں ان لوگوں نے برہمنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیر اہل زبان کو شودر سمجھا۔بھٹو کے زمانے میں جب پہلی بار لسانی جھگڑا شروع ہوا تو کراچی کے دانشوروں کے ایک وفد کو اسلام آباد بلوایا گیا کہ بھٹو ان سے ملنا چاہتے تھے۔یہ لوگ جو فلیش مین میں ٹھہرے ہوئے تھے شالیمار آنکلے۔ان میں سید محمد تقی، رئیس امروہوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ممتاز حسین اور صبا لکھنوی وغیرہ شامل تھے۔باتیں شروع ہو گئیں ہم نے پوچھا...... ''اصل معاملہ کیا ہے''۔ایک صاحب بولے...... ''اب دیکھیں نا ہم ان سندھی بدوؤں کو اس کی اجازت تو نہیں دے سکتے کہ ہماری زبان کے لہجے کو خراب کریں''۔

اسی رویے نے چھوٹے علاقوں میں بڑے تعصبات پیدا کیے۔مزے کی بات یہ ہے

کہ اہل زبان نے بہت کم بڑے ادیب پیدا کیے ہیں۔ میر آگرہ کے، غالب آگرہ کے، نذیر احمد بجنور کے، اقبال، فیض سیالکوٹ کے تھے۔ میراجی، راشد، مجید امجد، قاسمی، وزیر آغا سب اس حوالے سے غیر اہل زبان ہیں۔ پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر غرض اکثر بڑے ناموں کا تعلق اردو کے روایتی مراکز سے نہیں۔ تلفظ اور لہجے کی بات اب اگرچہ قدرے کم ہوئی ہے ورنہ ایک زمانے میں تو حلقہ میں بھی تخلیق ایک طرف رہ جاتی تھی اور لہجہ تلفظ کی بحث شروع ہو جاتی تھی۔ وحید قریشی کے دور میں مقتدرہ کے ایک سیمینار میں ایک مقرر نے ٹی وی کے تلفظ کی بحث چھیڑ دی اور اس پر اعتراض کیا کہ زبان کو خراب کیا جا رہا ہے۔ اس پر صدرِ محفل نے بڑا مزیدار جملہ کہا۔ ’’آپ زبان کی صحت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں یا پاکستان کو‘‘۔

○

ڈاکٹر اقبال حسین سے میرا تعارف خالدہ حسین کے حوالے سے نہیں ہوا، بلکہ اس کا سبب اعجاز راہی کا نیشنل بک کونسل میں ملازمت کرنا تھا۔ پی آئی اے سے نکالے جانے کے بعد اعجاز راہی نے جس مستقل مزاجی سے وقت گزارا وہ کچھ اسی کا حوصلہ ہے۔ امانت ندیم نے اس سے کئی فضول قسم کی کتابیں لکھوائیں، یوں اُس زمانے میں اعجاز ہمہ وقتی لکھنے والا بن گیا۔ اسی دور میں نیشنل کونسل نے کراچی میں ایک ورکشاپ کروائی جس میں مجھے اور منشا کو بھی مدعو کیا گیا۔ یہ میرا کراچی کا دوسرا پھیرا تھا۔ اس سے پہلے میں ۷۷ء کے آخر میں کراچی آیا تھا۔ اعجاز راہی اس زمانے میں پی آئی اے میں تھا۔ میں، ضمیر نفیس اور احمد داؤد اس کی دعوت پر کراچی گئے۔ ضمیر نفیس حلقہ کا جوائنٹ سیکرٹری اور روزانہ کی شالیماری نشستوں میں ہمارا ساتھی تھا۔ ہم لوگ ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچے۔ اعجاز راہی پی آئی اے کالونی میں رہتا تھا۔ کراچی میں میری کتاب کی تقریب بھی ہوئی جس کی صدارت شوکت صدیقی نے کی۔ یہاں قیام کے دوران اشفاق حسین سے جو اُس زمانے میں آرٹ کونسل میں تھے، ملاقات ہوئی، جن دوستوں سے میں غائبانہ آشنا تھا

ان میں محمود واجد، علی حیدر ملک، صباء اکرام، شہزاد منظر، اے خیام اور ادیب سہیل شامل تھے۔

نسیم درانی کا گروپ علیحدہ تھا، یہاں میں پہلی بار جمیل اختر سے ملا جو بہت ہی نفیس اور مہذب شخص تھے۔ اُس کے بعد وہ جب بھی پنڈی آئے میری اُن سے ضرور ملاقات ہوئی۔ یہ بھلے دنوں کی کراچی تھی۔ اے خیام اپنی کار میں رات رات بھر گھماتے، ایک دو لمبی نشستیں سیپ کے دفتر میں لگیں اور چار پانچ دن رہ کر ہم ٹرین سے واپس آ گئے۔ اس سفر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ میں نے پہلی بار سمندر دیکھا، ایک سمندر میرے اندر تھا اور ہمیشہ سے موجود ہے، ایک سمندر میرے تخیل میں بھی ہے لیکن کروٹیں لیتے سمندر کو پہلی بار دیکھ کر جو احساس ہوا اس کی تخلیقی صورت ''سمندر مجھے بلاتا ہے'' میں موجود ہے۔ دوسری بار میں اور منشا کراچی پہنچے تو ابھی کراچی کی رونقیں موجود تھیں۔ اس بار ہم جہاز سے آئے تھے، یہ میرا ہوائی جہاز کا پہلا سفر تھا۔ ورکشاپ دو دن رہی۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اور منشا سیپ کے دفتر پہنچ گئے۔ نسیم درانی سے لمبی گپ شپ ہوئی۔ ایک دن ہم دونوں مشفق خواجہ کے ہاں جا نکلے، وہ بڑے تپاک سے ملے، میری اور منشا کی تصویریں بنائی۔ یہ تصویر میرے کئی مجموعوں کے سرورق کی پشت پر چھپی ہے۔ اس سفر میں لطف اللہ خان سے بھی ملاقات ہوئی جن کے پاس آڈیو ویڈیو کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ انہیں فنکاروں کی آوازیں ریکارڈ کرنے اور ان کی تصویریں بنانے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ انہوں نے میری اور منشا کی آوازیں بھی ریکارڈ کیں اور ہماری تصویریں بنائیں۔ یہ ذخیرہ ایک بہت بڑی قومی دولت ہے، افسوس کہ اس بے توقیر اور کتاب دشمن معاشرے میں لطف اللہ خان جیسے شخص کی کوئی قدر نہیں۔

ورکشاپ کے منتظمین نے ایک شام سمندر کی سیر کے لیے بھی رکھی تھی۔ میں دوسری بار اور منشا پہلی بار سمندر دیکھ رہا تھا۔ اقبال حسین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو ورکشاپ میں شامل تھے سمندر کنارے پھیل گئے اور چہلیں کرنے لگے۔ ایک دو لڑکوں نے سمندر

میں غوطہ زنی شروع کر دی۔ اقبال حسین کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے قمیص پینٹ اتاری، بنیان اور انڈرویئر میں سمندر کی طرف بھاگ نکلے، سمندر میں ایک دوسرے پر پانی اچھالتے لڑکوں سے بولے ''میں تم سے زیادہ اچھا تیراک ہوں'' اور زن سے چھلانگ لگا دی۔

روپے پیسے کے معاملے میں وہ بڑے کھلے دل کے شخص تھے اور کسی اصول ضابطے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ورکشاپ ختم ہوئی تو کراچی دفتر کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر نے ہم سے کہا کہ اپنے چیک لیتے جائیں۔ ہم چیک لینے گئے تو خلافِ توقع رقم بہت زیادہ تھی ہمیں جو خط لکھا گیا تھا اس میں مضمون پڑھنے کا معاوضہ سات سو روپے تھا، اور کچھ ڈیلی الاؤنس، آنا جانا اور ٹھہرنا کونسل کے ذمہ تھا۔ اب جو چیک دیکھا تو تین ہزار سے اوپر۔ میں نے اکاونٹنٹ سے کہا...... ''یہ کچھ زیادہ نہیں''۔

بولا...... ''مضمون کا معاوضہ دو ہزار ہے''

میں نے کہا...... ''لیکن یہ تو شاید سات سو تھا''

کہنے لگا...... ''خالدہ حسین نے بھی تو مضمون پڑھا ہے''

پھر اُس نے برا سامنہ بنایا، وہ سندھی تھا اور ایک ناگوار قسم کا تعصب اس کے ایک ایک انگ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ اس ورکشاپ کی صدارت ڈاکٹر فضل نے کی اور یہیں پہلی بار اُن سے متعارف ہوا۔

ڈاکٹر افضل سے ایک تعلق کی وجہ سے آگرو میری بڑی عزت کرتے تھے اور مجھے بڑا اہم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میں ڈاکٹر صاحب کے بہت قریب ہوں، حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی، آگرو ہی کے زمانے میں افتخار عارف ڈی جی بن کر آ گئے۔ اسی زمانے کی ایک اہل قلم کانفرنس میں ضیا الحق نے ایسے ادیبوں پر جو مارشل لا کے خلاف تھے سخت تنقید کی، انہوں نے اختر حسین جعفری اور احمد جاوید وغیرہ کے حوالے بھی دیے۔ تقریب ختم ہوئی تو اختر حسین

جعفری خاصے پریشان دکھائی دیے۔احمد جاوید تو شاید آیا ہی نہیں تھا۔

ضیاالحق کی اس تقریر نے ساری تقریب کو بدمزا کر دیا۔میں اور حیدر قریشی دوپہر کا کھانا کھائے بغیر ہی پنڈی واپس آ گئے۔حیدر قریشی سے تعلق خان پور کے زمانے سے تھا۔جدید ادب کا آغاز ہوا تو اس کی مشاورت میں، میں بھی شامل تھا قادیانی ہونے کی وجہ سے حیدر قریشی ہمیشہ ہی ایک عتاب میں رہتا تھا۔یہ عتاب جدید ادب پر بھی نازل ہوا۔حیدر قریشی کی نوکری جاتی رہی۔لیکن وہ کسی نہ کسی طور پر چہ نکالتا رہا۔اس بار پنڈی آیا تو خاصا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ہم تقریب سے نکل کر پنڈی آ رہے تھے راستے میں بولا...... ''کوئی کام تو نہیں''؟

میں نے کہا...... ''نہیں''

کہنے لگا...... ''چلو ذرا بہائی سنٹر چلتے ہیں''

میں نے پوچھا...... ''بہائی سنٹر میں کیا کام ہے''

بولا...... ''میں بہائی ہو گیا ہوں''

میں نے کہا...... ''تم نے اُس سکھ والا کام کیا ہے جو قادیانی ہو گیا تھا''ہم دونوں ہولی فیملی ہسپتال کے قریب بہائی سنٹر میں پہنچے۔سنٹر میں زیادہ تعداد ایرانیوں کی تھی جو انقلابِ ایران کے بعد وہاں سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔اتفاق سے اُس دن ڈاکٹر صابر آفاقی بھی وہیں موجود تھے،ان سے پرانی یاد اللہ تھی۔ہم دیر تک گپ شب لگاتے رہے۔حیدر قریشی اپنے کام کرتا رہا۔

واپسی پر میں نے کہا...... ''یار یہاں کا ماحول تو بڑا اچھا ہے،جمالیاتی پہلو کافی روشن ہیں''

بولا...... ''تو بہائی ہو جا''

میں نے کہا...... ''اب اس عمر میں کیا فائدہ ؟''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔کچھ دنوں بعد حیدر قریشی ایبٹ آباد کے کسی کالج میں اردو کا

لیکچرر ہو گیا۔ وہیں اس کا افسانوی مجموعہ چھپا جس کی ایک کہانی پر بڑا فساد ہوا۔ پھر وہ اچانک گم گیا، کافی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ جرمنی چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں وہاں وہ بہائی ہے یا قادیانی۔ میرے خیال میں تو کچھ بھی نہیں وہ صرف حیدر قریشی ہے۔

جو دوست اب پاکستان سے باہر ہیں اور جن سے ایک زمانے میں بہت گہرے مراسم رہے ہیں ان میں ایک تبسم کاشمیری ہیں۔ جب وہ اورینٹل کالج میں تھے تو نئے ادب کے حوالے سے ان سے اکثر لمبی بحثیں ہوتی تھیں۔ افتخار جالب بھی ہم دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک تھے۔ تبسم جدید نظم کے ساتھ ساتھ بہت اچھا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں، ان دنوں جاپان میں اردو پڑھا رہے ہیں اور اردو ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ان کی اس کتاب کا ترجمہ سویامانے کر رہے ہیں۔ سویامانے نے غلام عباس پر جو کام کیا ہے وہ فن تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جن دنوں وہ یہاں جاپان کے سفارت خانے میں تھے میری ان سے تین چار ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ آخری ملاقات میں کشور ناہید بھی موجود تھیں، اگلی صبح انہیں بڑے "طریقے" سے نیشنل کونسل سے ہٹایا گیا۔ کشور کو اُس رات اس کی خبر تک نہ تھی۔ بہت چہک رہی تھیں، مجھے بار بار کہتیں "کیا بات ہے تمہارا اسٹیمنا کم ہو گیا ہے"۔

میں نے کہا...... "واپسی پر میں نے گاڑی خود چلانی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی فٹ پاتھ پر چڑھی ہو۔ سویامانے نے اس محفل میں کچھ بے تکلف دوستوں کو اکٹھا کیا تھا، جاپانی متائی کے ساتھ رنگ رنگ کی شرابیں اور ڈشیں موجود تھیں۔ کشور کو اپنی جگہ سے "اٹھنا آسان نہ تھا۔ صبح وہ دفتر گئیں تو حالات معمول کے مطابق تھے، سنا ہے دفتر بند ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے انہیں آڈر دیے گئے اور غلام رسول جنہوں نے چارج لینا تھا، ساتھ والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

○

ایک اور شخص جن سے دوستی اور احترام دونوں رشتے بیک وقت قائم تھے سجاد شیخ ہیں۔

بنیادی طور پر انگریزی کے استاد ہیں لیکن اردو ادب خصوصاً اردو افسانے سے ان کی دلچسپی خصوصی ہے۔ منٹو پر انہوں نے بڑا منفرد کام کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے منتخب افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں شیخ صاحب گورڈن کالج میں وائس پرنسپل اور شعبہ انگریزی کے صدر تھے۔ پروموشن ہوئی تو انہیں پرنسپل بنا کر پاک پتن بھیج دیا گیا، بس وہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔ ان کے ذہن میں جانے کیا آیا کہ وہ اس علاقے میں گریڈ کے حوالے سے سب سے بڑے افسر ہیں اور ان کا فرض ہے کہ سارے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر بگڑے ہوئے نظام کو درست کریں۔ چنانچہ انہوں نے اے ڈی سی اور ایس پی کو اپنے دفتر میں بلا کر ہدایات جاری کیں، انہوں نے جواباً یہ کیا کہ شیخ صاحب کو اسی رات اچھا خاصا زدوکوب کرایا۔ نامعلوم افراد کے خلاف رپٹ درج ہوگئی اور کیا ہونا تھا۔ شیخ صاحب اور بگڑ گئے جواباً انہیں اتنا ڈرایا گیا کہ ذہنی حالت بگڑ گئی۔ اسی حالت میں پنڈی آئے۔ عموماً سردیوں کے موسم میں وہ ایک عجیب طرح کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک بار حلقہ اربابِ غالب کی خصوصی نشست تھی جس میں ایوب مرزا کے بڑے بھائی یعقوب مرزا کی کتاب پر گفتگو ہونا تھی۔ یہ کتاب اقبال کی نظموں کا ترجمہ تھی۔ سجاد شیخ صدارت کر رہے تھے۔ مختلف لوگوں نے مضامین پڑھے اور گفتگو کی۔ مجلس کے آغاز میں تو شیخ صاحب نارمل تھے اچانک انہیں جانے کیا ہوا، میز پر ہاتھ مار کر کہنے لگے ..... ''میں نے زندگی میں اس سے برے ترجمے نہیں دیکھے، اوئے تو بے (یعقوب) میرا جی چاہتا ہے جوتا اتار کر تیری ایسی مرمت کروں کہ تو دوبارہ اس طرح کے کام کا نام بھی نہ لے''۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ یوسف حسن سیکرٹری تھے، انہوں نے بڑی مشکلوں سے صورت حال سنبھالی اور جلدی سے اجلاس ختم کر کے جان چھڑائی۔ ایسی ذہنی کیفیت میں شیخ صاحب بڑے تکلیف دہ ہو جاتے ہیں ورنہ عام حالات میں ان جیسا شفیق اور محبت کرنے والا دوست کم ہی نظر آتا ہے۔ ایک بار ایسی ہی حالت میں میرے گھر آئے، میں اُس زمانے میں کشمیری بازار میں رہتا تھا

دروازہ کھٹکا، نیچے اترا تو شیخ صاحب تھے، بغیر کسی علیک سلیک کے بولے ''مارکر ہیں''۔

میں نے کہا..... ''نہیں''

کہنے لگے ''تو چلو پہلے دو تین رنگوں کے مارکر لینا ہیں''

گلی کے سرے پر ایک جنرل سٹور تھا، شیخ صاحب نے وہاں سے تین چار رنگوں کے مارکر لئے۔

میں نے کہا..... ''کرنے کیا ہیں''

بولے ..... ''خاموش رہو''

میں سمجھ گیا کہ شیخ صاحب اس وقت اپنی حالت میں نہیں۔

ہم خاموشی سے اوپر آئے۔ بولے ..... ''کاغذ تو ہیں''

میں نے کہا..... ''ہیں''

کہنے لگے..... ''جتنے ہیں لے آؤ''

میں سفید کاغذوں کا ایک بنڈل اٹھا لایا۔ شیخ صاحب نے خطاطی شروع کر دی۔ کہنے لگے..... ''تم اپنا کام کرو'' میں چائے وغیرہ بنواتا رہا۔ اتنی دیر میں شیخ صاحب نے ڈھیر ساری آئتیں، نام اور شعر لکھ ڈالے۔

بولے..... ''ٹیپ ہے''

میں نے کہا..... ''ہے''

کہنے لگے..... ''لے آؤ''

میں ٹیپ لے آیا شیخ صاحب نے سارے لکھے ہوئے کاغذ دیواروں پر چپکا دیے۔

ان کے جانے کے بعد رخسانہ اندر آئی تو چیخ پڑی..... ''یہ کیا ہے؟''

میں نے کہا..... ''آرٹ گیلری''

○

ڈینیز سکول کی طرح گورڈن کالج بھی اپنے وقت میں ایک وقیع علمی درس گاہ تھا اور یہاں پڑھنا ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔ جس زمانے میں، میں یہاں سے ایم۔اے کر رہا تھا، گورڈن کالج کی روایات قائم تھیں۔ ستر کی دہائی میں جو زوال آیا ابھی اس کے آثار تک نہ تھے۔ صفی حیدر دانش، مطیع اللہ خان، سجاد شیخ، نصر اللہ ملک، خواجہ مسعود، صدیق چیمہ، توصیف تبسم جیسے سینئر اساتذہ کے پہلو بہ پہلو آفتاب اقبال شمیم، فرحت نسیم ملک اور ذکی درانی جیسے نوجوانوں کے دم سے صبح و شام آباد کی محفلیں آباد تھیں۔ ذکی درانی ہوسٹل میں رہتے تھے اور ان کا کمرہ ترقی پسند دوستوں کی بیٹھک تھا۔ میں اور سرور کامران اکثر رات گئے تک ذکی درانی کے کمرے میں ادبی اور سیاسی بحثوں میں الجھے رہتے۔ اس زمانے میں روس کا نام بھی خفیہ والوں کو پیچھے لگانے کے لئے کافی تھا۔ ایک شام اطلاع ملی کہ ذکی درانی کے کمرے پر چھاپا پڑنے والا ہے۔ اس کمرے میں لینن اور ماؤ کی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سب کو فکر پڑ گئی اور رات نو بجے سے پہلے پہلے ہم نے ساری کتابیں وہاں سے نکال لیں۔ چھاپا تو خیر کیا پڑنا تھا، ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین ضرور سرک گئی۔ بعد میں ہم کئی دن اس پر ہنستے رہے۔

ستر کی دہائی میں جاوید حکیم قریشی، جو پیپلز پارٹی راولپنڈی کے سیکرٹری ہو گئے، کی صدیق چیمہ سے اَن بن ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے دو نظریاتی گروہوں کی لڑائی میں بدل گئی۔ میرا خیال ہے کہ صدیق چیمہ جماعت اسلامی سے ہمدردی ضرور رکھتے تھے لیکن اس کے باقاعدہ رکن نہ تھے لیکن اس لڑائی نے انھیں جماعت کے کیمپ میں دھکیل دیا۔ اس لڑائی نے گورڈن کالج کے علمی ماحول کو تباہ کر کے رکھ دیا اور طویل عرصہ تک یہ درس گاہ مسلسل زوال کی دلدل میں اترتی چلی گئی۔ ایک عرصہ بعد خواجہ مسعود پرنسپل ہوئے تو انھوں نے کسی حد تک گورڈن کالج کے وقار کو بحال کیا۔

اسی زمانے میں اجمل نیازی بھی ٹرانسفر ہو کر یہاں آ گئے۔ اس زمانے میں وہ کٹر کیمونسٹ مشہور تھے۔ حلقہ کے الیکشن ہوئے تو وہ سیکرٹری کے عہدے کے امیدوار بن گئے۔ ہم لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ ایک شام وہ شالیمار میں آئے اور کہنے لگے "آپ لوگ بھی ترقی پسند ہیں پھر میری مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "حلقہ کا پلیٹ فارم سب کے لئے ہے، آپ کٹر کیمونسٹ ہیں، ہم اس طرح کے انتہا پسند کو سیکرٹری نہیں بنانا چاہتے کہ دوسرے لوگ وہاں آنا ہی چھوڑ دیں۔"

اجمل نیازی بولے "خدا کی قسم میں کیمونسٹ نہیں ہوں، میں تو صرف کیمونسٹ مشہور ہو گیا ہوں۔"

○

راولپنڈی کے تدریسی ماحول میں دو ایسی خواتین شامل ہیں جن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ایک مس عمر بانو اور دوسری مس خالدہ۔ عمر بانو وقارالنسا، گرلز سکول کی پرنسپل تھیں۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ ساری عمر سکول کی خدمت میں گزار دی۔ اس خدمت کے دوران ہی ان پر فالج کا حملہ ہوا اور اب وہ حیدر آباد میں اپنے عزیزوں کے یہاں موت وحیات کی کشمکش میں ہیں۔ میڈم بانو نے وقارالنسا، سکول کو صفِ اوّل کی درس گاہ بنانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔ مس خالدہ سرسید پبلک سکول کی پرنسپل ہیں۔ انھوں نے بھی شادی نہیں کی اور اپنی ساری زندگی سکول کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔

یہ دونوں خواتین، دو عورتیں نہیں دو ادارے ہیں۔ دونوں فنا فی العلم ہیں اور ان کی زندگی کا منتہا صرف اور صرف لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ ان دونوں کے دم سے پنڈی کی اکثریت زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئی ہے۔ ہم مردہ پرست ہیں، زندگی میں کسی کو نہیں پوچھتے، مر جائے تو مزار بناتے ہیں۔ لیکن اب ہمارے زوال کی انتہا یہ ہے کہ مرنے پر بھی کسی کو یاد نہیں

کرتے۔ میں ان دونوں خواتین کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

○

ادب و تدریس کے حوالے سے اورینٹل کالج سے تعلق تو بہت پرانا ہے، اول اول ایم اے کرنے کے دوران میں وہاں دوایک بار گیا، پھر جب ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبہ تھے تو پی ایچ ڈی کے سلسلے میں کئی چکر لگے۔ اس زمانے میں خواجہ زکریا، تبسم کاشمیری اور سہیل احمد خان وہاں موجود تھے۔ بعد میں جب خواجہ زکریا صدر شعبہ ہوئے تو میرا وہاں آنا جانا تواتر سے ہوگیا۔ خواجہ صاحب دوست نواز اور گفتگو کے رسیا ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر لطف آجاتا ہے وہ بولتے رہیں اور آپ سنتے رہیں۔ بعد میں وہ میرے مقالہ کے نگران بھی بن گئے اور یوں ان سے تعلقات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تبسم کاشمیری تو اس دوران جاپان چلے گئے۔ سہیل احمد خان سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ فخر الحق نوری سے بھی ایک گہرا تعلق ہے۔ وہ بڑے نفیس شخص ہیں اور جدید ادبی روایات سے گہری واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ مرغوب احمد سے نوازش علی کے ذریعے سے تعارف ہوا۔ تحسین فراقی سے کچھ نظریاتی اختلافات کے باوجود گفتگو کرنے کا لطف آتا ہے۔ اب رفیع الدین ہاشمی صدر شعبہ ہیں جو اس عظیم روایت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اورینٹل کالج اردو ادب کی تدریس میں ایک اہم نام ہے۔ جہاں اپنے وقت کے جید اساتذہ نے علم و ادب کی شمع کو جلائے رکھا لیکن ہمارے مجموعی زوال نے اس ادارے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اب یہ مردِ بیمار ماضی کے شاندار منارے پر کھڑا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا ہے۔

○

اعجاز راہی پشاور گیا تو میرا وہاں آنا جانا باقاعدہ ہوگیا۔ مہینہ میں ایک آدھ بار کوئی نہ

کوئی ادبی تقریب وہاں کھینچ لے جاتی ،یوں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بھی شناسائی ہوئی۔نذیر تبسم سے تو خیر اسلام آباد ہی میں ملاقات ہو چکی تھی۔وہ پشاور یونیورسٹی پہنچے تو ان کے توسط سے وہاں کے دوسرے اساتذہ سے بھی تعارف ہوا۔فارغ بخاری ، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی تو میرے سینئر تھے ان سے ہر ملاقات میں کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوتا۔نوجوان دوستوں میں سے سجاد بابر، ناصر علی سید، یحییٰ احمد، منظر نقوی، حسام حر، سہیل انجم، نعیم اکمل اور یوسف عزیز زاہد سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

○

میرزا ادیب سے میرا پہلا تعارف تو ۱۹۶۰ء میں اُس وقت ہوا جب انہوں نے ادب لطیف میں میرا پہلا افسانہ شائع کیا۔اُس کے بعد طویل عرصہ تک ان سے رابطہ نہ ہوا۔اسی اور نوے کی دہائی میں اُن سے خط وکتابت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا،اُس کے بعد میں جب بھی لاہور گیا،اُن سے ملنے چوہان روڈ ضرور پہنچا۔

مرزا صاحب نے میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں رابطہ کا کام کیا اور مقبول اکیڈمی سے میرا تعارف کروایا۔مرزا صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب مٹھاس اور پدرانہ شفقت تھی۔اسلام آباد میں ان کی بیٹی لیکچرار کے طور پر آئی تو سال میں دو ایک بار وہ یہاں بھی آنے لگے۔آنے سے پہلے اطلاع دیتے ،میں فوراً پہنچتا اور پھر دو ایک دن ان کے ساتھ طویل ملاقات ہوتی۔خط لکھنے میں باقاعدگی کے قائل تھے۔مشہور تھا کہ ان کا ایک خط ، پڑھا جا رہا ہوتا ہے،تو دوسرا راستہ میں اور تیسرا وہ لکھ رہے ہوتے ہیں۔مجھ سے انہیں شکایت تھی کہ میں مختصر جواب دیتا ہوں۔میں جب بھی ان سے ملنے جاتا،محبت سے ہاتھ پکڑ لیتے اور اپنے پاس بٹھاتے ،اصرار کرتے کہ کھانا کھا کر جاؤں۔عموماً میرے ساتھ اشرف سلیم ہوتا۔اس سے بھی اسی شفقت کا برتاؤ کرتے۔میں اور اشرف سلیم جب آخری بار اُن سے ملے تو وہ ابھی چوہان روڈ

والے گھر ہی میں تھے۔ لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ خط لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد میرزا صاحب تھکے تھکے سے اندر آئے۔ چہرے پر وہ بشاشت اور تازگی نہیں تھی، لیکن بڑی گرم جوشی سے ملے۔ دیر تک میرا ہاتھ تھامے رہے۔ کسی کو آواز دی چائے لاؤ لیکن دیر تک کوئی جواب نہ آیا۔ ان کے چہرے پر ایک خفت سی تھی میں نے کہا۔ چائے کی فکر نہ کریں، ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہنے لگے، سارا دن لیٹا رہتا ہوں، دل گھبرا جاتا ہے کہیں آنے جانے کا سلسلہ نہیں۔ کاش کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں میں جا کر بیٹھ جاتا، اور لوگ بھی ہوتے، نئے لوگ بھی آتے اور ہم گفتگو کرتے۔ پھر بولے...... ''آپ تو اسلام آباد میں ہیں اکادمی کے چیئرمین سے کہیں نا کہ ہر شہر میں ایک رائٹرز کلب کی طرح کا کوئی سلسلہ قائم کریں'' میں نے کہا...... ''چیئرمین صاحب کو اور بہت سے کام ہیں، ادیب ان کا مسئلہ نہیں۔ اکادمی ادیبوں کے لیے نہیں اُس کے عہدیداروں کی آسائش و شہرت کیلئے بنائی گئی ہے''۔ یہ بڑی اداس ملاقات تھی۔ میں اور اشرف سلیم بجھے دل کے ساتھ ''لالہ صحرا'' سے نکلے، یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

○

ناصر بغدادی سے محبتوں کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ جدید حسیت کو سمجھنے اور افسانے میں برتنے کا جو سلیقہ ان کے پاس ہے وہ کم افسانہ نگاروں میں نظر آتا ہے۔ ''بادبان'' کی اشاعت سے انہوں نے بکھرے ہوئے دوستوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا ہے۔ ناصر بغدادی جلالی آدمی ہیں لیکن میں ان میں سے ہوں جن پر انہوں نے ہمیشہ جمالی نظر ہی ڈالی ہے۔

کراچی کے دوستوں نے بہت سے نئے ادبی جریدے نکال کر پرانے ادبی پرچوں کی مناپلی کو کافی حد تک توڑ دیا ہے اور لکھنے والوں کو ایک کھلا پلیٹ فارم فراہم کر دیا ہے۔ محمود واجد نے تو اردو افسانے پر مسلسل مضامین لکھ کر نئے افسانے کی تفہیم میں جو کردار ادا کیا ہے وہ جدید

افسانے کے ایک ہمدرد نقاد کا ہے۔ لیکن ''آئندہ'' کے اجراء سے اب یہ خیالات مربوط انداز سے سامنے آرہے ہیں۔ اسی طرح احمد زین الدین نے ''روشنائی'' اور شاہین بدر نے ''خیال'' کے اجراء سے نئے رویوں اور نئی نظریاتی بنیادوں کو ایک اظہار فراہم کر دیا ہے۔

کراچی کے دوستوں میں نجم الحسن رضوی بھی ہیں۔ اُن سے پہلی ملاقات افسانے اور ''سیپ'' کے حوالے سے ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ انفارمیشن آفیسر بن کر پنڈی آئے۔ یہاں قیام کے دوران شام کی محفلوں میں آتے اور ادب خصوصاً افسانے پر ان سے طویل گفتگو ہوتی، پھر وہ خلیج ٹائمز میں چلے گئے اور اب عرصے سے دوبئی میں ہیں۔ پاکستان آتے ہیں تو فون پر گفتگو ہوتی ہے۔ پنڈی آئیں تو ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ اچھے دوست اور اچھے افسانہ نگار ہیں۔

○

تمام رشتوں، محبتوں اور خلوص کے باوجود ایک مقام ایسا ہے جہاں آدمی بالکل تنہا ہوتا ہے۔ یہاں کسی کی شرکت نہیں ہوتی۔ اس تنہائی کا اپنا ایک مزا ہے۔ معمول سے بھاگنے کے یوں تو کئی راستے ہیں، کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر نکل جانا، یا ایک آدھ دن کے لیے معمول کے دائرے کو توڑ دینا لیکن سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی، کچھ دیر کے لیے سب کی نفی کر کے اپنا علیحدہ اثبات کرنا بھی ایک طرح کا مکاشفہ ہے، کئی بار سب میں بیٹھے بیٹھے میں کچھ دیر کے لیے اپنی ذات کی گپھا سے ہوتے ہوئے، آہستگی کے ساتھ ایک ایسی کھلی فضا میں اتر آتا ہوں جہاں نہ کوئی رشتہ ہے، نہ محبت نہ کوئی پابندی۔ یہاں آدمی خود اپنے جہاں کا خالق ہے جسے چاہے بنائے، جسے چاہے توڑ دے، یہاں تازہ ہوا ہے۔ دو چار لمبے لمبے سانس لے اور چپکے سے واپس اپنے دائرے میں آجائے۔ ورنہ راستہ تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ ''رات، شب ماہ پورن ماہی کا چاند اور ہرن ہے کہ چوکڑیاں بھرتا چلا جاتا ہے۔ دفعتہً جنگل ختم ہوا۔ سامنے ایک پرفضا باغ ہے جس کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری کہ......'' لیکن یہ جنگل تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا، آخر پر پہنچتا

ہوں تو پھر پہلا سرا آ جاتا ہے، ایک دائرہ..... دائرہ کے بعد دوسرا، پھر تیسرا اور یہ سلسلہ تو جاری ہے..... مکمل آزادی اور پوری اُڑان کی تمنا تو بس ایک تمنا بے تاب ہے۔ ایک مسلسل اضطراب اور مسلسل بے چینی۔

کبھی کبھی یہ اضطراب اور بے چینی کہاں چلے جاتے ہیں۔ مرشد ہنستا ہے..... "جب تجھے اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا"۔

کسی نے آئن سٹائن سے پوچھا تھا..... "کیا موت پر قابو پایا جا سکتا ہے" اُس نے جواب دیا..... "اگر زمان و مکاں پر قدرت حاصل ہو جائے" لیکن زمان و مکاں کا تو اپنا ایک جبر ہے، نہ ختم ہونے والا۔ اس سے فرار کیسے ممکن ہے، لیکن کچھ دیر کے لیے بھرے مجمع میں تنہا ہو جانے کا یہ احساس زمان و مکاں کی گرفت سے آزاد کر دیتا ہے..... آزادی کا ایک ہی لمحہ، جو اپنا ہے، جس میں کسی کی شرکت نہیں۔

میں نے پوچھا..... "اے شیخ یہ فنا اور بقا کا کیا فلسفہ ہے؟"

شیخ نے تالاب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو میں نے دیکھا ان کی ہتھیلی پر شعلہ پھڑ پھڑا رہا ہے۔ پھر شیخ نے گرم تنور میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس پر برف کا ایک ٹکڑا چمک رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرائے..... "فنا اور بقا ایک ہی سلسلے کی دو سمتیں ہیں"

اصل چیز وجود نہیں، وجود کا احساس ہے۔ اپنے ہونے کا یہ احساس تو اس جست ہی میں ہو سکتا ہے جو چند لمحوں کے لیے مجمع میں تنہائی کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے۔

○

نانک پورہ والے گھر میں ایک عجب طرح کا سحر تھا۔ میں وہاں تقریباً چالیس سال رہا۔ گویا بچپن سے جوانی تک کا زمانہ وہیں گزارا۔ اس گھر کے ہال کمرے میں بنا ہوا چبوترا

دوسروں کے لیے تو خیر دلچسپی کا مرکز تھا ہی خود میرے لیے وہ بڑے معنی رکھتا تھا۔ میں کبھی کبھار اس کے اندر بیٹھ جاتا اور یوں لگتا جیسے کسی عظیم گنبد نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ جوگندر پال پہلی بار پنڈی آئے تو میں نے انھیں اسی کمرے میں ٹھہرایا۔ اُن کے اور بھابھی کرشنا کے لیے تو اس گنبد کے خصوصی معنی تھے، میں اس گنبد اور کمرے کی خصوصی نگہداشت کرتا تھا اور دو تین ماہ بعد صابن سے اسے دھوتا تھا جس کی وجہ سے اس کا سنگ مرمر لشکارے مارتا تھا۔ جوگندر پال دوسری بار پنڈی آئے تو ہم ابھی اُسی گھر میں تھے۔ گلستان کالونی والا گھر بننا شروع ہو گیا تھا۔ میں ایک شام پال جی کو دکھانے لایا۔

بولے "یار یہ بہت دور ہے اور تم یہاں کیسے رہ سکو گے"

میں نے کہا "مجبوری ہے وہ گھر اپنا نہیں اوقاف والوں کا ہے۔ جگہ جگہ سے خستہ ہو گیا ہے اور وہ مرمت کا نام ہی نہیں لیتے۔ اب تو چھت کے نیچے لیٹتے ڈر لگتا ہے"

اور واقعی صورت حال یہی تھی بعض اوقات لیٹے لیٹے منہ پر مٹی آ گرتی تھی۔ چھت چھلنی تو تھی ہی اور غالب کے بلی ماروں والے گھر کا منظر پیش کرتی تھی، اب یہ ہونے لگا تھا کہ کوئی کوٹھے پر تیز قدموں چلتا تو لکڑی کی پھٹیوں میں سے مٹی سرکنے لگتی۔

گلستان کالونی آئے تو سب سے پہلے جو مہمان آئے وہ ابوالکلام قاسمی اور ان کی بیگم تھے۔ ان کا پنڈی کا قیام دو چار روز ہی کا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل بیچ کر گاڑی لے لی تھی اور الٹی سیدھی چلانی بھی سیکھ گیا تھا۔ ابوالکلام قاسمی اور بھابھی دونوں کو اسلام آباد کی خوب سیر کرائی۔ ابوالکلام قاسمی سے مسلسل مکالمہ ہوتا رہا۔ ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ اُن کے بعد مین را آئے۔ ایک شام لاہور سے سمیع آہوجہ کا فون آیا کہ وہ اور مین را رات کو پہنچ رہے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک بڑی غیر متوقع اطلاع تھی۔ مین را سے ایک تعارف افسانہ نگاری کے حوالے سے تھا اور دوسرا "شعور" کے ذریعے۔ رات کو دونوں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ مین را کے پاس پنڈی کا ویزہ

نہیں۔ سمیع انھیں ساتھ لے آیا۔ میں نے جلدی سے کچھ دوستوں کو اکٹھا کیا۔ مظفر علی سید، منشا یاد، احمد جاوید، جلیل عالی، یوسف حسن، نوازش علی اور اعجاز راہی اکٹھے ہو گئے۔ مین راسے افسانے کے حوالے سے طویل گفتگو ہوئی۔ دوستوں کے جانے کے بعد وہ، سمیع اور میں ساری رات باتیں کرتے رہے۔ اگلے دن مین را کو اسلام آباد کی سیر کرائی اور اسی شام وہ لاہور لوٹ گیا۔

نئے گھر کے تیسرے مہمان مرغوب احمد تھے۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ تو عرصہ سے جاری تھی اور ان کے بہنوئی اکرام تبسم جو لاہور میں ہوتے ہیں، سے بھی شناسائی تھی۔ مرغوب از رہِ کرم مجھے بھارت سے کئی کتابیں اور رسالے بھیجتے رہتے ہیں۔ لاہور آئے تو مجھ سے ملنے پنڈی بھی آ گئے۔ وہ بھی دو تین دن رہے۔ ایک شام میں نے دوستوں کو اکٹھا کیا اور شعر و ادب کے حوالے سے دلچسپ گفتگو ہوئی۔

کشمیریوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کھانے سے زیادہ کھلا کر خوش ہوتے ہیں، میں ہمیشہ اس روایت پر عمل پیرا رہا ہوں۔ ایک عرصہ تک جو بھی دوست پنڈی آتا۔ میں اسے ضرور مدعو کرتا اور ساتھ ہی بہت سارے دوستوں کو بھی زحمت دیتا۔ وہ سستے زمانے تھے اور رخسانہ میں بھی کام کرنے کی ہمت اور ولولہ تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ روایت بھی ہمارے گھر سے رخصت ہوتی گئی، ایک تو مہنگائی اور دوسرے کام کو سنبھالنے اور بہت سے لوگوں کی دعوت کے انتظام کی ہمت نہ رہی۔ لیکن ان محفلوں کا اپنا ایک لطف تھا۔ کھانا تو صرف ایک بہانہ ہوتا۔ ایسی محفلوں میں غیر رسمی بات چیت ہوتی اور مختلف ادبی موضوعات پر جس طرح کھل کر گفتگو ہوتی وہ حلقوں میں ممکن ہی نہیں۔ ان تین چار حضرات کے علاوہ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ بھارت سے اور بھی کئی دوست آئے جن میں احمد یوسف، باقر مہدی، وحید انور، قاضی افضال حسین شامل ہیں۔ یہ سارے دوست میرے یہاں آئے۔ بھارت سے اردو اساتذہ کا جو وفد آیا تھا، اس کا دورہ سرکاری نوعیت کا تھا۔ مسیح الدین صدیقی نے بڑا شور مچایا، ڈرایا بھی کہ ان کو کسی گھر

میں نہیں بلایا جا سکتا لیکن میں انہیں بھی کھینچ لایا۔ شالیمار میں بھی ان سے بہت سے دوستوں کو ملوایا۔ یہ ساری یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں، میری تمنائیں تو خاصی بے لگام ہیں۔ لیکن وسائل بہت محدود۔ غالب نے ''تمنا بے تاب'' کی ترکیب میرے لیے ہی تو وضع کی تھی۔

○

ڈاکٹر ستیہ پال آنند آئے تو ان سے ایک طویل مکالمہ تو حلقہ میں ہوا۔ موضوع نئی نظم تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے نئی نظم کے خد و خال واضح کیے۔ ہمارے یہاں دو طرح کی نظم لکھی جا رہی ہے ایک جو غزل کے آہنگ کے تابع ہے اور دوسری جس کا اپنا آہنگ ہے۔ دراصل غزل ہماری شاعری پر اتنا حاوی ہے کہ اس سے جان چھڑانا ممکن نہیں۔ غزل کا مزاج ہماری دیگر شعری اصناف پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ راشد قافیہ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن بعض اوقات قافیہ کے لیے فالتو مصرع لے آتے ہیں۔ نظم کا نیا آہنگ میراجی کے ہاں ہے چنانچہ ہماری نظم کی ایک روایت وہ ہے جو پابند نظم سے راشد اور پھر فیض تک پہنچی ہے اور دوسری روایت میراجی سے مجید امجد، وزیر آغا سے ہوتی ہوئی نصیر احمد ناصر تک آتی ہے۔ ستیہ پال آنند نے اسی روایت کو نظم کی جدید روایت قرار دیا۔ اگلی شام میں نے گھر پر کچھ دوستوں کو جمع کیا اور ان سے مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ تعلیمی معاملات پر ان سے کئی سوال کیے گئے۔ کسی نے پوچھا ''امریکہ میں استاد کب ریٹائر ہوتا ہے''

وہ ہنسے بولے ''استاد صرف یہاں ریٹائر ہوتا ہے، امریکہ میں جب تک وہ پڑھا سکتا ہے ریٹائر نہیں ہوتا'' حلقہ میں نئی نظم کی بحث کے دوران نصیر احمد ناصر کا بہت ذکر ہوا۔ میری اپنی رائے میں بھی وہ نئی نظم کے ایک نمائندہ شاعر ہیں اور ذاتی طور پر میں اسی طرح کی نظم کو نئی نظم سمجھتا ہوں۔ غزل کے آہنگ میں دبی ہوئی نظم غزل ہی کی توسیع ہے۔ نصیر احمد ناصر سے میری ملاقات ان دنوں ہوئی جب وہ ریاض میں تھے۔ وہاں ان دنوں شبنم مناروی اور صلاح الدین پرویز بھی

تھے۔ نصیر احمد ناصر اس دوران جب بھی پاکستان آتے اور اسلام آباد کا چکر لگتا تو ملاقات ہو جاتی۔ واپس پاکستان آئے تو دو چار ملاقاتیں تواتر سے ہوئیں۔ اسی زمانے میں ان کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے ''تسطیر'' نکالا تو بطور مدیران کی ایک اور خوبی سامنے آئی۔ ''تسطیر'' بھی ''اوراق'' کی طرح کا ایک ایسا رسالہ ہے جس میں مدیر کی شخصیت نظر آتی ہے۔ ہمارے بہت سے رسالے تو ایسے ہیں جیسے ڈاکخانہ کہ جو بھیجا جائے وہ آگے ڈلیور ہو جاتا ہے۔ لیکن ''تسطیر'' ایک مختلف پرچہ ہے جس کی بحثیں اور سوال تادیر اپنا اثر قائم رکھتے ہیں۔ نصیر احمد ناصر جب بھی پنڈی آتے ہیں ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتے ہیں اور جب بھی ملاقات ہوتی ہے تازہ ادبی مسائل پر گفتگو چل نکلتی ہے۔

ریاض ہی کے حوالے سے صلاح الدین پرویز سے بھی یاد اللہ ہے، اگرچہ ان سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی لیکن ہمارے درمیان تخلیق ایک ایسا رشتہ ہے جس کے حوالے سے ہم ایک دوسرے کے مزاج کو خوب سمجھتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ''استعارہ'' نکالا ہے جو اپنے مزاج کے حوالے سے بڑا مختلف رسالہ ہے۔ صلاح الدین پرویز کو بھی چھیڑ چھاڑ میں مزا آتا ہے کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے تو زندگی کی علامت ہے۔

○

نوے کی دہائی تک تو جدیدیت کی بحثیں زیادہ تر اس کی تاویل وتشریح سے متعلق رہیں لیکن نوے کے بعد مابعد جدیدیت، ساختیات اور بین المتونیت کے حوالے سے جو گفتگو شروع ہوئی وہ ایک حوالے سے رد جدیدیت بھی ہے۔ گوپی چند نارنگ، قمر جمیل، ضمیر علی بدایوانی، وزیر آغا، فہیم اعظمی اور قاضی افضال حسین نے اس حوالے سے جو مضامین لکھے ان میں سے وزیر آغا، ضمیر علی بدایوانی اور قاضی افضال حسین کی بحث اس حوالے سے قابل توجہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی فکری بحث کو اردو ادب سے جوڑنے کی کوشش کی ہے وگرنہ اس موضوع پر ہونے

والی اکثر بحث ترجمہ کی حد تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب کوئی رویہ یا رجحان دوسرے درجے کے لوگوں کے ہاتھ آ جاتا ہے تو اس میں سے نیا پن ختم ہونے لگتا ہے اور روحِ عصر کے تحت خود بخود نئے رویے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جدیدیت کا جو رجحان ساٹھ کی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ صدی کے آخر آخر میں خود روایت کا حصہ بن گیا اور نئی بحثیں شروع ہوگئیں جو وقت کے ساتھ ساتھ پرانی ہو جائیں گی۔

○

ادیبوں شاعروں کا ایک مجمع بیرون ممالک سے تعلق رکھتا ہے جو ڈالر اور پونڈ کے رتھ پر بیٹھ کر اردو ادب میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ لوگ اپنی بیرونی قوت کے بل بوتے پر راتوں رات بڑے ادیب اور شاعر بن جاتے ہیں۔ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ان ادیبوں کی کتابیں چھاپتے ہیں، ان پر مضامین لکھوا کر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ان کے فنکشن کرتے ہیں۔ یہ باقاعدہ کاروبار ہے۔ کچھ رسائل تو چل ہی اسی حوالے سے رہے ہیں۔ کالم نویس تک ان کے گرویدہ ہیں، اور واپسی میں وہ نہ صرف ان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں بلکہ ان کی بیوی، بچوں تک کی سلیقہ شعاری پر کالم لکھتے ہیں۔

باہر کے یہ ادیب شاعر کاروباری دنیا کے اصولوں کو استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، سو اب یہ بیرونی بستیاں عظمت کے میناروں سے ایسی بھری ہیں کہ ہر انچ پر ایک عظمت کھڑی ہے۔

○

تخلیقی عمل کی بنیادی تعریف اور مختلف مراحل کے کھوج کو سمجھنے کی مجموعی کوششوں کے باوجود شخص سے شخص اس کا مزاج، انداز اور طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ کوئی خیال کس طرح ذہن

میں آتا ہے اور کس کس طرح اپنے تخلیقی عمل سے گزر کر مناسب لفظوں اور ہیت و تکنیک کا چولا پہنتا ہے اس کا شعوری ادراک شاید ممکن نہیں۔ نقاد اپنے اصولوں اور دیگر علوم کی مدد سے اس کا اندازہ تو کر سکتا ہے لیکن خود تخلیق کار دو جمع دو چار کی سطح پر اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔

علامہ اقبال نے ایک بار کہا تھا میرے ذہن میں شعر کا تخیل ہی نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی یوں اتر رہے ہوتے ہیں ''جیسے ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے گر رہے ہوں'' یہ تخیل لفظوں کا روپ کیسے دھارتا ہے اور لفظ بارش کے قطروں کی طرح کیسے ٹپ ٹپ گرتے ہیں، ایک مخفی عمل ہے۔ تخلیق کے سارے پروسس کے بارے میں لکھنے والوں نے اپنے تخلیقی عمل کے مختلف مراحل کی غواصی کا دعویٰ بھی کیا ہے اور اس کی وضاحت کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن کیا یہ وضاحت مکمل ہے اور واقعی کوئی خیال اسی ترتیب اور مراحل سے گزر کر تخلیق کا روپ دھارتا ہے اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

تخلیقی عمل کی زیادہ بحث تو شعر کے حوالے سے ہوئی ہے۔ نثر کو چونکہ وقوعے کے زیادہ قریب سمجھا جاتا ہے اور اس میں ٹھوس حقائق بھی زیادہ ہوتے ہیں اس لیے نثر کے حوالے سے تخلیقی عمل کی بات کم کم ہی ہوئی ہے لیکن جدید افسانے اپنی بنت میں کئی حوالوں سے شعری تخلیقی عمل کے قریب ہیں اس لیے ساٹھ کی دہائی میں کئی افسانہ نگاروں سے بھی ان کے تخلیقی عمل کے بارے میں سوال کیے گئے۔ اپنے ایک انٹرویو میں، میں نے اس حوالے سے کچھ باتیں عرض کی تھیں، وہ یہ ہیں۔

''میرا تخلیقی عمل یوں ہے کہ میرے ذہن میں ایک خیال آتا ہے یا کسی صورت حال کو دیکھ کر یا اس سے گزرتے ہوئے ایک Idea پیدا ہوتا ہے۔ اس پر میرے ذہن میں ایک تخلیقی پروسیس شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات فوراً اور بعض اوقات مہینوں میں یہ خیال اس تخلیقی عمل سے گزرتا ہے۔ میں لکھنے سے پہلے اس کی منطقی یا تکنیکی ترتیب قائم نہیں کرتا۔ خیال اپنے ابتدائی

جملوں کے ساتھ میرے ذہن کی سکرین پر واضح ہوتا ہے۔ اگر یہ ابتدائی جملے مناسب نہ ہوں تو اسے لکھ نہیں سکتا۔ اگر میں پہلا جملہ لکھتا ہوں یا دو ایک جملے لکھ کر انہیں بار بار کاٹوں تو مجھے خود اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کہانی تخلیقی بھٹی ۔ل ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ میں اسے اسی طرح چھوڑ دیتا ہوں لیکن اگر میں نے ابتدائی چند جملے لکھ لیے اور وہ میری خواہش کے مطابق ہوئے تو کہانی آگے چل پڑتی ہے۔ کہانی شروع کرتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا ایک دھندلا سا اختتام ہوتا ہے۔ بعض اوقات کہانی اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات آگے نکل جاتی ہے۔ اس اختتام کے بارے میں میری پلاننگ کم ہوتی ہے۔ بس کوئی مجھے احساس کرا دیتا ہے کہ کہانی یہاں ختم ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کہانی مکمل کرنے کے بعد جب میں اسے دوبارہ پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی جہاں ختم کی گئی ہے اس سے کچھ پہلے مکمل ہو گئی ہے چنانچہ بعد کا حصہ کاٹ دیتا ہوں یا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بات ابھی بنی نہیں سو دو چار جملے یا پیراگراف اور لکھنا پڑتا ہے یہ کام میرا تخلیقی سیلف نہیں بلکہ میرے اندر کا نقاد کرتا ہے۔

مجھ پر کہانی ایک مکمل اکائی کی شکل میں وارد ہوتی ہے اسی لیے میری اکثر کہانیوں میں پیچ ورک نہیں۔ لیکن موضوع ایک ہوتا ہے ایک مرکزی خیال اور مرکزی رو بھی ہوتی ہے۔ میری اکثر کہانیوں کے موضوع ایسے ہیں جو ایک عام افسانہ نگار کے تخلیقی عمل کا حصہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے میرا تخلیقی عمل اور اس کا طریقہ کار مختلف ہے یوں کہہ لیجیے کہ مجھے ایک خیال سوجھتا ہے جو کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ میں کسی واقعہ میں سے خیال نہیں نکالتا۔ میرے یہاں شعری وسائل کے زیادہ استعمال کی بھی یہی وجہ ہے کہ میرے خیال اور موضوع سیدھے سادے طریقے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میرے اکثر افسانے ایک چھوٹی سی بات سے شروع ہوتے ہیں اور ازلی ابدی صداقتوں کو جا چھوتے ہیں۔ میرے افسانوں کا مرکزی کردار بیک وقت کئی

زمانوں میں سانس لے رہا ہے۔ وہ حال کے لمحہ پر کھڑا ایک ہی جست میں کبھی ماضی اور مستقبل میں اتر جاتا ہے لیکن پڑھنے والے کو زمانی جھٹکا نہیں لگتا''۔

○

''اور جس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اُس کو حقیقتاً پہچان لیا ہے، اُس نے اپنے وجود کو معروف کے وجود سے بھی زیادہ عظیم اور بزرگ تر کرلیا، کیونکہ جو شخص کسی چیز کو اُس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر پہچان لیتا ہے وہ دراصل اُس چیز سے بھی زیادہ قوی ہو جاتا ہے'' حسین بن منصور حلاج کا یہ قول ''طواسین'' میں درج ہے۔ لکھنا بھی ایک اظہار ہے اور اس اظہار کی توفیق اُسی کو حاصل ہوتی ہے جو حقیقت کو پہچان لیتا ہے، مجھے لکھنے کا دعویٰ نہیں، اپنے تئیں میں لکھنے کی کوشش کررہا ہوں کہ میں حقیقت کو اس کی تہہ تک پہنچ کر پہچاننا چاہتا ہوں۔ یہ نامعلوم کی تلاش ایک ایسا سفر ہے جس میں اپنا آپ گم ہو جاتا ہے۔ زماں کیا ہے اور مکاں سے پہلے وہ کس صورت میں تھا؟ وہ جو دور سرمئی دھند میں کہیں چھپا بیٹھا ہے، کیا ہے اور کون ہے؟ میرا اس سے تعلق کیا صرف خالق اور تخلیق کا ہے یا اس اسرار میں، میرا بھی کوئی کردار ہے، یہ وہ سوال ہیں جو مجھے لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اظہار ایک بنیادی شے ہے، ہر وجود اپنا اظہار چاہتا ہے اور اس اظہار کے لئے مختلف وسیلے تلاش کرتا ہے۔ میرا وسیلہ لفظ ہے چنانچہ میں لفظوں کو جوڑ کر وہ جملہ بناتا ہوں جو میرے باطن کو منکشف کرتا ہے۔ یہ ایک طویل ریاضت ہے، جس کا پہلا مرحلہ اپنے آپ کو جاننا ہے۔ اپنی شناخت اور پہچان کہ اس کے بعد ہی اگلا سفر شروع ہوتا ہے۔ سفر صرف خارجی نہیں ہوتا، خارجی سفر میں تو درمیانے یا اچھے درجے کا سفرنامہ ہی ہاتھ آسکتا ہے، ایک سفر اندر کا بھی ہے، بہت ہی پراسرار لمحہ لمحہ، قدم قدم چلتے جانا اور اس تجربے کو لفظوں کی مالا میں پرُو کر تخلیق بنا لینا، یہی لکھنے کی بنیاد ہے۔

میرے خواب، خواہشیں اور بے تاب تمنائیں وہ سامان ہیں جن سے میں لکھنے کا اہتمام کرتا ہوں۔اور یہ میرے باطن سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور خارج سے بھی، خارج سے یوں کہ میں جس معاشرے میں رہتا ہوں، اس کے مسائل و معاملات میرے بھی ہیں۔ان میں بہتری کی تمنا اور آئیڈیل کے خواب میری تحریروں میں آورش بنتے ہیں، لیکن میرا دائرہ صرف خارج تک محدود نہیں، میرے اندر بھی ایک دنیا موجود ہے اور اُس کے سوالات مختلف ہیں۔میری شناخت کی دو سطحیں ہیں جن کے اظہار کیلئے میں لکھتا ہوں، اول یہ کہ اس معاشرے میں، میں کہاں کھڑا ہوں، کس طبقہ کا فرد ہوں اور اس طبقاتی تضاد کے ظلم سے خود کو اور اپنے عہد کو کیسے بچا سکتا ہوں۔اس طبقاتی معاشرے میں کیا میری شناخت صرف میرا شناختی کارڈ نمبر ہے، یا میں اس معاشرے میں کہیں اور بھی وجود رکھتا ہوں۔یہ میری تحریروں کا سماجی اور سیاسی پس منظر ہے، میں بار بار کیوں فتح کر لیا جاتا ہوں میری رائے کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ میں اپنی لکھتوں میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اسی لیے لکھتا ہوں، لیکن یہ میرے ہونے کا خارجی لمحہ ہے، میری شناخت کا ایک داخلی اور باطنی لمحہ بھی ہے اور وہ یہ کہ میں کون ہوں؟ اس عظیم کائنات میں میرا وجود کیا معنی رکھتا ہے، میں ہوں بھی یا نہیں، یہ دائرہ در دائرہ سچ کا سفر کہاں ختم ہوتا ہے، ایک لمحہ ہے جہاں سرگشتگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں، جو راز ہے وہ راز ہی ہے۔میں اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ یہ راز مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس انکشاف سے مجھے جو مسرت اور سرشاری ملتی ہے میں اپنے قاری کو اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں، اسی لیے تو میں نے خرقہ اتار کر قلم سنبھال لیا ہے کہ سچ کی کوئی زبان، کوئی انداز، کوئی بھیس لباس نہیں ہوتا۔

میں عام شخص کے لیے نہیں لکھتا، میرا قاری مجھے خود تلاش کرتا ہے، میری لذتوں میں وہی شریک ہو سکتا ہو جو میرے تجربے کی اسراریت کو محسوس کر سکتا ہے۔میں کہانی جوڑتا نہیں، ٹکڑے اکٹھے نہیں کرتا۔کہانی ایک خیال کی طرح میرے ذہن میں آتی ہے اور تخلیقی عمل سے گزر

کر ایک وحدت کی طرح کاغذ پر بکھر جاتی ہے۔ میں اس کے لیے لفظ تلاش نہیں کرتا، یہ خیال اپنے لفظ خود لے کر آتا ہے، میری تخلیقی دنیا بہت سوں سے مختلف ہے، میرا تخلیقی عمل بھی مختلف ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں یہ میری باطنی واردات ہے۔ اس میں میرا ماحول اور معاشرہ بھی آجاتا ہے کہ بہر حال میں اس کا ایک فرد ہوں، لیکن میں اپنی پہچان ایک سماجی ماہر کے طور پر نہیں کرانا چاہتا، میں ایک تخلیقی فنکار ہوں اور جہاں فن آئے گا وہاں تکنیک بھی ہوگی۔ تکنیک اور فن ہوگا تو اسلوب بھی آئے گا یہ سب مل کر جو کچھ بنائیں گے اسے دو جمع دو چار کی طرح نہیں سمجھا جا سکتا، اس کی تفہیم کا طریقہ مختلف ہوگا۔

میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس رہے، یہ میری مجبوری نہیں میرا اظہار ہے کہ اظہار کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود نہیں ہوتا، جو وجود رکھے گا وہ اس وجود کا احساس بھی کرائے گا۔ جیسا میں نے کہا میرے اظہار کا ذریعہ لفظ ہے، میں لفظوں کو جوڑ جوڑ کر اپنے آپ کو منکشف کرتا ہوں۔ معاشرے میں میرا سفر ناک کی سیدھ میں نہیں، جو کچھ نظر آتا ہے میرے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے، جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ تجربہ میری کہانی میں ایک خارجی معنویت پیدا کرتا ہے، اسے سماج سے جوڑتا ہے اور اس میں روح عصر اور جدید حسیت پیدا کرتا ہے۔ میرا باطنی سفر پیچ در پیچ ہے کہ یہاں کوئی منزل نہیں، ایک سرمئی دھند ہے جس میں چلتے رہنا، چلتے ہی رہنا، ایک مبہم سی سچائی، ایک ایسا تجربہ جسے بیان کرنے کے لیے علامت اور استعارہ کی ضرورت پڑتی ہے، درحقیقت یہی میری کہانی کا اثاثہ ہے۔ یہ میری کہانی کا باطن ہے۔ اس کی اندرونی معنویت، جو اسے ماورائے عصر بناتی ہے۔

لکھنا......ادب لکھنا ایک پیچیدہ عمل ہے، ایک ایسا تخلیقی پراسیس جسے قطعیت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ خیال کس عمل سے گزرتا ہے اور کیونکر ایک فن پارے کی صورت اختیار کرتا ہے، اس کے بارے میں قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے، اور اس سے بھی زیادہ مشکل

اس سوال کا جواب ہے کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ بس میں لکھتا ہوں کہ مجھے لکھنا آتا ہے، شائد نہیں، یہ جواب مکمل نہیں۔ میں لکھوں نہ تو اور کیا کروں کہ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں۔ اظہار کے راستے تو آدمی ڈھونڈ ہی لیتا ہے، اس لیے یہ بھی کوئی مناسب جواب نہیں تو پھر کوئی کیوں لکھتا ہے؟ شہرت کیلئے، کسی آدرش کی تکمیل کے لیے، صرف اپنی ذات کے اظہار کے لیے...... میرا خیال ہے کہ یہ سب باتیں مل کر وہ اکائی بناتی ہیں جو لکھنے کا محرّک ہوتی ہے۔ جس طرح کسی اچھے فن پارے کو ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جا سکتا، کہ اچھا فن پارہ صرف خیال یا صرف اسلوب یا صرف تکنیک یا صرف جذبے کی بنیاد پر اچھا نہیں ہوتا بلکہ یہ سب جب ایک تناسب سے ایک اکائی میں ڈھل جاتے ہیں تو بڑا فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح لکھنا بھی ایک مکمل عمل ہے۔ لکھنے والا اپنے سماجی عمل سے بھی وابستہ ہوتا ہے اور اس سے ماورا ایک اور حقیقت کو بھی تلاش کر رہا ہوتا ہے اگر وہ صرف سماجی اظہار تک محدود رہ جائے تو دوسرے درجے کا حقیقت نگار بن جائے گا، جس کے لیے سادہ بیانیہ ہی کافی ہے لیکن اگر وہ سماجیات کے ساتھ ساتھ اَن دیکھے کو بھی دیکھنا چاہتا ہے تو اس کے عمل میں پیچیدگی آ جائے گی جس کے اظہار کے لئے علامت اور استعارے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اب یہ ہر لکھنے والے کا اپنا ظرف اور استطاعت ہے کہ وہ اپنے آپ کو کہاں رکھنا چاہتا ہے اور کن میں مقبول ہونا چاہتا ہے۔

لکھنے کے لئے ایک اضطراب اور بے چینی بہت ضروری ہے، یوں بھی نفس مطمئنہ کس کو ملا ہے، کشف کے بڑے سے بڑے تجربے کے بعد بھی ایک کسک، ایک بے چینی تو موجود رہتی ہے، لکھنا بھی ایک مکاشفہ ہی ہے۔ لکھنے والا مطمئن ہو جائے تو صورت حال کا غلام بن جاتا ہے، اس کے اندر درباداری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے لفظوں سے وہی کام کرتا ہے جو بھانڈ اپنی حرکتوں اور پھبتیوں سے کرتا ہے۔ تفریح اور حظ آفرینی میں ایک فرق ہے۔ لکھنے والا اپنی تحریر میں خود موجود ہوتا ہے۔ میں اپنے ہر کردار کے اندر بھی ہوں اور اس سے باہر بھی۔ ایک اضطراب

مجھے لیے لیے پھرتا ہے۔ کسی ان دیکھے، نامعلوم کی تلاش میں، یہ اضطراب ختم ہو جائے تو میرے اندر کا لکھنے والا مر جائے گا۔ کہتے ہیں کوئی درویش ہمیشہ یہ دعا مانگتا تھا کہ ''اے خدا مجھے مضطرب رکھ'' کسی نے کہا'' تو عجب شخص ہے، لوگ خدا سے اطمینان مانگتے ہیں اور تو اضطراب کا طالب ہے'' درویش بولا'' یہ اضطراب ہی تو میرے ہونے کی دلیل ہے'' سو میں بھی ہمیشہ اضطراب کی دعا مانگتا ہوں کہ میرا بے چین ہونا، میری تحریروں کی زندگی ہے۔ میرے عہد کے جو لکھنے والے بے چینی کی دولت سے عاری ہیں، وہ قصیدے لکھ رہے ہیں، لطیفے سنا رہے ہیں اور تالیاں پٹوا رہے ہیں، ان میں اور شوبز کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں، ان کی زندگی سٹیج پر پردہ گرنے تک محدود ہے۔ اس لیے ہر لکھنے والے کو انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ ویسے انتخاب کا مرحلہ تو ہر لمحے موجود ہوتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ غالبؔ اگر ذوقؔ کی راہ پر چلتے تو وقتی شہرت تو ضرور مل جاتی لیکن پھر وہ بھی اس طرح کے مصرعے کہتے:۔

؎ شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

وہ اس دکھ کا اظہار نہ کرتے

؎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن وقت سب سے بڑا نقاد ہے اس کی چھلنی میں سے گزر کر غالبؔ ہی زندہ رہتا ہے، ہر لکھنے والے کو اس نکتہ پر غور کرنا چاہیئے۔

میں اس لیے لکھتا ہوں کہ اپنا اظہار چاہتا ہوں، اپنے عہد اور اس کے آشوب کو لفظوں میں زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدرش کی تکمیل چاہتا ہوں کہ کبھی تو وہ غیر طبقاتی آئیڈیل معاشرہ وجود میں آئے گا جہاں میں اور مجھ ایسے سب سر اٹھا کر چل سکیں گے، ہمیں کوئی فتح کرنے والا نہیں ہوگا، ہماری رائے کی اہمیت ہوگی۔ یہ خواب سہی، میری بے تاب تمنائیں سہی، لیکن میری

تحریروں کا اثاثہ یہی خواب اور یہی تمنائیں ہیں۔ میں تو درویش بننا چاہتا تھا لیکن اس کا ظرف نہ تھا، دنیادار اس لیے نہ بن سکا کہ دنیاداری کا سلیقہ نہ تھا، سو میں نے لکھنے والے کا بھیس اپنا لیا ہے کہ اپنا تماشا دیکھوں اور دوسروں کا بھی۔

''ازل سے ابد تک ایک خواب، ایک پراسرار سرمئی دھند جس میں کچھ دکھائی دیتا ہے کچھ نہیں، اور میں جو وجود اندر وجود ایک چھوٹا سا جرثومہ ہوں کائنات کی وسعتوں کو دریافت کرنے چلا ہوں، عظمت کی یہ تلاش انا کی تسکین کے سوا اور کیا ہے؟''

''میں ہوں ...... '' یہی میرے لکھنے کا جواز ہے!

○

میرا جی پر کام کرتے ہوئے مجھے پہلی بار روایت لی اہمیت اور قوت کا احساس ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں اتھل پتھل کی ایسی فضا تھی کہ ہر پرانی بات بری لگتی تھی۔ جدید اور نیا کے معنی روایت سے انحراف تھے۔ آہستہ آہستہ دھند چھٹی تو احساس ہوا کہ جدید اور نیا بھی اضافی سچائیاں ہیں۔ روایت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ہم دراصل روایت پرستی کے خلاف تھے لیکن روایت پرستی اور روایت کے تسلسل میں فرق کو محسوس نہیں کر رہے تھے۔ یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی کہ کوئی بڑا سوال نہ رکھنے کے باوجود فیض بڑے شاعر کیوں ہیں اور ان کے جس سلیقہ کی بات ہوتی ہے وہ کیا ہے۔ اقبال جیسا عظیم فن کار چاہتا تو اپنے نئے خیالات کو نئے تلازموں اور نئے استعارات وعلامتی انداز میں بیان کرتا لیکن انہوں نے بھی فارسی کے سیٹ فریم کو استعمال کیا اور کسی موقع پر کہا بھی کہ جب یہ سیٹ فریم موجود ہیں اور لوگ ان سے مانوس بھی ہیں اور ان کے ساتھ ایک تہذیبی وفکری وفنی روایت بھی موجود ہے تو میں کیوں نہ انہیں استعمال کروں۔ میرا جی کے ساتھ یہی ہاتھ ہو گیا کہ وہ جزیرہ بن گئے۔ اگرچہ آخر آخر میں جس کا آغاز ''صدا بصحرا'' جیسی نظموں سے ہوتا ہے انہیں اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ

کی اوران کا یہ انداز کسی موثر صورت میں سامنے نہ آسکا۔ میری سب سے پہلی کتاب ''نیا ادب'' تھی۔ میں اس وقت افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا لیکن اس وقت میرا مسئلہ افسانہ سے زیادہ نئے ادب کو متعارف کروانے کا تھا۔ کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ نئے رویوں اور نئے خیالات کے بارے میں ایک تعصب برتا جارہا ہے، اس لیے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ نئے ادب کا ایک جامع فکری اور فنی تعارف کروایا جائے۔ اس وقت مسئلہ معیار سے زیادہ مقدار کا تھا۔ نیا ادب کے شروع میں، میں نے لکھا تھا۔

''یہ مضامین بغیر کسی دیباچہ کے پیش کیے جارہے ہیں کہ ان کی اپنی حیثیت نئے ادب کے تعارف کی سی ہے مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی یہ مضامین کسی مروجہ تنقیدی نظریے، اصول یا اسلوب کے تحت لکھے گئے ہیں''۔

آگے چل کر میں نے روایت کے حوالے سے جدید اور نئے کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''بنیادی طور پر روایت ایک ایسا رشتہ ہے جس سے مکمل کٹاؤ ممکن نہیں لیکن اس سے وابستگی کی دو صورتیں ہیں، اول یہ کہ کوئی شخص اس سے شعوری طور پر منسلک ہو، دوم یہ کہ اجتماعی لاشعور کا حصہ بن کر خود بخود تخلیق میں در آئے۔ چنانچہ روایت پرست اور روایت کا باغی دو فن کار ہمارے سامنے آتے ہیں، اصولاً روایت کا باغی ایک مبہم اصطلاح ہے کہ ہر باغی کسی پرانی چیز سے بغاوت کرتا ہے اس لیے کسی نہ کسی شکل میں اس کا تعلق اس پرانی شے سے قائم رہتا ہے۔ یہی صورت جدت کی بھی ہے کہ ہر جدت کسی پرانی چیز کی تجدید کرتی ہے گویا روایت کا رشتہ شعوری ٹھہرا۔ ''نیا'' میں یہ رشتہ شعوری نہیں بلکہ اجتماعی لاشعور کی ایک رو ہے، چنانچہ ''نیا'' بظاہر روایت سے کٹا ہوا محسوس ہوتا ہے''۔

''جدید'' اور ''نیا'' کی یہ بحث ساٹھ کی دہائی میں اس لیے اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ ردعمل کے طور پر نئے لکھنے والے خود کو جدید بھی کہلوانے پر تیار نہ تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا

گیا اور چیزیں واضح ہوتی گئیں، یہ دھند بھی ختم ہونے لگی۔ روایت پرستی سے قطع نظر روایت کے تسلسل اور قوت کا احساس نمایاں ہونے لگا۔ میراجی کے ساتھ جو اجنبیت پیدا ہوئی اس کی وجہ بھی یہ تھی۔ اس کے برعکس راشد روایت کی مخالفت کے باوجود پوری طرح روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ مجید امجد کے ساتھ بھی کسی حد تک یہی معاملہ ہے کہ اپنی فکری توانائی اور جدید انکشافات کے احساس کے باوجود ان کے گرد بھی اجنبیت کا ایک ہالہ موجود ہے۔ فیض اس حوالے سے زیادہ سیانے نکلے اور کمزور وکٹ پر شاندار کھیل کا مظاہرہ کر گئے۔ ایک طویل عرصہ بعد اب مجھے احساس ہوا کہ روایت ایک بہت بڑی قوت ہے۔ جو تخلیق کو ایک حسن ہی نہیں بخشتی اس میں ایک تہذیبی رچاؤ بھی پیدا کر دیتی ہے۔

ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک منجمد معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ یہاں اوپر کی سطح پر ریڈیکل قسم کی تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن زیرِ سطح وہی کائی جمی ہوئی ہے۔ یہاں شاعر ادیب کا تجربہ بہت محدود ہے۔ اس کا زیادہ علم کتابی ہے چنانچہ یہاں کتاب میں سے کتاب نکلتی ہے۔ غالب کی عظمت کا ایک پہلو ان کے بڑے سفر تھے۔ آگرہ سے دہلی، دہلی سے کلکتہ اور پھر رام پور، ان سفروں نے انہیں نئے تجربات سے آگاہ کیا۔ یہ تجربات کتابوں سے حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ کلکتہ کے سفر میں وہ جس نئی تہذیب سے آشنا ہوئے، اس نے کئی پرانے عقیدوں کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ اس دور میں ہمارے عام شاعروں کا تو یہ حال تھا کہ انہیں گھر سے دربار تک کے راستے کے سوا کوئی اور راستہ معلوم نہیں تھا۔ اب بھی زیادہ تر صورت یہی ہے، ہمارے ادیب کے تجربے کا دائرہ بہت چھوٹا ہے۔ ملک سے باہر جانا تو ایک طرف اکثر ادیبوں نے اپنا ملک بھی پوری طرح نہیں دیکھا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں جو کچھ مشاہدے اور تجربے میں آ جاتا ہے وہ ایک چھوٹے عرصہ تک تو تخلیق میں ظاہر ہوتا ہے لیکن عمر کے ایک حصہ میں پہنچ کر جب شب نوردی ختم ہوتی ہے اور زندگی کے عام معمولات شروع ہوتے ہیں تو کتابی علم اور

مطالعہ ہی باقی رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ساٹھ سال کے بعد ہمارے اکثر بڑے ادیب خود کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس نیا تجربہ نہیں ہوتا، وہ صرف فنی تجربے اور مہارت کے زور پر لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس دنیا کے دوسری زبانوں کے ادیبوں کو دیکھیں تو وہ نوے نوے سال کی عمر میں بھی سفر پر نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہماری شاعری تو ابتدا ہی سے لکیر کی فقیر رہی ہے اور داستانوں میں بھی یہی کیفیت ہے کہ ان میں مماثلتیں، تجربے اور مشاہدے کی ایک یکسانیت صاف محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں روایت کے تسلسل کی بجائے روایت پرستی کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

○

''پاکستانی ادب'' کا سلسلہ ہمدانی صاحب کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس کی چار جلدیں چھپی تھیں، اس انتخاب پر بعض اعتراضات کے باوجود بڑے پیمانے پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ کالج کو کافی آمدن بھی ہوگئی جو ہم نے سٹوڈنٹ فنڈ میں جمع کرا دی۔ اسی دوران ہمدانی صاحب جدہ کالج کے پرنسپل بن کر سعودی عرب چلے گئے۔ ان کی جگہ محمد امین بھٹی پرنسپل بنے۔ لیکن انہوں نے پاکستانی ادب کے سلسلے کو جاری رکھنے کی خواہش کی، چنانچہ پانچویں جلد جو تنقید سے متعلق ہے شائع ہوگئی۔ اسی دوران ایک دن ڈاکٹر افضل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ منصوبہ مکمل ہوگیا ہے میں نے کہا۔ مکمل ہی سمجھئے، ہمارے ذہن میں تھا کہ ڈرامے پر بھی ایک جلد مکمل کی جائے لیکن اب مالی حالات ایسے نہیں، پہلی جلدوں کی طباعت کے اخراجات آرمی پریس نے ادا کئے تھے، پانچویں جلد ہم نے اپنے وسائل سے چھاپ لی، اب سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر افضل نے اسی وقت ڈاکٹر اقبال حسین کو فون کیا کہ سرسید کالج کو پچاس ہزار روپے کی گرانٹ دی جائے۔ چند دنوں میں چیک مل گیا۔ ہم نے اسی وقت ڈرامے کی چھٹی جلد جو دو حصوں میں ہے، چھاپ لی، یوں ''پاکستانی ادب'' مکمل ہوگیا۔

○

فوج کے ساتھ ملحق ہونے کے بعد ہمارے پہلے ڈائریکٹر نصیر الدین تھے، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، ادب کا ذوق رکھتے تھے انہوں نے اس سارے سلسلے میں قدم قدم ہماری معاونت کی ان کے بعد صفدر نواب آ گئے۔ یہ خانوادہ بھی علمی تھا سجاد حیدر یلدرم سے ان کا سلسلہ ملتا ہے۔ انہوں نے بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ صفدر نواب بڑے نستعلیق، خلیق اور مردم شناس تھے۔ اسی زمانے میں نظامت نے ''اقرا'' کے نام سے ایک تعلیمی جریدے کا آغاز کیا۔ اس کا کام عرفان صدیقی کو سونپا گیا۔ عرفان صدیقی کا تعلق جماعت سے تھا۔ اس نے پہلے شمارے ہی میں ایسا رنگ دکھایا کہ پرچہ ایک خاص نقطہ نظر کا ترجمان بن کر رہ گیا۔ صفدر نواب نے مجھے بلایا اور کہا کہ اب پرچہ تم نکالو۔ میں اسے معمول کا رسالہ بنانے کی بجائے اساتذہ کا ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا چاہتا تھا جہاں تدریسی مسائل پر بحث ہو اور ایک دوسرے کے تدریسی تجربے میں شرکت کی جائے، اس کے ساتھ ہی ہر بار کسی ایک ترقی پذیر ملک کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے۔ دوسرے پرچے میں، میں نے ایران کے نظام تعلیم کا مطالعہ کرایا۔ انقلابِ ایران کے بعد امام خمینی نے ایک زبردست تقریر کی تھی جس میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے دہرے پن اور اس کی خامیوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ میں نے یہ تقریر ترجمہ کرا کے چھاپ دی۔ اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ان دنوں انقلابِ ایران بہت سے لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ صفدر نواب خود شیعہ تھے، ایک صبح کالج پہنچا ہی تھا کہ انہوں نے بلا بھیجا۔ اس زمانے میں ہماری نظامت کے دفاتر جی ایچ کیو کے اندر ہوتے تھے۔ ان کے پی اے نے کہا کہ آپ کا گیٹ پاس بھیجا جا چکا ہے فوراً پہنچیں۔ میں گیا تو صفدر نواب کہنے لگے ''یہ کیا پھڈا کر دیا ہے''۔

میں نے کہا...... ''کیا ہوا؟''

بولے...... ''یہ خمینی کی تقریر کیوں چھاپ ڈالی''

صفدر نواب اپنے عہدے کے حوالے سے ''اقرا'' کے چیف ایڈیٹر اور میں ایڈیٹر تھا لیکن انہوں نے کبھی پالیسی معاملات میں دخل اندازی نہ کی تھی۔

میں نے کہا...... ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے اس شمارے میں ایرانی نظام تعلیم کا مطالعہ کیا ہے، اس لیے خمینی کی یہ تقریر اس کا حصہ ہے، دوسرے یہ کہ یہ تقریر نہ تو سیاسی نوعیت کی ہے اور نہ اس میں کوئی مذہبی مسئلہ ہے یہ خالصتاً تعلیم سے متعلق ہے اور اس کے مندرجات کے بارے میں کسی بھی فرقے کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا'' بولے...... ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں کی صورت حال تو تمہیں پتہ ہی ہے، اوپر والوں نے اس کے بارے میں پوچھا ہے'' صفدر نواب جیسے شخص کو وردی میں دیکھ کر فوج کے بارے میں سارے تعصبات ختم ہو جاتے تھے، اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مربیانہ تھا۔ میرے پاس ان دنوں موٹر سائیکل تھا۔ ایک دن شدید بارش میں مجھے ان کے دفتر جانا پڑا۔ میں نے موٹر سائیکل شیڈ کے نیچے کھڑی کی اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے، میں ان کے دفتر پہنچا۔ ''اقرا'' کے معاملات پر گفتگو ہوچکی تو بولے...... ''گاڑی کیوں نہیں لیتے''

میں نے کہا...... ''میں نے تو موٹر سائیکل بھی دفتر سے ایڈوانس لے کر لی ہے۔ جب تک موٹر سائیکل کا ایڈوانس ختم نہ ہو جائے موٹر کا ایڈوانس نہیں مل سکتا اور اس میں ایک لمبی قطار ہے انتظار کی''

اسی وقت ایڈمن افسر کو بلایا اور اس سے کہا کہ کوئی راہ نکالو۔ مجھے آؤٹ آف دی ٹرن گاڑی کا ایڈوانس مل گیا۔ اس زمانے میں یہ رقم پینتیس ہزار ہوتی تھی اور تیس پینتیس تک مناسب گاڑی مل بھی جاتی تھی رقم ملی تو میں نے اس میں سے آدھے پیسوں سے کتاب چھاپ لی۔

کچھ دنوں بعد میں پھر ''اقرا'' کے سلسلے میں ان کے پاس گیا۔ ان کے کمرے کی کھڑکی شیڈ کی طرف تھی۔ مجھے موٹر سائیکل کھڑا کرتے دیکھ لیا۔ ''اقرا'' کے مسودے پر بات ہوگئی تو

بولے...... ''گاڑی کہاں ہے''۔

میں نے کتاب نکال کرانہیں پیش کی اور کہا...... ''کتاب چھپوالی ہے''۔

خوب ہنسے بولے...... ''کتنے پیسے خرچ ہوئے؟''۔

میں نے کہا...... ''بیس ہزار''

کہنے لگا...... ''باقی کہاں ہیں؟''

میں نے کہا...... ''پڑے ہیں''

اسی وقت ایڈمن آفیسر کو بلایا اور کہا کہ اس سے سو کاپیاں نقد ادائیگی پر لے کر ساری لائبریریوں کو بھجوادو اور مجھ سے کہنے لگے...... ''اب بغیر گاڑی کے آئے تو اندر نہیں آنے دوں گا''۔

صفدر نواب جوہر شناس تھے۔ محنت سے کام کرتے تھے اور کام کرنے والے کی قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ دیانت داری کا یہ حال تھا کہ اپنی چائے کا تھرموس گھر سے ساتھ لے کر آتے تھے۔ دفتر کے انٹرٹینمنٹ الاؤنس میں سے ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کا گھر بن رہا تھا۔ ان کے پاس فوکسی گاڑی تھی۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ سامان اس کی چھت پر باندھے جارہے ہیں۔ کالج سے ایک مالی شام کو ان کے گھر جاتا تھا جسے وہ اپنی جیب سے تنخواہ دیتے تھے۔ اصول پرستی کا یہ حال تھا کہ جب ہمدانی صاحب جدہ سے واپس آئے تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ سرسید میں واپس آجائیں۔

ہمدانی صاحب بھی شیعہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ صفدر نواب ان کی طرف داری کریں گے لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ایک شخص نے مشکل وقت میں کالج کو سنبھالا ہے اب اسے کس بنیاد پر وہاں سے ہٹادوں۔ ان کے زمانے میں مجھے بہترین استاد کا ایوارڈ بھی ملا۔ ہمارے کالج میں یہ ایواڈ مجھے اور مجھ سے پہلے جمیل ملک کو ملا تھا۔ انہوں نے مجھے آنریریم (Honorarium) بھی دلایا جو ایک منفرد مثال ہے۔ ان کے زمانے میں ''اقرا''

کے چار شمارے نکلے۔ ان کے بعد سعید کھوکھر آئے یوں تو وہ بڑے کھلے ڈلے اور مزے کے شخص ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں ان کے زمانہ نظامت میں میرا ان سے تعلق قائم نہ ہو سکا۔ نہ ہی ''اقرا'' کا کوئی شمارہ نکلا۔ سال بھر بعد ہی وہ ریٹائر ہو گئے اور اس کے بعد ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے بعد محمد علی آئے۔ یہ انگریزی ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ مظفر علی سید کے شاگرد تھے۔ ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی اور دیگر فنون سے بھی دلچسپی تھی۔ سید صاحب اس زمانے میں اسلام آباد میں تھے اور عموماً ہفتہ والے دن اُن سے ملنے جی ایچ کیو آ جاتے، میں بھی پہنچ جاتا۔ ''اقرا'' کا سلسلہ پھر چل نکلا۔ اتفاق سے محمد علی کو گلستان کالونی ہی میں گھر ملا۔ شام کو اکثر سیر کرتے ہوئے بھی ان سے سلام دعا ہو جاتی اور کبھی کبھی چھوٹا موٹا مکالمہ بھی۔ ادب کے آدمی ہونے کے حوالے سے ان میں بھی فوجی تکبر نہیں تھا۔ کالج آتے تو سارے سٹاف سے گھل مل جاتے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ہم لوگ لائبریری کے سامنے دھوپ میں بیٹھے ہوتے۔ بریگیڈئر صاحب پہلے سیدھے ہمارے پاس آتے۔ ایک ایک سے ہاتھ ملاتے پھر پرنسپل کے دفتر میں جاتے۔ بعض اوقات بھٹی صاحب اس کا برا بھی مناتے لیکن محمد علی نے اپنی عادت نہیں چھوڑی۔ ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھتے تو انگریزی ادب کے حوالے سے بہت عمدہ گفتگو ہوتی۔ اُس زمانے میں محمود کنور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مشتاق قمر بھی تھے۔ محمد علی کو ڈرامہ سے بڑا انس تھا۔ انہی کے کہنے پر پہلی بار کالج میں ڈرامیٹک کلب قائم ہوا اور شہزاد مسعود نے ایک بہت ہی اچھا تجرباتی ڈرامہ کالج ہال میں پیش کیا۔ محمد علی کے دور میں ''اقرا'' کا ایک ہی شمارہ نکلا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا کہ بعد والوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عزیز احمد خان ڈائریکٹر ہوئے تو ادبی ماحول لوٹ آیا۔ ایک زمانے میں جب وہ لفٹننٹ کرنل اور آرمی پبلک سکول کے پرنسپل تھے تو حسن، حسین وہاں پڑھتے تھے۔ میں اکثر سکول جاتا، آہستہ آہستہ ان سے ایسے مراسم ہوئے کہ میں پیریڈ سے فارغ ہوتے ہی ان کے پاس پہنچ جاتا۔ چائے اکٹھی پیتے۔ عزیز احمد خان

انگریزی ادب میں ایم اے ہیں۔ لیکن ادب کے ساتھ ساتھ سیاست، ثقافت اور دوسرے فنون پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے ساتھ گفتگو کر کے لطف آتا ہے۔ جس زمانے میں، میں مزاحمتی ادب مرتب کر رہا تھا۔ کرنل غلام سرور کے بیٹے کے ولیمہ میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اُس زمانے میں چیف کے ساتھ تھے۔ بولے...... ''یہ مزاحمتی ادب کا کیا سلسلہ ہے''۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ '' آپ کو کیسے معلوم ہوا''۔

ہنسے...... ''مارشل لا نہ سہی لیکن فوج اتنی بھی بے خبر نہیں''۔ میں نے کہا...... ''فکر نہ کریں یہ کسی ادارے کے خلاف نہیں۔ ایک فردِ واحد کے بارے میں ہے''۔

بولے...... ''میرا بھی یہی خیال ہے کوئی ادارہ خراب نہیں ہوتا اور کوئی فردِ واحد ادارہ ہوتا بھی نہیں اور نہ اُس کی رائے ادارے کی رائے ہوتی ہے''۔

وہ اپنی گفتگو سے فوجی نہیں لگتے لیکن فوجی بہر حال فوجی ہی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ آپ کسی بھی مولوی سے بات کریں۔ وہ کتنا ہی لبرل ہو آخر میں اس کے اندر سے دیوبند یا بریلی نکل آئے گا۔ فوجی کتنا ہی پڑھا لکھا اور لبرل ہو آخر میں اس کے اندر سے بھی کاکول ہی نکلے گا۔ عزیز احمد خان بڑے پڑھے لکھے اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ بڑی مزے دار گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن بعض باتوں میں ان کے اپنے تعصبات ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک دل لبھانے والی مسکراہٹ رہتی ہے۔ اُن کی اس مسکراہٹ کو دیکھ کر برق تبسم کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ جوہر شناس ہیں۔ ملنسار اور دوستوں کے دوست، کام کرنے والے کی بہت ہمت افزائی کرتے ہیں۔ لیکن فرائض میں کوتاہی ہو جائے تو پھر ماتھے پر آنکھیں رکھنے کا بھی اپنا ایک انداز ہے۔ برقِ تبسم ان کی آنکھوں اور ہونٹوں دونوں پر جلوے دکھاتی ہے۔ سراپا جمال ہی جمال لیکن اس جمال میں کبھی کبھی جلال کے کوندے بھی لپکتے ہیں۔ عزیز احمد خان کی جس خوبی نے مجھے بڑا متاثر کیا وہ انکی اصول پرستی ہے۔ جس زمانے میں وہ پرنسپل تھے۔ ایک جرنیل صاحب سکول کے گیسٹ ہاؤس کو اپنی نجی محفلوں کیلئے استعمال کرتے تھے۔ ان محفلوں میں سبھی کچھ ہوتا تھا۔

عزیز احمد خان پرنسپل بن کر آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ روزرات کو یہ گیسٹ ہاؤس آباد ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک دن اس پر تالا لگا دیا۔شام کو جرنیل صاحب آئے تو دروازہ بند۔ چوکیدار پر برس پڑے کہ تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی۔ وہ بولا "جناب، تالا میں نے نہیں پرنسپل صاحب نے لگایا ہے"۔ جرنیل صاحب نے اُسی وقت جلالی انداز میں اُنہیں فون کیا اور اس جرات رندانہ کی وضاحت چاہی۔ انہوں نے کہا "جناب یہ گیسٹ ہاؤس پرائیویٹ محفلوں کیلئے نہیں"۔ جرنیل صاحب بھر گئے لیکن عزیز احمد نے تالا نہ کھلوایا۔ معاملہ کور کمانڈر تک پہنچا۔کور کمانڈر اصولی شخص تھا۔ اس لئے بچ گئے۔

میں نے ایک دن اُن سے پوچھا۔آپ نے اتنا بڑا رسک کیسے لے لیا۔ بولے۔ ''میں حق پر تھا اور میرا ایمان ہے کہ حق کو شکست نہیں ہوتی''۔ اُن کی ایک اور خوبی یہ ہے کسی کی حق تلفی نہیں ہونے دیتے۔سر سید کالج کے پرنسپل کی ترقی گریڈ اکیس بھی ہونا چاہیئے تھی لیکن کوئی ڈائیریکٹر اس لیے کیس آگے نہ بھجواتا کہ ڈائیریکٹر خود گریڈ بیس کا ہوتا ہے اور یہ خدشہ تھا کہ پرنسپل اکیسویں گریڈ میں ہو گیا تو اس کے قابو میں نہیں رہے گا۔عزیز احمد خان ڈائیریکٹر ہو کر آئے تو کئی لوگوں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے پرنسپل کا کیس آگے بھجوا دیا اور کوشش کر کے اسے اکیسویں گریڈ میں ترقی دلوادی۔انکا کہنا تھا کہ حق دار کو اس کا حق ملنا چاہئے۔

عزیز احمد خان کی بیگم فاطمہ نور بہت اچھی شاعرہ ہیں، خصوصاً انکی حمدیہ نظموں اور نعتوں میں ایک منفرد رنگ ہے۔لیکن انہوں نے اپنا کلام چھپوایا نہیں۔ میں نے کئی بار کہا بھی کہ آپ ایک اچھی شاعرہ کو ضائع کر رہی ہیں۔وہ ہوں ہاں کر کے ٹال جاتی ہیں۔ان کی قومی نظمیں بھی خاصے کی چیز ہیں۔

○

ایک اضطراب اور بے چینی تو مجھے ورثے میں ملی ہے کہ والد تمام تر دنیاوی متعلقات کے باوجود ایک صوفی تھے۔امی روحانیت کے نظری مسائل کو تو نہیں سمجھتی تھیں لیکن انہیں وظیفے

کرنے ،مزاروں پر جانے اور ورد کرنے کا ایک ایسا چسکا تھا کہ ان کی باتوں میں ایک اسرار آ گیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ ورثے میں ملا ہے۔ پھر میرا اپنا مزاج بھی ایسا ہی ہے چنانچہ اُس درویش کی طرح جو ہمیشہ یہ دعا مانگتا تھا کہ ''اے خدا مجھے بے چین رکھ'' میں بھی اکثر اسی اضطراب کی تمنا کرتا ہوں کہ یہ اضطراب اور بے چینی بندے کو اندر سے زندہ رکھتی ہے۔ خدا کے ساتھ میرا تعلق بھی کئی سطحوں پر ہے۔ یہ دوستی بھی ہے، عاشقی اور معشوقی بھی۔ اور اناؤں کا ٹکراؤ بھی، میں اس سے باقاعدہ لڑائی بھی کر لیتا ہوں اور اس کی حمد وثنا میں ڈوب جاتا ہوں۔ اضطراب حد سے بڑھے تو اس کے ناموں کا ورد ایک عجیب طرح کا سکون دیتا ہے۔ مفتی جی نے میرے خاکہ میں ایک بڑی پتے کی بات لکھی تھی کہ میں ایک ایسی سرحد پر ہوں جس کے ایک طرف مادیت اور دوسری طرف روحانی اسرار ہیں۔ وہ مجھے کہتے تھے کہ کسی پر اسرار قوت نے تمہارے پاؤں باندھے ہوئے ہیں ورنہ تمہارے مزاج میں ایسی شدت ہے کہ اگر ذرا سا بھی روحانیت کی طرف اتر گئے تو ہمیشہ کے لیے اس میں گم ہو جاؤ گے۔ یہ بات مختلف حوالوں سے امی بھی مجھے کہتی رہتی تھیں۔ مجھے خود ایک زمانے میں وظیفے کرنے کا چسکا تھا لیکن وہ مجھے منع کرتی تھیں۔ اس میں تو بہر حال شک نہیں کہ میرے مزاج میں اتار چڑھاؤ بہت زیادہ ہے۔ کبھی ایسی تندی کہ طوفان سے ٹکرا جانے کو جی چاہتا ہے اور کبھی ایسی نرمی کہ ہوا کا نرم سا جھونکا بھی گرا دیتا ہے۔ شناخت تو ہمیشہ ہی میرا مسئلہ رہی ہے۔ ایک زمانے میں تیز غصیلے نوجوان کو معاشرے میں اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا۔ پھر قومی شناخت کا مسئلہ درپیش ہوا اور اب کائنات میں اپنے ہونے کا جواز اور اہمیت کا احساس سفر سے اور ایک نئے سفر کے راستے کھول رہا ہے۔ زندگی کا تسلسل انفرادی ''میں'' کے ساتھ ہے یا کسی اجتماعی صورت میں۔ اجتماعی ہے تو پھر یہ ''میں'' کیا صرف اسی دنیا تک محدود ہے۔ دنیاوی حوالوں سے میں کوئی اتنا ناکام شخص نہیں۔ بھرپور ملازمت کی۔ بیسویں گریڈ میں ریٹائرڈ ہوا، جو میری ملازمت کی انتہا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اچھی جگہ کام کر رہا

ہوں ۔ ملازمت کے دوران گھر بنالیا۔ وقت پر بیٹی کی شادی ہوگئی ۔ دونوں بیٹے پڑھ رہے ہیں ۔ کوئی پوچھ سکتا ہے اور کیا چاہیے ۔ لیکن میں نہیں بتا سکتا ، کسی کو نہیں سمجھا سکتا کہ ایک دنیا اندر بھی ہے جو دراصل اس کائنات سے جڑی ہوئی ہے ۔ دنیا کی بہت سی نعمتیں ہوتے ہوئے بھی کوئی ایک ایسی چیز میرے پاس نہیں ہے جسے میں ہمیشہ تلاش کرتا رہا ہوں ۔ غم اٹھانے کا اپنا ایک مزا ہے ۔ عشق میں جلنا ، سسکنا اپنی ایک لذت رکھتا ہے ۔ رخسانہ کے ساتھ میرا عشق بھی اسی نوعیت کا ہے ۔ میاں بیوی کے معمول کے تعلقات کے ساتھ ساتھ میں کبھی کبھی جان بوجھ کر ایسی بات کر جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے میں تادیر اس کی ناراضگی کا دکھ اٹھاؤں ۔ میرے عشق زیادہ تر خیالی تھے ۔ جو عورتیں بھی مجھے اچھی لگیں میں نے کبھی سنجیدگی سے ان کے قریب ہونے اور انہیں اپنے جذبے کا احساس نہیں ہونے دیا ۔ بس اپنے طور پر ایک خیالی دنیا بنا کر ان کے عشق میں جلنے کی لذت اٹھاتا رہا ۔ مجھ سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ تمہاری ایسی کہانیوں میں جہاں محبت کا کوئی لمحہ مقید ہے کسک کا احساس اتنا زیادہ کیوں ہے ۔ اُس وقت تو شاید میں کوئی مناسب جواب نہیں دے سکا تھا لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ کسک تو میری روح کا حصہ ہے ۔ جدائی کا لمحہ اور پھر دیر کے بعد پل بھر ملنے کی خوشی صرف کسی انسانی رشتے تک محدود نہیں ۔ خدا کے ساتھ بھی میرا معاملہ ایسا ہی ہے ۔ کبھی کبھی لمحہ بھر کے لیے میں اس کے اتنا قریب ہو جاتا ہوں کہ میری روح خوشی سے سرشار ہو جاتی ہے اور پھر میں اس سے طویل عرصہ کے لیے جدا بھی ہو جاتا ہوں اور کڑھتا ہوں ، جلتا ہوں ، سسکتا ہوں ، لیکن لمحہ بھر کا وصال یا وصال کی تمنا کی لذت کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات اور محبت کا کھلا اعلان مومن کی پہلی شرط ہے ۔ لیکن میں مومن نہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اس کے تعلقات کی کسی دوسرے کو خبر نہ ہو ۔ اُس عشق کی طرح جسے عاشق معشوق دونوں دوسروں سے چھپاتے ہیں ۔ محفل میں اجنبی بھی ہوتے ہیں اور چشم و ابرو سے ایک دوسرے کی دل دہی بھی کر رہے ہوتے ہیں ۔ کہتے ہیں

مہابھارت کے خاتمہ پر جب کرشن دوارکا جانے لگے، تو انہوں نے مہارانی کنتی سے کہا کہ وہ کوئی ور مانگیں۔

کنتی نے پوچھا...... ''مہاراج واپس کب آئیں گے''

کرشن نے جواب دیا...... ''جب تم دکھ میں ہوگی''

مہارانی کنتی نے ور مانگا...... ''میں ہمیشہ دکھ میں رہوں''

میں بھی اکثر دعا مانگتا ہوں کہ اے خدا میری روح کی بے چینی کو برقرار رکھ کہ اس اضطراب کے سارے دروازے اُس اسرار کی طرف کھلتے ہیں جسے میں دیکھنا اور جاننا چاہتا ہوں۔

○

گورنمنٹ کالج اصغر مال میں فسٹ ائیر میں جب میں نے دو مہینے کی فیس کھالی اور میرا نام کالج سے خارج ہوگیا تو میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ میں کبھی اپنی تعلیم مکمل کر سکوں گا۔ ملازمت شروع ہوگئی تو اس کا رہا سہا امکان بھی جاتا رہا لیکن امی کو یقین تھا کہ میں ایک دن اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کروں گا۔ وہ اپنا خواب سناتیں تو مجھے ہنسی آجاتی۔ غلام رسول طارق نے مجھے اس راہ پر لگایا ان کے ساتھ مل کر میں نے ادیب فاضل، ایف اے اور پھر بی اے کیا۔ ایم اے امی کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے یہی سمجھا کہ چلو کام مکمل ہوا۔ پی ایچ ڈی کا خیال اور ترغیب وزیر آغا نے دی۔ انہوں نے مجھے اور مشتاق قمر کو کہا کہ ہم دونوں کو پی ایچ ڈی کرنا چاہیے۔ آغا صاحب لاہور آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں ان سے ملنے وہاں گئے تھے۔ اُس زمانے میں وہ فلیٹیز میں ٹھہرتے تھے۔ رات کو گفتگو ہوئی۔ صبح وہ ہم دونوں کو اورینٹل کالج لے گئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اُس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ بات ہوئی، موضوع طے ہوئے اور ہم نے لاہور ہی میں رہ کر دو تین دن میں خاکے بنائے اور وحید قریشی صاحب کو دے آئے۔ بات آئی گئی ہوگی۔ ایک دن اچانک یونیورسٹی کا خط آیا کہ رجسٹریشن فیس جمع کرائیں۔

لیکن کام شروع نہ ہو سکا۔ دو ایک بار کوشش بھی کی لیکن اندازہ ہوا کہ یہ موضوع مناسب حال نہیں، اس میں انگریزی کا خاصا کام تھا اور انگریزی سے میری جان جاتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر اُس وقت میں میرا جی کا انتخاب کر لیتا تو بہتر تھا۔ میرا جی سے ایک ذہنی مطابقت تھی۔ مشتاق قمر کے لیے اسالیب بیاں والا موضوع مناسب رہتا کہ وہ انگریزی کا استاد تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ نہ مشتاق قمر نے کام شروع کیا نہ میں نے۔ ہم دونوں کے گائیڈ وزیر آغا تھے۔ انہوں نے کئی بار یاد دہانی کرائی لیکن ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ بات ختم ہو گئی۔ ایک عرصہ بعد خواجہ زکریا صدر شعبہ ہوئے۔ ایک دن میں اور اعجاز راہی ایک محفل میں اُن کے پاس بیٹھے تھے کہ پی ایچ ڈی کی بات شروع ہو گئی۔ کہنے لگے...... ''تم کیوں نہیں کرتے''۔

میں نے کہا...... ''میرا جی پر کام کرنا چاہتا ہوں''۔

بولے...... ''وہ تو فتح محمد ملک کر رہے ہیں''۔

اتفاق سے فتح ملک بھی اسی محفل میں تھے۔ ہماری بات سن کر کہنے لگے...... ''میں تو جرمنی جا رہا ہوں اس لیے میرے لیے کام کرنا مشکل ہے''۔

خواجہ زکریا نے کہا...... ''بہر حال اب تو یہ موضوع آپ کو الاٹ ہو چکا ہے''۔

دو تین دن بعد ملک نے ایک لفافہ مجھے بھجوایا۔ کھولا تو اس میں وائس چانسلر کے نام درخواست کی فوٹو کاپی تھی جس میں انہوں نے وائس چانسلر کو لکھا تھا کہ وہ جرمنی جا رہے ہیں اس لیے موضوع پر کام نہیں کر سکیں گے اس لیے یہ موضوع کسی اور کو دے دیا جائے۔ ساتھ ہی ایک چٹ میرے نام تھی کہ فوراً خواجہ زکریا سے ملوں۔ میں نے پھر ایک ماہ کی تاخیر کر دی۔ اس دوران ملک صاحب جرمنی روانہ ہو گئے لیکن جاتے جاتے بھی یہی تاکید کر تے گئے کہ فوراً خواجہ زکریا سے رابطہ کروں بلکہ زکیہ بھابھی کو بھی کہہ گئے کہ مجھے یاد کراتی رہیں۔ خواجہ صاحب

فائل ملی تو میری باچھیں کھل اٹھیں۔ جلدی جلدی شمارہ نکالا۔ فہرست میں مضمون موجود تھا۔ جوں ہی میں نے متعلقہ صفحات نکالے تو مجھ پر تو اوس پڑ گئی۔ صفحات کٹے ہوئے تھے۔ انتہائی مایوسی میں ہم اوپر آئے۔

خاتون ہمارے اترے ہوئے چہروں کو دیکھ کر بولی...... ''کیا ہوا؟''۔

میں نے کہا...... ''فائل تو مل گئی تھی اور متعلقہ پرچہ بھی موجود ہے لیکن جو مضمون مجھے چاہیے تھا وہ کسی نے وہاں سے کاٹ لیا ہے''۔

خاتون کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... ''الو کی پٹھی''

میں نے بھی اسی بے ساختگی سے کہا...... ''شیما مجید''

وہ حیران رہ گئی، بولی...... ''آپ کو کیسے معلوم؟''

میں نے کہا...... ''مجھے اندازہ تھا۔ اُس نے ایک آدھ جگہ اور بھی یہی کام کیا ہے''۔

اس پر خاتون نے بتایا کہ شیما مجید اس معاملے میں اتنی بدنام ہو چکی ہے کہ لاہور کی کئی لائبریریوں میں اُس کا داخلہ بند ہے۔

○

وقت ایک سیل تند ہے جو ہمیں تنکوں کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے اور پھر آخر آخر فنا کے سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ ہر احساس سے عاری ہے۔ ایک ایسا تندخو شخص جس کی نہ آنکھیں ہیں نہ کان۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز کلہاڑا ہے جس سے وہ ہر شے کو توڑ پھوڑ رہا ہے۔ اس کا کام ہر شے کو برباد کر کے فنا کرنا ہے۔ ہم اس کی گود میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے ہاتھوں ختم ہو جاتے ہیں۔ وقت کا یہ جبر کیا ہے؟ مکاں بھی ایک مستقل قید ہے، کیا ان دونوں سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہے۔ تخیل ایک ایسی نعمت ہے جو ہمیں وقتی طور پر وقت کی قید سے آزاد کرا دیتی ہے۔ ہم تصور ہی میں سہی، کچھ دیر کے لیے وقت کے زنداں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

پل بھر کھلی فضا میں پنکھ پھیلاتے ہیں، اڑان بھرتے ہیں اور پھر اسی زنداں میں آن گرتے ہیں۔
تخیل میں آدمی وقت کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ جست بھر میں ماضی اور اگلی جست میں
مستقبل کے ایوانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن مکان کی قید سے تو مفر نہیں۔ تخیل میں وقت کی
اُڑانیں بھرتے ہوئے بھی جسمانی طور پر ہم مکان کی قید میں ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد
بھی جسم تو زمین کے اندر ہی ہوتا ہے اور جب مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتا ہے تو تب بھی مکان ہی کی
گرفت میں رہتا ہے۔ رہ گئی روح تو وہ جہاں بھی جاتی ہے وہاں بھی مکان ہی ہے۔ زمان بھی
ہے لیکن شاید اس کا تصور اور تعریف مختلف ہو۔ عام معنوں میں تو ہمارا زماں نظامِ شمسی کے تابع
ہے۔ کرۂ ارض سے باہر خلا میں اس کی صورت مختلف ہوگئی۔ جسمانی سطح پر زمان کے معنی اور ہیں
اس کی کیفیات بھی دوسری ہیں۔ ذہنی سطح پر زمان کے معنی الگ ہیں اور اس کی صورتیں بھی الگ۔
زمان کے کئی منطقے ہیں جن میں بعض اوقات ہم بیک وقت جی رہے ہوتے ہیں۔

''وقت کو برا نہ کہو وقت خود خدا ہے'' سے تو یہی معنی اخذ ہوتے ہیں کہ خدا وقت سے
ماورا ہے۔ چھٹی صدی قبل از مسیح کے ایک فلسفی نے حرکت کو کائنات کا بنیادی محرک قرار دیا تھا۔
ارسطو اس نقطۂ نظر سے تو اتفاق کرتا ہے لیکن وہ حرکت کو ایک متحرک اولیٰ یعنی خدا کا سبب قرار دیتا
ہے۔ افلاطون اپنے اعیان نامشہود کے فلسفے میں کائنات کو اصل کی نقل کہتا ہے۔ میں نے اپنے
کئی افسانوں میں یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ ہم اصل کی فوٹو کاپی ہیں۔ علامہ اقبال بھی مادی عالم کو
حیات سرمدی کی پیداوار کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مادی دنیا کی اپنی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ وہ
صرف زندگی کا ایک مظہر ہے اسی طرح زمان ومکان کی بھی کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے۔
قرۃ العین طاہرہ نے اپنے انٹرویو میں مجھ سے پوچھا کہ ''میرا تصورِ وقت کیا ہے''۔ میں نے کہا:
''میرے یہاں وقت کا تصور ماضی حال یا مستقبل کے کسی ایک نقطے تک محدود
نہیں۔ میں ماضی کو حال کے لمحۂ موجود سے ملا کر مستقبل کی طرف سفر کرتے ہوئے وقت کی قید

سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ دریا میرے یہاں ایک خاص استعارہ ہے جو بہتے ہوئے وقت کی تصویر بناتا ہے۔ اس میں ماضی حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس وقت کا تصور زمانی تقسیم کے بغیر ہے۔ ماضی حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اصل اہمیت وہ جست ہے جو لمحہ موجود کو پھیلا کر وقت کا تسلسل بنا دیتی ہے۔ وہ تسلسل جو وقت کو زمانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔

میرے افسانے ''لمحہ جو صدیاں ہوا'' کا کردار یوں کہتا ہے۔

''شیخ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز پراسرار تبسم ابھرا...... بولے'' وقت ایک دریا کی مانند ہے جس کی لہروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر چہ دیکھنے میں وہ الگ الگ نظر آتی ہیں۔ ماضی کی گود سے حال، حال کی گود سے مستقبل اور مستقبل کی گود سے پھر ماضی طلوع ہوتا ہے۔ ایک دائرہ جس کا ایک مرکز ہے اور اس مرکزہ کی کوئی زبان نہیں اور نہ کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے''

ایک ہی لمحہ میں کئی جہانوں میں رہنے کی اذیت و لذت میرے تصورِ وقت کا ایک اہم پہلو ہے۔ ایک ہی لمحہ میں بیک وقت کئی حقیقتوں کی آگاہی کے نتیجے میں میرے تخلیقی عمل میں تہہ داری پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے میرے اظہار میں بھی تہہ داری آئی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی اپنے ایک مضمون میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''تہہ دار شعور تضادات اور تقابل کے علاوہ بے یقینی کی صورت میں بھی ظاہر ہوا ہے۔ یہ بے یقینی، عمل اور بے عملی کے درمیان لٹکتے رہنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بیک وقت دو انتہاؤں کی کھینچا تانی بھی تہہ دار شعور کو جنم دیتی ہے''۔

لمحہ موجود میں مختلف طرح کے احساسات اور کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش نے وقت کو ایک گزراں لمحہ بنا دیا ہے۔ یوں وقت زمانے کی قید سے آزاد ہو کر صرف وقت رہ جاتا ہے۔ یہ مختلف احساسات کی درمیانی حدوں کو توڑنے، ان میں یکجائی پیدا کرنے اور لمحہ میں ابدیت کا عکس دیکھنے، زمانے کی قید سے آزاد وقت میں زندہ رہنے اور مختلف زمانوں کے

واقعات وتجربات کو بیک وقت سوچنے محسوس کرنے اور اپنے آپ پر طاری کر کے ایک نئی فضا پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ چنانچہ میرے پاس وقت کا تصور کسی زمانی قید تک محدود نہیں بلکہ ایک ہی لمحہ میں کئی لمحوں کی بازیافت ہے جہاں وقت زمانے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے آئن سٹائن مکان کو حقیقی مگر دیکھنے والے کو دیکھے جانے کی جگہ کے حوالے سے اضافی تصور کرتا ہے۔ منووسکی اس کی شرح یوں کرتا ہے کہ زمان ومکان اپنی جداگانہ حیثیتوں میں تو محض پرچھائیاں بن کر رہ گئے ہیں البتہ ان دونوں کا کسی قسم کا اختلاط ہی کچھ حقیقت کا حامل ہے''۔

زمان کا مستقل کی طرف بہاؤ علت ومعلول کے رشتہ کی جان ہے لیکن نظریہ اضافیت کی رُو سے زمانہ کا مستقبل کی طرف بہاؤ سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہرحال ایک بات تو واضح ہے کہ کائنات ایک خاص وقت پر شروع ہوئی ہے لیکن سٹیفن ہاکنگ کے نزدیک کائنات کی ابتدا سے قبل وقت کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سینٹ آگسٹن کے خیال میں بھی وقت خدا کی صفت ہے اور ابتدائے کائنات سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ آئن سٹائن کے نزدیک زمان تو حتمی ہے مکان حتمی نہیں۔ اس لیے مشاہدے کے نتائج مختلف افراد میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ وقت کے بارے میں یہ غور وفکر تو جاری ہے کہ بہرحال چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ہم وقت کے دھارے میں تنکوں کی صورت بہے جا رہے ہیں۔ ایک ازلی وابدی سمندر کی طرف جو جانے مکمل فنا ہے یا بقا کی کوئی نئی صورت۔

O

زمان مکاں کے اندر پہلے سے موجود تھا یا مکاں کے وجود میں آنے کے بعد اس پر مسلط ہوا ہے یعنی کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے وقت کا کیا تصور تھا، اور وقت اُس لمحہ ناموجود میں نہیں تھا تو کائنات کے وجود کے بعد کہاں سے آیا۔ سینٹ آگسٹن وقت کو خدا کہتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ وقت خود خدا نہیں بلکہ خدا کی ایک صفت ہے۔ خدا اپنی ذات

کسی کو منتقل نہیں کرتا، البتہ اپنی صفات مختلف لوگوں کو عطا کر دیتا ہے۔ خدا کے ناموں کا ورد کرنے سے اکثر ان ناموں کی صفات ورد کرنے والوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، یا ان کا کچھ حصہ انھیں عطا ہو جاتا ہے، اسی طرح بعض اوقات خدا اپنی اس صفت یعنی وقت کا کچھ علم یا حصہ اپنے خاص بندوں کو عطا کر دیتا ہے، کئی مجذوب صوفیا اور پیغمبر وقت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ معراج شریف میں حضور اکرمؐ وقت کی تمام پابندیوں کو توڑ گئے تھے۔ کئی پہنچے ہوئے لوگ وقت میں سیدھا سفر کرتے ہوئے آگے پیچھے جا سکتے ہیں۔ جب باغ حسین کمال سے میری اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں۔ چند دن پہلے میں نے ایک شخص کو پانچ منٹ کا مراقبہ کرایا۔ واپس اپنی حالت میں آنے کے بعد میں نے پوچھا تم نے کیا دیکھا۔ وہ شخص مسلسل دو گھنٹے بولتا رہا، بالآخر مجھے اسے چپ کرانا پڑا۔ بظاہر وقت سیدھی لائن میں آگے کی طرف سفر کرتا ہے۔ آسانی کے لیے ہم اس کے ایک سرے کو ازل اور دوسرے کو ابد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وقت دائرہ بھی ہے۔ ایک دائرے کے اندر دوسرا اور دوسرے دائرے کے اندر تیسرا۔ خلا کے وقت اور زمینی وقت میں ایک فرق ہے۔ سائنس کے مطابق اگر دو جڑواں بھائیوں میں سے ایک کو خلا میں بھیج دیا جائے اور دوسرا زمین پر ہی رہے تو تیس سال بعد جب خلا نورد واپس آئے گا تو زمینی بھائی بوڑھا ہو چکا ہوگا اور خلا نورد اسی حالت میں ہوگا جب اس نے زمین چھوڑی تھی۔ کائنات ایک ایسا سلسلہ ہے جس کا کوئی انت نہیں اب تو اس کائنات کے آگے ایک اور کائنات کا سراغ بھی ملا ہے۔ اس کے بعد شاید کوئی اور سلسلہ بھی ہو گویا یہ سلسلہ ایک اسرار ہے جسے جاننے دیکھنے کی تمنا ہر دور میں رہی ہے۔ لیکن اس کائنات کے مماثل ایک اور کائنات بھی ہے جو ہمارا جسم ہے۔ جس طرح اس وسیع و عریض کائنات میں کوئی مقام ایسا ہے جہاں سے خدا اسے کنٹرول کر رہا ہے اس طرح ہمارے جسم کی کائنات میں ذہن ایسا مقام ہے جہاں سے پورے جسم کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی کائنات اپنے دو روپ رکھتی ہے۔ ایک اس کی حیاتیاتی

صورت اور ایک ان دیکھی فضا۔ یہ ان دیکھی فضا ایک ایسا پراسرار غار ہے جس میں اتر کر مراقبے کے عمل سے گزر کر آدمی نئے اسرار اور نئے معنوں سے آشنا ہوتا ہے۔ براہ راست اوپر اٹھنا ممکن نہیں لیکن اندر اتر کر اوپر اٹھنا ایک ریاضت ہے جو وجود میں سے ایک ہیولے کو اٹھا کر خلا میں اچھال دیتی ہے۔ نانک پورے والے گھر میں بڑے کمرے میں سنگ مرمر کا ایک چبوترہ تھا جس کے اوپر سنگ مرمر ہی کا ایک گنبد تھا جو اندر سے خالی تھا۔ شادی سے پہلے، کبھی کبھی میں خاموشی سے اس چبوترے پر بیٹھ جاتا اور آنکھیں بند کر کے اپنے اندر اترنے کی کوشش کرتا لیکن کچھ دیر بعد ہی کوئی چاپ میری آنکھ کھول دیتی۔ کچھ امی کے جاگنے کا ڈر، ان کی ڈانٹ اور کچھ جلدی جلدی سب کچھ سمیٹ لینے کی عادت نے میرے اس مراقبے کو کبھی مکمل نہ ہونے دیا۔ شادی کے بعد میں اور رخسانہ اسی ہال کمرے کے ایک کونے میں سونے لگے۔ سعدیہ ہوئی تو وہ بھی اسی کمرے میں ہمارے ساتھ تھی۔ اسے رات کو نیند نہ آتی تو میں اسے اپنے سینے پر لٹا لیتا اور اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتا رہتا۔ سو جاتی تو میں اسے چپکے سے گدے پر لٹا کر اٹھ جاتا اور چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ رخسانہ گہری نیند میں ہوتی۔ چبوترے پر آنکھیں بند کر کے بیٹھنے میں ایک مزا آتا۔ چونکہ یہ احساس ہوتا کہ پاس ہی رخسانہ اور سعدیہ موجود ہیں اس لیے ڈر جاتا رہا اور وہ پراسرار چاپ جو دراصل میرے اندر سے ابھرتی تھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے اندر کسی مرکزہ کی تلاش اور پھر اس پر توجہ مذکور کرنے کے بعد مجھے لگتا کہ میرے اوپر پھیلا ہوا گنبد دفعتاً وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا پھیلاؤ جیسے بڑھتا جاتا۔ میرے اندر کے غار کی روشنی بھی پھیلتی جاتی اور پھر یک لخت یوں محسوس ہوتا کسی نے مجھے وہاں سے اٹھا کر خلا میں اچھال دیا ہے۔ میرا جسم دور کہیں نیچے رہ گیا ہے اور میں، اس ''میں'' کا صرف احساس ہی ہوتا، اس کا وجود نہ دکھائی دیتا۔ نہ اس کا وزن محسوس ہوتا۔ تادیر یہ سلسلہ جاری رہتا کہ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ سمٹنے لگتا اور میں دوبارہ اسی چبوترے پر پہنچ جاتا۔ میرا یہ تجربہ میری کئی

کہانیوں میں ایک سیال سی صورت میں موجود ہے لیکن شاید میں اسے کوئی مربوط صورت اس لیے نہ دے پایا کہ اس کوچے کی تربیت نہ تھی، اور اپنے تجربے کو بیان کرنے کی وہ مخصوص اصطلاحیں نہ تھیں جو صوفیا استعمال کرتے تھے۔ مرشد سے جو میرے بعد کے افسانوں میں بہت تواتر سے آیا۔ میں پہلی بار یہیں آشنا ہوا۔ اُس نے جب دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تھی کہ ''اے خدا مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر'' تو میں نے تاسف سے سر ہلایا تھا ...... ''لیکن میں تو ابھی دنیا کے سمندر میں بھی نہیں اتر سکا''۔

مرشد مسکرایا تھا...... ''دنیا بھی تو وہی ہے''

میں نے پوچھا تھا...... ''اگر دنیا بھی وہی ہے تو میں الگ کیوں ہوں؟''۔

مرشد نے مسکرا کر کہا تھا ...... ''تم الگ کہاں ہو، سمندر تمہارے اندر بھی ہے اور باہر بھی''

لیکن مجھے ہمیشہ اپنے اندر ایک خلا کا احساس ہوا اور باہر سناٹا۔ اندر کی کائنات میں اتر کر میں خلا میں پہنچنے کی جستجو کرتا تھا لیکن اس کے لیے جس مراقبے اور مکاشفے کی ضرورت ہے اس کی ہمت نہ تھی۔ میرا حال یہ ہے کہ درویشی کا ظرف نہ تھا اور دنیا داری کا سلیقہ نہیں۔ سو ساری زندگی رسے پر ڈولتے گزر گئی، لیکن نامعلوم کو جاننے کا ایک ایسا چسکا ہے کہ میں کبھی ڈرتے ڈرتے، آہستہ آہستہ اور کبھی تیز تیز، بے خوف اندر کے غار میں چھلانگ لگا لیتا ہوں۔ کبھی کچھ ہاتھ آتا کبھی خالی ہاتھ ہی لوٹنا پڑتا ہے لیکن سفر کی اپنی ایک لذت تو ہے ہی۔ کبھی کبھی چھپ چھپ کر سب سے چوری چوری نماز پڑھنے اور اُس کے نام کا چپکے چپکے، اندر ہی اندر ورد کرنے کا بھی اپنا ایک مزا ہے۔ اُس عشق کی طرح جسے چھپانے کا لطف ہوتا ہے۔ عشق کی تشہیر بھی ایک مزا رکھتی ہے اور اس کا اخفا بھی اپنی ہی ایک لذت رکھتا ہے۔ اندر ہی اندر سلگنا......

عشق دانہ بھول خلاصہ چمڑی لتھ جاؤ گی

○

ایم۔اے کرنے سے پہلے میری ملازمت میں مرضی کو دخل نہ تھا۔لیکن ایم اے کرنے کے بعد میں نے بہت سوچ سمجھ کر تدریس کا شعبہ اختیار کیا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی نوکریوں کا کال نہیں پڑا تھا اور تھوڑی سی کوشش سے ملازمت مل ہی جاتی تھی۔ابھی میں نے ایم۔اے کا امتحان دیا ہی تھا کہ میں سی بی سکول گوالمنڈی میں آگیا۔ایم اے کرنے کے بعد میں نے تین چار جگہ درخواست دی۔اتفاق سے سبھی جگہوں سے کال آ گئی۔میں نے تدریس کو اولیت دی اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔میں جس وقت لیکچرار بنا اُس وقت اس عہدے کی تنخواہ تین سو پچاس روپے تھی۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی گریڈ ہوں گے اور ترقی ملے گی۔میں لیکچرر کی حیثیت سے اس شعبہ میں داخل ہوا تھا اور پروفیسر بن کر ریٹائر ہوا۔تدریس کے شعبے میں ایک کمال کی بات یہ ہے کہ اس میں بیوروکریسی نہیں۔پرنسپل سے تعلق ایک ساتھی کا سا ہوتا ہے، کسی افسر کا نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ سول سروس میں اختیار کا جو تکبر ہے وہ اس شعبے میں نہیں۔میں چونکہ درویشانہ مزاج رکھتا ہوں اور یہ مزاج مجھے والد کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے اس لیے میں بہت سکون سے اس شعبہ میں رہا۔یہاں وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن میں درویشی ہو۔چند لوگ جو غلطی سے ایسے آجاتے ہیں جن کا یہ مزاج نہیں ہوتا وہ یا تو جلدی یہاں سے نکل جاتے ہیں یا پھر ساری زندگی کڑھتے رہتے ہیں۔

تدریس ایک حوالے سے بہت مشکل شعبہ ہے۔دفتر میں آپ حکم جاری کر کے ماتحتوں سے کام کرواتے ہیں۔یہاں آپ کو اپنے شاگردوں سے ایک فاصلہ بھی رکھنا ہوتا ہے اور ان سے قریب تر بھی ہونا پڑتا ہے۔پھر طالب علموں میں ہر مزاج اور ہر رنگ کے بچے ہوتے ہیں، ان کی نفسیات کو سمجھنا اور ان کی سطح پر آکر ان کو سمجھانا ہی تدریس ہے۔میں جب نیا نیا لیکچرر بنا تو ہمارے پرنسپل چودھری محمد حسین نے ایک دن مجھے بلایا۔پہلے چائے پلائی پھر بولے......

"کسی استاد کا بہت زیادہ صاحبِ علم ہونا اُس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک وہ طلبا کی سطح

پر آ گران کو مطمئن نہ کر سکے''۔ خرابی یہ ہے ہمارے تعلیمی اداروں میں ترقی کا معیار سنیارٹی اور اے سی آر یں ہے۔ اگر قطار میں گدھا پہلے اور گھوڑا دوسرے نمبر پر ہے تو پہلے گدھا ترقی پائے گا پھر گھوڑے کا نمبر آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر استاد ساری زندگی کچھ نہیں پڑھتے۔ انہوں نے ایم اے کے زمانے میں جو آخری کتاب پڑھی ہوتی ہے وہ ہمیشہ آخری ہی رہتی ہے۔ ایک زمانے میں اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز ہوتے تھے، اب ختم ہو گئے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس شخص نے اسسٹنٹ کی تیار کی ہوئی فائل پر صرف چھوٹے دستخط کرنا ہوتے ہیں اسے تو ہم دنیا بھر کی ٹریننگ کراتے ہیں اور جس کے پاس آنی والی نسلوں کی تربیت ہے اسے ہم ایک بار بھرتی کرنے کے بعد بھول جاتے ہیں۔

استاد کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ سال بھر یا دو سال تک وہ جن طلبا پر محنت کرتا ہے ان کے مزاج کو سمجھتا ہے، وہ اگلے سیشن میں کہیں اور چلے جاتے ہیں اور نئے لوگ آ جاتے ہیں۔ تعلیمی اداورں کو سیاسی جماعتوں نے خراب کیا ہے ان کی پروردہ یونینوں نے سارے ماحول کو بگاڑا ہے، افسوس کہ ہماری ان جماعتوں کو آج تک یہ احساس نہیں ہو سکا کہ وہ کتنے بڑے قومی جرم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے آنے سے پہلے پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا ماحول بہت اچھا تھا لیکن اساتذہ کی حالت خراب تھی کہ انہیں بہت کم معاوضہ ملتا تھا۔ قومیانے کی سکیم اس لحاظ سے تو بہت اچھی تھی کہ ایک طرف تو اساتذہ کو تحفظ حاصل ہو جائے اور دوسری طرف حکومت اخراجات برداشت کر کے والدین کے تعلیمی اخراجات میں کمی کر دے لیکن اس کا اثر منفی ہوا اساتذہ سرکاری ملازمت میں آئے تو انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ کسی استاد کی زیادہ سے زیادہ سزا یہی ہو سکتی ہے کہ اسے ٹرانسفر کر دیا جائے، دوسری خرابی یہ ہوئی کہ پروفیشنل کالجوں میں داخلے کا معیار نمبر قرار پایا چنانچہ نمبروں کے حصول کے لیے مختصر ترین راستے تلاش کیے گئے اور ذہانت کی بجائے یادداشت اہم ہو گئی۔

ہمارے زمانے میں استاد کتاب تک محدود نہیں رہتا تھا کہ وہ نمبروں سے زیادہ اپنے شاگرد کو ذہنی طور پر بہتر دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے ایک استاد پروفیسر نذیر تھے وہ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہمارے کورس میں میکبیتھ شامل تھا۔ کلاس میں ساٹھ ستر لڑکے ہوتے۔ وہ جب لیڈی میکبیتھ کے ہاتھ پر لگے لہو کا ذکر کرتے تو ہاتھ پھیلا دیتے، ایسا سماں ہوتا کہ کلاس میں سوئی گرنے کی بھی آواز آتی۔ شکسپیئر سے وہ وارث شاہ پر آجاتے اور کئی کئی دن ہیر کی گتھیاں سلجھاتے رہتے۔ کوئی اعتراض نہ کرتا بلکہ ذوق شوق سے انہیں سنتا۔ ہمارے استاد اصل موضوع سے اکثر ہٹ جاتے اور کئی کئی دن دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتے، اب یہ صورت ہے کہ استاد ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے سبق سے ادھر ادھر ہو تو طالب علم شکایتی نظروں سے دیکھتے ہیں، ان کی آنکھ میں صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ کیوں ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آج کا طالب علم شارٹ نوٹس چاہتا ہے جس سے اسے نمبر ملیں۔ اور نمبر ہیں بھی اہم۔ عجیب بات ہے کہ ایک نمبر کم ہونے سے داخلہ رہ جاتا ہے کیا ایک نمبر کم ہونا نالائقی کی دلیل ہے۔ خود اساتذہ کا حال یہ ہے کہ انہیں اپنے مضمون سے دلچسپی نہیں۔ ایک بار میں نے فزکس کے ایک پروفیسر سے سٹیفن ہاکنگ کے بارے میں پوچھا تو وہ میری طرف دیکھنے لگے، وہ اس نام سے ہی واقف نہ تھے۔

پروفیسر نذیر کمال کے آدمی تھے۔ کلاس کے بعد وہ ہمارے دوست تھے۔ بی اے کرنے کے طویل عرصہ بعد میری ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ ریٹائرمنٹ لے کر سیاست میں آ گئے تھے۔ ۷۷ء کے مارشل لا سے ذرا پہلے پیپلز پارٹی راولپنڈی کے صدر ہو گئے۔ ملے تو میں نے کہا...... ''سر یہ آپ کس بکھیڑے میں پڑ گئے ہیں'' بولے ...... ''میرا ایک مشن ہے، میں پارٹی کو گندے لوگوں سے پاک کر دوں گا'' مارشل لا لگا تو جیل چلے گئے۔ پارٹی سے گندے لوگوں کو کیا نکالتے خود ہی نکل گئے۔ ایک عرصہ بعد ملے تو کہنے لگے...... ''تم ٹھیک کہتے تھے''۔

ہمارے تعلیمی معیار کے گرنے کا ایک سبب اساتذہ بھی ہیں، جواب ''پیغمبرانہ پیشہ''

میں کاروبار کر رہے ہیں۔ پرائیویٹ ٹیوشن سرطان کی طرح تعلیمی معیار کو کھائے جا رہی ہے۔ دنیا بھر میں لوگ سب سے پہلے تعلیم سے وابستہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر میں بحالت مجبوری فوج میں آتے ہیں، ہمارے یہاں الٹ ہے، یہاں سب سے پہلے فوج ہے اور سب سے آخر تعلیمی شعبہ۔ فوج میں دلکشی یہ کہ ایف اے کر کے افسر بن جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صدر پاکستان ہو جائیں۔ تعلیم کے شعبہ میں کیا رکھا ہے نہ عزت نہ وقار نہ پیسہ۔ اس شعبے میں ایسے ایسے لوگ آ گئے ہیں کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اکنامکس کے ایک پروفیسر تھے کسی نے ان سے پوچھا ''یہ سرپلس تھیوری کیا ہے'' بولے ''ایک یہودی بدمعاش تھا، اسلام میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے'' اُس نے پوچھا...... ''لیکن ہے کیا'' کہنے لگے...... ''کہا نہ اسلام میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے'' یہ پروفیسر صاحب کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ سریا بیچنے کا کام کرتے تھے۔ ایک تاریخ کے استاد سے میں نے پوچھا ''تاریخی مادیت کیا ہے'' انہوں نے تمسخر سے میری طرف دیکھا بولے ''تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ، دیکھو تاریخ تو تاریخ ہوئی۔ مادے کے معنی ہوئے مادہ یعنی میٹریل تو اس کا مطلب ہوا مادے کی تاریخ''۔

اس وقت مجموعی صورت یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جہاں کوئی علمی ماحول ہو، ہماری یونیورسٹیوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ عام سطح کے تدریسی ادارے یا امتحان لینے والے ادارہ بن کر رہ گئی ہے یونیورسٹی کا کام آئیڈیا پھیلانا اور ریسرچ کرانا ہوتا ہے لیکن طلبا یونینوں، سیاسی مداخلت اور اساتذہ کی نااہلی کی وجہ سے یونیورسٹیاں کالج سے بھی نچلی سطح کے ادارے بن گئی ہیں۔ مجھے اکثر یونیورسٹیوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں جا کر دم گھٹتا ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں مجھے بڑا مختلف تجربہ ہوا، میں اور فتح محمد ملک پی ایچ ڈی کے ایک زبانی امتحان کے لیے گزشتہ دنوں وہاں گئے۔ ایک تو وہاں کے ماحول میں ایک کھلی فضا کا احساس ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی طلبا تنظیم نہیں۔ دوسری خوشگوار بات یہ دیکھنے میں آئی کہ

اساتذہ میں ایک یگانگت کی فضا ہے۔شعبہ اردو کے اساتذہ تو ایسے لگے جیسے ایک خاندان کے فرد ہوں۔ڈاکٹر انوار احمد،ڈاکٹر روبینہ ترین،ڈاکٹر علمدار حسین بخاری،ڈاکٹر قاضی عابد،ڈاکٹر رؤف شیخ اور ڈاکٹر شکیلہ سے ادب وفن کے حوالے سے بڑی طویل بحثیں ہوئیں۔آس پاس کے کالجوں سے ڈاکٹر شگفتہ،عامر سہیل اور امتیاز بلوچ بھی آ گئے۔عامر سہیل اور قاضی عابد مجھے شہر دکھانے لے گئے۔بہاء الدین زکریا،شاہ رکن دین عالم اور شمس گردیزی کے مزاروں پر ایک عجب طرح کا اسرار ہے۔ان کے گنبدوں کی وسعت دیکھنے والوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔شمس گردیزی کے مزار پر ایک دلچسپ روایت سنی،کہتے ہیں کہ وہ جب یہاں آئے تو ابھی دریا کے دوسری طرف ہی تھے کہ بہاء الدین زکریا نے انہیں دودھ سے بھرا ایک پیالہ بھجوایا جس کا مطلب یہ تھا یہاں اب اور صوفیا کی گنجائش نہیں،پیالہ شمس گردیزی کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس میں گلاب کا پھول رکھ کر واپس کر دیا،مطلب یہ تھا کہ میرا یہاں رہنا کسی زحمت کا سبب نہ بنے گا۔اس سفر میں ایک اور محبت کرنے والی شخصیت ملک ظفر سے ملاقات ہوئی۔یہ ڈاکٹر روبینہ ترین کے شوہر ہیں،اگرچہ بینکار ہیں لیکن ادب اور تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں استاد کبھی ریٹائر نہیں ہوتا وہ تو ایک درخت کی طرح ہے کہ جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے چھاؤں گھنی ہوتی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک میں استاد اور سائنسدان دونوں ہی ریٹائر ہو جاتے ہیں۔

O

واہ کے دنوں کی بات ہے۔ایک بار فیکٹری کے چیئرمین کالج کے معائنہ کے لئے آئے ان کے ساتھ ان کے پی آر او مشہور شاعر،راز مراد آبادی بھی تھے۔جرنیل نے کلاسوں کا معائنہ کیا۔میری کلاس میں آئے تو میں اُس وقت میر پڑھا رہا تھا۔جرنیل چند لمحے کلاس میں کھڑے رہے پھر بولے ''آپ اردو میں پڑھا رہے ہیں''۔

میں نے کہا ''اردو تو اردو ہی میں پڑھائی جائے گی''

چند لمحوں تک تو انہیں میری بات سمجھ نہ آئی پھر دفعتاً مڑے اور سارا پروگرام ختم کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن راز مراد آبادی نے پرنسپل کو جرنیل کی ناخوشی (displeasure) پہنچائی۔

پرنسپل محمد حسین چودھری تھے۔ کاکا ان کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے دیکھ کر بولے...... ''کاکا مروادیانا''

میں نے کہا...... ''میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی''

بولے...... ''کاکا ان کی عقل اتنی ہی ہوتی ہے، چپ ہی رہتے تو بہتر تھا''

۱۹۷۷ء کے بعد اکثر اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے کہ اب ہمارے کالج آرمی ایجوکیشن کور کے تحت آ گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ سے دو ایک سال پہلے کی بات ہے۔ اسی طرح کے ایک صاحب کالج کا معائنہ کرنے آئے۔ سٹاف روم میں میٹنگ ہوئی فرمانے لگے میں چاہتا ہوں کہ تمام پاکستان کے کالجوں کا ایک ٹائم ورک ہو، کراچی میں ایک وقت میں جو پڑھایا جا رہا ہو اسی وقت راولپنڈی میں لفظ لفظ وہی پڑھایا جائے۔ کسی نے کہا...... ''جناب یہ کالج ہے سکول نہیں''

چند لمحے خاموش رہے پھر بولے...... ''پھر بھی کچھ ہونا چاہیے'' ایک اور بات کی، پوچھا...... ''اس کالج میں کتنی شفٹیں ہیں'' بتایا گیا...... ''دو'' بولے...... ''طریقہ کار کیا ہے'' بتایا گیا کہ میرٹ لسٹ بنتی ہے۔ اوپر والے پہلی شفٹ میں اور پھر دوسری شفٹ......''

نفی میں سر ہلایا کہنے لگے...... ''یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ یوں کریں کہ تمام نام ایک جگہ جمع کریں۔ ان کی پرچیاں بنائیں اور قرعہ اندازی کریں، ایک پہلی شفٹ، دوسرا دوسری شفٹ، پرنسپل میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، میرے کان میں بولے...... ''اور اس کے بعد لوگوں سے ڈنڈے کھائیں''۔

○

میری شام کی نشستوں کا آغاز ووگیز سے ہوا تھا، ووگیز ختم ہوا تو ہم لوگ شالیمار میں چلے آئے۔ شالیمار کے بالکل ساتھ شراب کی دکان ''خان برادرز'' تھی، شام کو یہاں ایک میلہ سا لگا رہتا۔ دکان اور دوسری طرف جی پی او کی لمبی دیوار، آگے گلی بند تھی اس لیے اکثر پینے والے یہیں ٹھکانہ کرتے تھے، دیوار پر پلاسٹک کے گلاس پڑے رہتے تھے، پاس ہی نل تھا اور دکان سے باہر روزانہ شام کو دال سویاں بیچنے والا بھی آجاتا تھا، چنانچہ یہ گلی بے گھروں کا مے خانہ تھی، اُس زمانے میں آٹھ روپے کا ادھا ملتا تھا اور بئیر پانچ روپے نو آنے میں، کبھی کبھار بئیر کی بوتلیں لے کر گلی میں کھڑے ہو جاتے۔ شالیمار ادیبوں اور صحافیوں دونوں کا ٹھکانہ تھا۔ اُس زمانے میں صحافیوں کی الگ منڈلی ابھی قائم نہ ہوئی تھی۔ نوائے وقت اور پاکستان ٹائمز کے دفاتر تو صدر میں تھے۔ جنگ کا دفتر گوالمنڈی میں، اس لیے ڈیوٹی ختم کر کے اکثر صحافی شالیمار آجاتے۔ جنگ کے دفتر میں شورش ملک کے کمرے میں اکثر رات کو محفل جمتی۔ آنے والوں میں فتح محمد ملک، زاہد ملک اور کبھی کبھار ڈاکٹر صفدر محمود شامل تھے۔ تین ملکوں اور صفدر محمود کا گروپ تو خاصا مشہور تھا۔ ایک نوجوان شخص بھی تھا۔ جو آ کر خاموشی سے بیٹھ جاتا۔ شورش ملک کے سگریٹ ختم ہوتے تو وہ اس نوجوان کو پیسے دے کر سگریٹ لانے کو کہتے۔ نوجوان دوڑتا ہوا نیچے جاتا اور پھولی ہوئی سانس سے سگریٹ کی ڈبی لے کر واپس آتا، شورش ملک ڈبی لیتے ہوئے کچھ انتظار کرتے پھر کہتے...... ''او شیخے آنہ مار گیاں آں'' شیخا بتیسی نکال کر کھی کھی کرتا۔ اس محفل میں ادب تو کم لیکن سیاست پر زیادہ گفتگو ہوتی اس زمانے میں وہاں افضل پرویز اور نسیم عادل وغیرہ بھی تھے۔

صحافیوں کی ایک محفل جس میں کچھ ادیب بھی شامل تھے شہر میں ٹکر ہوٹل پر بھی لگتی تھی، لیکن بنیادی یا بڑی محفل شالیمار میں جمتی جہاں تقریباً سارے لوگ باقاعدگی سے آتے یہ سلسلہ جاری تھا کہ کنٹونمنٹ بورڈ نے اس سارے بلاک کو گرا کر وہاں پلازا بنانے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ

شالیمار بھی اجڑ گیا، اب تک سارے لکھنے والے ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے لیکن شالیمار بند ہونے کے بعد دو گروپ بن گئے، میں، ایوب میرزا، احمد داؤد، حسن عباس رضا ڈیلائٹ میں بیٹھنے لگے۔ جلیل عالی، یوسف حسن، شفیع ضامن، احمد جاوید، آصف ڈار وغیرہ داتا میں چلے گئے۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ رہا۔ احمد داؤد نے ایوب میرزا سے بدتمیزی کی تو میں اور ایوب میرزا وہاں سے نکل کر داتا میں آ گئے۔ کچھ دن تو اجنبیت سی رہی پھر ہم لوگ ان میں گھل مل گئے۔ اس زمانے میں حلقہ ارباب غالب کے اجلاس بھی داتا ریسٹورنٹ کی گیلری میں ہوتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ محسن عثمانی اور فاروق عادل بھی باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ محسن کالج میں ہمارا شاگرد تھا، اگرچہ میری کلاس میں تو نہیں تھا لیکن لکھنے کے حوالے سے وہ اکثر ہمارے کمرے میں آ بیٹھتا۔ اُس زمانے میں اُس نے افسانہ نگاری شروع ہی کی تھی۔ نوجوانوں کا ایک گروپ شہر میں بھی بیٹھتا تھا۔ ان میں اشرف سلیم، داؤد رضوان، سعید احمد، جوہر حیات اور جہانگیر عمران وغیرہ شامل تھے۔ یہ لوگ دوسرے تیسرے دن داتا میں بھی آ جاتے تھے۔ طے ہوا کہ سب ایک ہی جگہ بیٹھا کریں چنانچہ ہم سب لوگ وہاں سے نکل کر شمع میں آ گئے جو موتی محل چوک میں واقع تھا۔ اس زمانے میں ابھی فلائنگ کوچوں کے اڈے یہاں نہیں بنے تھے، صرف ایک آدھ اڈہ ہی تھا اس لیے شمع کے خاموش ماحول میں ہماری نشستوں میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہ تھا۔ حلقہ ارباب غالب کے اجلاس پریس کلب میں ہونے لگے، حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس بھی نیشنل سنٹر میں ہوتے تھے جو صدر سے منتقل ہو کر موتی محل پلازا میں آ گیا تھا، یوں ہماری ادبی سرگرمیوں کا مرکز صدر سے منتقل ہو کر شہر میں آ گیا۔ شمع کی محفلوں میں آہستہ آہستہ کچھ اور دوست بھی شامل ہو گئے یہ امجد طفیل اور اختر عثمان بھی تھے۔

امجد طفیل بھی لاہور سے ملازمت کے سلسلے میں پنڈی آیا اور دس سال سے زیادہ یہاں رہا۔ اس دوران شام کو اس سے باقاعدہ ملاقات ہوتی۔ دو سال اس نے حلقہ کو بھی چلایا،

یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی حلقہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ امجد بنیادی طور پر تو افسانہ نگار ہے لیکن تنقید بھی لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے۔ پڑھنے کا رسیا ہے، اس سے نئی نئی کتابوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اس کے لاہور واپس جانے سے شام کی نشستوں کا ایک اچھا ساتھی کم ہو گیا۔

اختر عثمان ایک ہونہار شاعر ہے اردو کے علاوہ فارسی زبان و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے۔

جہانگیر عمران نے عرصہ تک حلقہ ارباب غالب کو سنبھالا اور حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیاں بھی اس کی کوششوں سے قائم ہیں۔ سعید احمد اور داؤد رضوان اچھے شاعر ہیں اور ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نظم کی جو نئی روایت بن رہی ہے اس میں ان دونوں کے علاوہ علی محمد فرشی بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں، ان دنوں ''علینہ'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔
اشرف سلیم اُس زمانے میں صرف ملازمت ہی کرتا تھا، میں نے اُسے دستاویز کا ڈیکلریشن دیا۔ یہ پرچہ میری بیوی کے نام تھا لیکن ہم اس کی ڈمیاں ہی نکال رہے تھے۔ اشرف سلیم نے اس کے دو تین شمارے شائع کیے تو ایک سلسلہ چل نکلا جو بعد میں دستاویز مطبوعات کی صورت اختیار کر گیا۔

دستاویز کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ سب سے پہلے اس کا ڈیکلریشن عزیز الرحمٰن کے نام سے لیا گیا۔ مظہر الاسلام اس کا ایڈیٹر اور میں، منشا اور اعجاز راہی اس کی مجلس عاملہ میں شامل تھے۔ اسے دستاویز کا پہلا دور کہہ لیجیے۔ تین چار شماروں کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، لیکن یہ تینوں شمارے بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ مظہر الاسلام نے تو شہاب صاحب اور مفتی جی سے معافی مانگ لی، ہماری لڑائی بڑے عرصہ تک جاری رہی، دوسری بار میں نے ڈیکلیریشن کے بغیر کتابی شکل میں نکالا۔ اس بار میرے ساتھ احمد جاوید اور ابرار احمد تھے۔ اس بار دو شمارے نکلے ضخیم اور وقیع

تھے۔ ان میں کوئی اختلافی بات نہ تھی، دستاویز کا تیسرا دور پھر ڈیکلریشن سے شروع ہوا۔ اس بار میں نے رخسانہ کے نام سے ڈیکلیریشن لیا۔ اشرف سلیم نے غالباً اس کے نو یا دس شمارے نکالے اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اشرف سلیم کے مرتب کیے ہوئے پرچوں میں سے مجید امجد نمبر خاصے کی چیز ہے۔

○

نامعلوم کو جاننے کی جستجو بھی ایک عجب سفر ہے، کبھی لگتا ہے لق و دق صحرا میں چلے جا رہے ہیں اور سوائے ریت کے کچھ نہیں، بند مٹھیوں میں پھسلتی ریت، رائیگاں ہی رائیگاں، کبھی یوں بھی ہوتا کہ ایک تنگ گپھا میں رینگ رینگ کر نکلنے کے بعد سرمئی دھند میں لپٹا ایک منظر، جس کی پرت پرت آہستہ آہستہ کھلنے لگتی ہے۔ یقین اور بے یقینی کی فضاؤں میں نامعلوم کو تلاش کرنا کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے، ایک اضطراب جو زندگی کی علامت ہے، جستجو کے لیے مہمیز کا کام دیتا۔ کہتے ہیں کہ کوئی درویش یہ دعا مانگتا تھا کہ اے خدا مجھے ہمیشہ مضطرب رکھ، کسی نے کہا تو عجب شخص ہے، لوگ خدا سے سکون مانگتے ہیں اور تو اضطرب طلب کرتا ہے۔ درویش نے جواب دیا یہ اضطراب ہی تو میرے ہونے کی دلیل ہے۔ یہ ہونے کی تمنا بھی عجب ہے۔ ان گنت لوگ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے اور مجھ ایسے اپنے ہونے کو محسوس کرنے کے لیے جلتے انگاروں پر چلتے رہتے ہیں، چمڑی ادھڑ جاتی ہے لیکن یہ ہونے کے احساس کا نشہ بھی اپنا ایک ذائقہ اور لذت رکھتا ہے۔ میں ہوں کیونکہ میں اپنے ہونے کو محسوس کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی اس ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے لگتا ہے کہ میں کیا اور میرا ہونا کیا۔ اس عظیم کائنات کی وسعتوں میں ہمارا یہ کرۂ ارض ایک ذرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس کرۂ ارض پر میں ایک جرثومے سے زیادہ اور کیا ہوں؟ لیکن یہ مجھ میں کوئی ہے جس کی پرواز کی وسعتوں میں یہ ساری کائنات ایک چھوٹا سا نقطہ ہے۔

○

توکل بھی دو دھاری تلوار ہے، منفی یوں کہ ذہنی ارتقا ہی کو روک دیتا ہے اور سفر ختم ہو جاتا ہے مثبت یوں کہ لپک ختم ہو جاتی ہے اور درویشی آ جاتی ہے لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں۔

مرشد مسکرایا...... ''زندگی خود ایک بے ترتیب کہانی ہے، ہم سارا وقت اُسے ترتیب دینے میں گزار دیتے ہیں اور تم نے سنا نہیں جب چیزوں میں ضرورت سے زیادہ ترتیب پیدا ہو جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں''۔

اور ٹوٹ کر کہاں جانا ہے، مکاں کی گرفت تو ہر جگہ ہے۔ سارا سفر ساری تگ و دو ایک نفس مطمئنہ کے لیے ہے۔

اُس نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولا...... ''بس وہ ایک نفس مطمئنہ ہے نا، وہ نہیں''

مرشد نے سر ہلایا...... ''رسے پر ڈولنے والوں کو نفسِ مطمئنہ نہیں ملتا''

اُس نے حیرت سے پوچھا...... ''رسے پر ڈولنے والے''

''ہاں''...... مرشد مسکرایا...... ''جب دنیا داری کا سلیقہ نہ ہو اور درویشی کا ظرف نہ ہو تو آدمی رسے پر ہی ڈولتا رہتا ہے''

رسے کے ایک طرف کھلکھلاتی دنیا ہے اور دوسرے سرمئی دھند، میں کئی بار اس دھند میں اترا ہوں۔ یہ کشف کا ایک انوکھا لمحہ ہے، جس کی لذت اور ذائقہ عرصہ تک سرشار رکھتا ہے۔

○

یوں تو قائداعظم کے بعد کوئی ایسا سیاسی راہنما نظر نہیں آتا جس میں بیوروکریسی اور فوج کو گرفت میں لینے کی صلاحیت ہو لیکن لیاقت علی خان نے کسی حد تک اپنا سیاسی وقار قائم رکھا

مگر وہ بھی سازش سے نہ بچ سکے اس کے بعد محلاتی سازشوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے مغلوں کی تخت نشینی کی یاد تازہ کر دی۔ بھٹو ایک ایسا شخص تھا جس کو حالات بھی ایسے ملے تھے کہ وہ جو چاہتا نئی صورت حال پیدا کر لیتا، دوسرے اس کی شخصیت میں بھی ایک وجاہت اور وقار تھا لیکن اس کے جاگیردارانہ مزاج نے بھی اُس سازشی ماحول کو زندہ رکھا۔ وہ اپنے آپ کو تاریخ کا طالب علم کہتا تھا لیکن لگتا یوں ہے کہ تاریخ تو اُس نے ضرور پڑھی تھی لیکن اس سے مناسب سبق نہیں سیکھا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی نوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے، فوجی بغاوت کی کوشش کی گئی تھی، اُس نے جمہوری عمل کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی مناسب لائحہ عمل مرتب نہیں کیا۔ ۷۳ء کے آئین اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن خود وہ اس آئین کی پاسداری نہ کر سکا۔ اُس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اُس نے عوام سے رابطہ توڑ کر کچن کیبنٹ کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ اس کچن کیبنٹ نے اُسے عوامی ردعمل سے آگاہ ہی نہیں ہونے دیا اور بروقت پی این اے سے سمجھوتے کی راہ بند کر دی۔ بھٹو ۷۷ء میں بھی بہر حال اتنا مقبول ضرور تھا کہ اگر وہ فوری طور پر دوبارہ الیکشن کا مطالبہ تسلیم کر لیتا تو اسمبلی میں عام اکثریت حاصل کر سکتا تھا، لیکن وہی ہوا جس کا نقشہ بنایا گیا تھا۔

ضیاالحق کی تو تاریخ ہی مختلف ہے۔ اردن میں قیام کے دوران اُس نے جس طرح فلسطینی عروج کو زوال سے ہمکنار کیا، اب وہ بھولی بسری داستان ہے۔ فلسطینی اُس وقت اتنی طاقت حاصل کر چکے تھے کہ چند دنوں میں اردن میں ایک جمہوریہ قائم ہونے والی تھی اور اُس کے بعد پورے عرب میں سلاطین کے تختے الٹ جاتے، اسرائیل اپنی اوقات میں آ جاتا، لیکن ایک رات کے آپریشن نے فلسطینی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ۸۰ء کی دہائی میں مجھے ایک فلسطینی نوجوان ملا جو چند دنوں کے لیے اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں اُس نے بتایا کہ یہ اُسی رات کا قصہ ہے، کس طرح

فلسطینیوں کو گھروں سے نکال کر مارا گیا، ان کے فوجی ذخیرے کو ختم کیا گیا۔ یہ داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ شاید ضیاالحق اتنا مضبوط کبھی نہ ہوتا اگر افغانستان میں جنگ شروع نہ ہو جاتی۔ کمیونزم اور اسلام کا تضاد انگریزوں نے بنایا تھا ورنہ بنیادی طور پر ان دونوں میں جتنا اشتراک ہو سکتا تھا وہ شاید کسی اور نظام میں ممکن نہ ہوتا۔ یہ دونوں سرمایہ داری اور مغربی استعمار کے خلاف ہیں لیکن انگریز نے ایک طے شدہ سازش اور پالیسی سے مسلمانوں کو کمیونزم کے خلاف لا کھڑا کیا۔ روس کے زوال سے سب سے زیادہ نقصان کس کا ہوا ہے؟۔

افغانستان کی جنگ میں پاکستان ہر حال میں نقصان ہی میں رہا۔ قیادت کی غیر مخلصی کی وجہ سے پاکستان اس جنگ سے کوئی قومی فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ اگر اُس وقت قرضے معاف کروا لیے جاتے یا پاکستان ایٹمی دھماکہ کر دیتا تو ایک آدھ ہلکی سی مذمت کے سوا کچھ نہ ہوتا لیکن ضیاالحق نے علاقائی جماعتوں کو شہ دی، مذہبی منافرت کے بیج بوئے۔ آج پاکستان جن مسائل سے دوچار ہے وہ سب ضیاالحق کے پیدا کردہ ہیں۔ ضیا دور سے پہلے شیعہ سنی فسادات کا کوئی تصور تک نہیں تھا محرم کے موقع پر کوئی چھوٹا موٹا واقعہ الگ بات ہے، مجھے یاد ہے محرم کے دنوں میں امی کھیر بانٹتی تھیں۔ دسویں محرم کو فوارا چوک میں کھڑے ہو کر محرم کے جلوس کا انتظار کرتی تھیں اور جب ذوالجناح سامنے سے گزرتا تھا تو زار و قطار روتی تھیں اس طرح کی کیفیت اکثر سنی مسلمانوں کی ہوتی تھی۔ لیکن ضیا دور میں ایجنسیوں کے ذریعے مذہبی تشدد پسند گروپ بنائے گئے۔ ایم کیو ایم بنی۔ رواداری اور برداشت کا دور ختم ہوا۔ افغانستان کی جنگ نے مہاجرین، ہیروئین اور کلاشنکوف کے دروازے کھول دیے۔

ضیا کی مجلس شوریٰ نے جسے اُس زمانے میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کہا جاتا تھا۔ پارلیمانی سطح پر منظم کرپشن کی بنیاد رکھی۔ پہلی بار بہبود فنڈ اراکین کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے۔ جونیجو نے اس سلسلے کو اور فروغ دیا، عام طور پر لوگ جونیجو کے دور کو اچھا زمانہ کہتے ہیں۔ میری

رائے میں جونیجو نے مستقبل کی سیاست کے بدترین دور کی بنیاد رکھی۔ اس شخص کا المیہ یہ تھا کہ اُس کی کوئی پارٹی نہیں تھی۔ پارٹی ڈسپلن سے بے لگام اراکین کو ساتھ ملانے کے لیے ایک ہی راستہ تھا، پیسے کا، چنانچہ اراکین اسمبلی کو ان کی قیمت ادا کی گئی۔ اراکین نے گروپ بنا لیے جنہوں نے وزیراعظم کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جونیجو کا ایک بڑا کارنامہ اکانومی میں بچت کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت کی ظاہری شکل ہے۔ اصل میں ہوا کیا کہ اُن کے اس حکم پر کہ بڑی کاریں بیچ کر چھوٹی گاڑیاں خریدی گئیں۔ اکانومی پر ایک ناقابل تلافی بوجھ پڑا۔ پرانی کاریں تو اونے پونے بیچی گئیں اور ہر افسر نے نئی کار لے لی۔ یہ ایسا ہی فیصلہ تھا جیسے محمد تغلق نے دارالحکومت کی تبدیلی کی تھی۔ جونیجو ہماری تاریخ کا محمد تغلق ہے۔ جونیجو بنیادی طور پر مٹی کا ایک مادھو تھا۔ لیکن اقتدار کا پھندنا مردے میں بھی تھوڑی سی اکڑ پیدا کر دیتا ہے۔ ضیاالحق کو یہ بھی پسند نہ آیا اور اس نے جونیجو کو چلتا کیا۔

ضیاالحق کو جس مقصد کے لیے امریکہ اور مغرب نے سپورٹ کیا تھا وہ جنگ افغانستان کے بعد ختم ہو گیا تھا چنانچہ اُسے فارغ کر دیا گیا۔ ایک حوالے سے یہ مکافاتِ عمل بھی ہے۔ بھٹو کی لاش اس کی بیوی اور بیٹی نہیں دیکھ سکی تھیں۔ ضیاالحق کا بھی صرف جبڑا ہی ملا۔ اُسے جیتے جی جہنم کی آگ کا مزا چکھنا پڑا۔ بے شک ہمارے بہت سے اعمال کا کفارہ اسی دنیا میں ادا ہو جاتا ہے۔

بے نظیر کے بارے میں بہت سے لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ حالات نے اُسے کندن بنا دیا ہے اور وہ تاریخ پر گہری نظر رکھتی ہے۔ اس کے رویے نے اس میں سے کسی بھی بات کی تائید نہیں کی۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ اسے معمولی باتوں کی بھی فہم نہیں۔ خودسری تو خیر اسے ورثے میں ملی ہے لیکن بھٹو کا ظاہری رکھ رکھاؤ اپنی جگہ تھا۔ مشہور تھا کہ ورکروں کی مجلس میں وہ تحمل سے ان کی بات سنتا تھا۔ اس کے برعکس بے نظیر تو مخالفت سننے کی تاب نہیں رکھتی۔ اختر اقبال پارٹی کے پرانے رکن ہیں اور ایسے رکن جنہوں نے اپنی ذات کے لیے رتی بھر فائدہ نہ اٹھایا۔ بھٹو دور میں

یہ نیشنل کونسل آف آرٹس میں ملازم تھے۔ مارشل لا میں وہاں سے نکالے گئے۔ جیل گئے اور پھر کسی طرح یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ لندن میں جلاوطنی کا زمانہ گزارا۔ واپس آ کر پھر پارٹی ورکر بن گئے۔ انہوں نے بتایا کہ پہلی بار معزولی کے بعد ایک میٹنگ میں انہوں نے بےنظیر سے کہا کہ ہمیں سب سے پہلے پارٹی کی طرف توجہ دینی چاہئے بےنظیر نے اُسے بُری طرح جھاڑ دیا۔ دوسرا واقعہ الطاف احمد قریشی نے سنایا کہنے لگے۔ دوسری بار جب بےنظیر برطرف کی گئی تو میں کراچی گیا۔ جان بوجھ کر ملنے نہیں گیا کہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کوئی بات تنقید سننے کے لیے تیار نہیں۔ بیگم بھٹو بڑی روادار خاتون ہیں، انہیں معلوم ہوا کہ میں کراچی میں ہوں تو انہوں نے فون کیا اور شام کو آنے کے لیے کہا۔ میں گیا، وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پارٹی کے معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔ کاسہ لیس ہاں میں ہاں ملا رہے تھے، میں نے کچھ نکات پیش کیے تو بےنظیر چڑ گئی اور خاصی تلخ کلامی ہوئی۔

تیسرے واقعہ کے راوی فتح محمد ملک ہیں، یہ بےنظیر کے پہلے دور سے متعلق ہے۔ اسمبلی میں اس کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش ہونے والی تھی، ملک صاحب کہتے ہیں کہ میں کسی کام سے راؤ رشید کے پاس گیا جو اُس وقت پرسنل سیکرٹری تھے، میرے بیٹھے بیٹھے بےنظیر کے دو تین فون آئے معلوم ہوا کہ وہ فوری طور پر مولانا فضل الرحمٰن سے ملنا چاہتی ہیں۔ راؤ رشید نے بتایا کہ چند دن پہلے تک مولانا بےنظیر سے ملنے کے مشتاق تھے لیکن بےنظیر نے انکار کر دیا حالانکہ وہ اس کے اتحادی بھی تھے۔ راؤ رشید کہتے ہیں کہ میں نے بی بی کو بہت سمجھایا کہ مولانا سے ملاقات سے انکار نہ کریں۔ لیکن وہ نہ مانی اور اب وہ مشتاق ہیں اور مولانا انکار کر رہے ہیں۔ بےنظیر کا المیہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کو سب کچھ سمجھتی ہے اور عوام کی بجائے امریکن دوستوں پر تکیہ کرتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک موقع پر اُس نے کہا بھی تھا کہ مجھے تو امریکن لے کر آئے ہیں، میں لوگوں کی پرواہ کس لیے کروں؟ بےنظیر فوج کی مجبوری تھی ورنہ پیپلز پارٹی

کبھی بھی فوج کی ترجیح نہیں رہی۔ جیسے ہی مجبوری ختم ہوئی بے نظیر کو فارغ کر دیا گیا۔ بے نظیر اگر زیرک ہوتی تو اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر خود کو مضبوط کر سکتی تھی، لیکن اس نے اُسی طرح کھیل کھیلا جس طرح ایجنسیوں نے پلان کیا تھا۔

بے نظیر کا مدِ مقابل نواز شریف تھا۔ ان دونوں کے بارے میں بڑے کمال کا ایک جملہ مشہور ہے ''ایک سمجھنا نہیں چاہتا اور دوسرے کو سمجھ ہی نہیں آتی''۔

○

حریت کانفرنس کے اشرف صراف اکثر کالج آتے رہتے تھے۔ ان کا بیٹا میری کلاس میں تھا۔ وہ جب بھی آتے کشمیر کی تازہ صورت حال کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ہوتی۔ اشرف صراف بارہ مولہ میں پروفیسر تھے۔ تحریک آزادی میں شامل ہوئے تو نوکری سے برطرف کر دیے گئے، جیل کاٹی، پھر کسی طرح پاکستان آپہنچے۔ یہاں وہ مجاہدین اور سرکار کے درمیان رابطہ کا کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں بے نظیر اور نواز شریف دونوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ایک بار دونوں کی ذہانت اور طریقہ کار کا ذکر ہو رہا تھا، تو کہنے لگے۔ ''بے نظیر سے ملا تو میں نے ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی بات کی تھی کہ وہ بولیں...... ''میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں'' اور پھر باقی کا ایک گھنٹہ وہ ہی بولتی رہیں، نواز شریف سے ملاقات ہوئی تو میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ بولتا رہا، وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''ذرا صاف لفظوں میں بتائیں آپ چاہتے کیا ہیں''۔

صراف جب بھی آتے کہتے ''مجھے سٹاف روم میں لے چلیں۔ سٹاف روم اور بار روم دو ایسی جگہیں ہیں جہاں نئے نئے آئیڈیاز جنم لیتے ہیں۔ یہ دو ایسی جگہیں ہیں جہاں سے نکلنے والے خیالات پورے ملک کو متاثر کرتے ہیں''۔

میں انہیں کبھی سٹاف روم میں لے کر نہیں گیا۔ اپنے کمرے میں بٹھا کر چائے پلاتا اور گپ شپ کر کے انہیں گیٹ تک چھوڑنے جاتا۔ میں اُن کے آئیڈیل کو مجروح نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ ان کی بات تو گئے دنوں کی بات ہے۔اب تو سٹاف روموں اور بار روموں میں پلاٹوں کی، جائیدادوں کی اور پروموشن کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں انہیں یہ لطیفہ بھی نہ سنا سکا کہ کچھ صاحبان عالی شان کسی نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور ایف۔ایف کی آوازیں آ رہی تھیں، کسی نے پوچھا'' کیا ایف سکسٹین (F-16) کے بارے میں کچھ سوچ بچار ہو رہا ہے''جواب ملا''نہیں ہم تو ایف سیکٹر میں خالی پلاٹ تلاش کر رہے ہیں تا کہ اپنے نام الاٹ کرا سکیں''ایک بار میں نے صراف سے پوچھا...... ''آپ تو کشمیر سے ابھی ابھی آئے ہیں اور تازہ ترین صورت حال سے بھی آگاہی رکھتے ہیں، کشمیریوں کا رجحان کس طرف ہے؟''بولے ''پہلی بار تو وہ پاکستان سے الحاق پسند کریں گے لیکن الحاق ہونے کے دو تین برس بعد ہی اس الحاق کے خلاف تحریک شروع ہو جائے گی''

میں نے کہا...... ''وہ کیوں؟''

بولے'' کچھ بھی ہو بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک جمہوری کلچر ہے اور کشمیریوں نے اس جمہوی کلچر میں طویل عرصہ گزارا ہے، جبکہ یہاں بنیادی طور پر آمریت زدہ کلچر ہے، اس لیے کشمیری محبت میں تو پہلی بار اسی طرف آئیں گے لیکن وہ اس معاشرے میں زیادہ دیر نہیں رہ سکیں گے''

پاکستان کے اس غیر جمہوری کلچر کی بنیادی قوت پنجاب ہے، وہ بھی سنٹرل پنجاب، جسے لوگ طنزاً تخت لاہور کہتے ہیں۔ اگر پنجاب کو تین صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے تو بہت سے بگڑے کام ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اشرف صراف کی یہ بات سرسری نہیں، بہت ہی توجہ چاہتی ہے۔خود پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی رائے اس سے مختلف نہیں۔ پنجاب کے دور دراز علاقے بھی یہی سوچ رکھتے ہیں، میں پچھلے دنوں ملتان گیا تو اکثر محفلوں میں ''تخت لاہور'' کے تذکرے ہوئے۔ اگر پنجاب کو سرائیکی، سنٹرل اور پھوٹھواری صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے،

اور اسی طرح سرحد کو تین صوبوں میں یعنی شمالی علاقہ جات، ہزارہ اور باقی سرحد اور سندھ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو پاکستان میں آمریت کے کلچر کو بنیادی دھچکا لگے گا اور بڑے صوبے کی آمریت کا ہوا بھی اپنی موت آپ مرجائے گا۔

نواز شریف بھی فوج کا ہی پروردہ تھا لیکن پہلی بار برطرف ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ اقتدار میں آیا تو اس نے فوج کو نکیل ڈالنے کی پوری کوشش کی، اگر وہ بعض بنیادی غلطیاں اور جلد بازی نہ کرتا تو شاید اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ جرنیلوں کا سیاست دانوں بلکہ اپنے پروردہ لیڈروں کے بارے میں رویہ کیا ہے اس کا ایک واقعہ عبدالقادر حسن نے اپنے کالم میں بیان کیا ہے۔ کالم کی زندگی ایک ہی دن ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس واقعہ کو یہاں ریکارڈ کر دوں عبدالقادر حسن لکھتے ہیں کہ جنرل جیلانی جس زمانے میں پنجاب کے گورنر تھے نواز شریف وزیر خزانہ تھے۔ ایک دن گورنر ہاوس سے ایک تقریب کا بلاوا آیا لوگ پہنچے تو دربار ہال میں نواز شریف جھینپے جھینپے سے ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اتنے میں جنرل جیلانی اندر آ گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ نواز شریف کو وزیر اعلیٰ بنایا جا رہا ہے۔ لوگ نواز شریف کے گرد اکٹھے ہو گئے اور مبارک دینے لگے۔ پگڑیاں باندھے ویٹر مشروبات پیش کرنے لگے۔ اچانک جنرل جیلانی کے دل میں خدا جانے کیا آیا کہ انہوں نے ایک ویٹر کے سر سے پگڑی اتار کر نواز شریف کے سر پر رکھ دی اور ہنسنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا پھر سارے لوگ جنرل جیلانی کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گئے۔ نواز شریف کی حالت عجب تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دیکھا جائے تو یہ سارا فعل علامتی ہے کہ ہمارے جرنیل وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کو کیا سمجھتے ہیں یا اسے کس مقام پر رکھنا چاہتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان اس مقام کو قبول کر کے اقتدار میں آتے ہیں لیکن اقتدار پھر اقتدار ہے۔ ذرا سا لطف آتا ہے تو اپنا مقام بھول جاتے ہیں اور پھر کان سے پکڑ کر نکال دیے جاتے ہیں۔ مجھے نواز شریف سے کوئی

محبت نہیں، بلکہ ایک حوالے سے میں اُس کے مخالفین میں شامل ہوں۔ لیکن ۱۲ اکتوبر کا فوجی ایکشن میری تذلیل ہے۔ اس نے اس صداقت پر مہر لگا دی ہے کہ پاکستان میں ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔ ووٹ کے ذریعے نہ کوئی اقتدار میں آ سکتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ اس مارشل لا کا کوئی زیادہ ردِعمل نہیں ہوا۔ بی بی سی نے اپنے ایک تبصرے میں بہت عمدہ بات کہی کہ پاکستان کے لوگ ہر مارشل لا کا ڈھول بجا کر استقبال کرتے ہیں اور پھر ازانیں دے کر اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں کہ اس مارشل لا کے خلاف کیا کچھ لکھا گیا، میرا خیال ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ منشا نے ایک کہانی لکھی، دو میں نے لکھیں۔ یہاں کے حلقوں میں تو اور کچھ نہیں سنا۔ شاید وقت کے ساتھ کچھ اور تخلیقات منظر عام پر آئیں۔

پاکستان کی تاریخ میں ادیبوں کا سب سے زیادہ ردِعمل ۷۷ء کے مارشل لاء کے خلاف ہوا۔ ۵۸ء کے مارشل لاء کے خلاف بھی چند ہی چیزیں لکھی گئیں۔ یحییٰ کے مارشل لا پر بھی دو ایک کہانیاں ہی نظر سے گزریں، ان میں میری ایک کہانی ''دور ہوتا چاند'' بھی تھی، البتہ ۷۷ء کے حوالے سے تو اتنی تخلیقات سامنے آئیں کہ جب میں نے ''مزاحمتی ادب'' کا انتخاب کیا تو اسے سمیٹنا مشکل ہو گیا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ انتخاب دو تین سو صفحات پر مشتمل ہو لیکن کم کرتے کرتے بھی یہ چھ سات سو صفحات پر پھیل گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جبر و تشدد اور سیاسی خوف کی جو فضا قائم ہوئی تھی۔ اس کا تسلسل ابھی تک جاری ہے، بس صورتیں ہی بدلتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہمارے خوابوں کو تعبیر نہ ملی۔ سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کا دور کسی نہ کسی صورت جاری ہی رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجنوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا، پہلے اس کے نام ہندوانہ تھے، اب مسلم ہو گئے۔ علامہ مشرقی نے غالباً ۱۹۴۸ء میں اپنے ایک مضمون میں کہا تھا کہ اب پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کے نظام پر غور کر لیں۔ اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی اور جمہوریت کے اسی

مغربی تصور کو برقرار رکھا تو ایک دن آئے گا جب اسمبلیوں پر ایک ایسا طبقہ قابض ہو جائے گا، جس کے پاس فوج اور پیسہ دونوں قوتیں ہوں گی اور پھر اس سے جان چھڑانی ناممکن ہو جائے گی۔ یہی ہوا مارشل لا ہو یا جمہوریت، عوام کا درجہ خدام کا ہی رہا ہے، آقا وہی ہیں، صرف چہرے بدلتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے ۵۸ء کے مارشل لاء تک، ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک، پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لا اور پھر ۱۹۸۸ء سے اسمبلیوں کی برطرفی اور اب ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے مارشل لا تک آمریت اور جبر و استبداد کا وہی ڈرامہ مختلف شکلوں اور کرداروں کے توسط سے کھیلا جا رہا ہے حکمران طبقہ وہی ہے، جب دیکھتے ہیں کہ ایک چہرہ داغدار ہو گیا ہے تو دوسرا چہرہ آ جاتا ہے، انگریز تو چلے گئے لیکن ان کے گماشتے دیسی انگریز اسی طرح سامراج کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ہمارے زوال کا عرصہ جو ۱۷۰۷ء (اورنگزیب کی وفات) سے شروع ہوا تھا ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ ہم مسلسل ڈھلوان سے لڑھک رہے ہیں بلکہ اب تو ہم نے اس لڑھکنے میں بھی ایک سہولت اور حظ آفرینی تلاش کر لی ہے۔ زوال میں لذت آنے لگے تو اس میں ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا عرصہ طویل تر ہونے لگتا ہے، ہمارا زوال جاری ہے کہ جبر و استبداد، بے یقینی، معاشرتی شکست و ریخت اور اس کے نتیجے میں فرد کا زوال، اخلاقی انحطاط، اقدار کی تباہی، سیاسی بے اعتباری اور شکستِ ایمانی کا جو سلسلہ ۱۷۰۷ء سے شروع ہوا تھا اور جس نے ۱۸۵۷ء میں ایک سامراجی تشدد کی صورت اختیار کر لی تھی اب بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے، ہم حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہوئے بلکہ نو آبادی سے ایک نئی نو آبادی میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

○

انگریز نے جاتے جاتے نفاق کا جو بیج بویا تھا اور آئندہ کا جو نقشہ مرتب کیا تھا، اس میں بنیادی حیثیت کشمیر کی ہے۔ کشمیری ہونے کے حوالے سے کشمیر سے میری دلچسپی فطری ہے۔

بھارت و پاکستان کے اپنے اپنے قومی مفادات نے اس مسئلے کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک بات تو طے ہے کہ طاقت کے زور سے نہ پاکستان کشمیر کو حاصل کر سکتا ہے اور نہ بھارت اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ اس میں ایک چوتھا فریق بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ فریق وہ اشخاص اور جماعتیں ہیں جنہیں بھارت یا پاکستان کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ اس فریق کے مفادات اسی میں ہیں کہ یہ مسئلہ کبھی حل نہ ہو تا کہ ان کے فنڈز بند نہ ہو جائیں، ایک پانچواں فریق بھی ہے جس کے ہونے کا جواز اسی مسئلہ سے ہے اگر آج یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پاکستان بھارت کے درمیان کوئی بنیادی تنازعہ نہ رہے اور اگر تنازعہ نہ رہے تو اس کو exploit کر کے اپنی اہمیت اور جواز کی بات کیسے ہو؟

○

عام خیال یہ ہے کہ جب معاشرے میں صنعت کا عمل دخل بڑھتا ہے تو ایک رواداری، برداشت اور شعور خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے لیکن ہمارے یہاں یہ معروف تعریف درست ثابت نہیں ہوئی۔ بھارت ہی کو دیکھ لیجیے، صنعتی اعتبار سے وہ اس وقت دنیا کے بڑے بڑے صنعتی ممالک سے کندھا ملانے کی کوشش کر رہا ہے اور آزادی کے پچاس سالوں میں وہاں جدید صنعت کو بڑا فروغ ملا ہے لیکن مذہبی تشدد پسندی کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، پہلے مسلمان اس کی زد میں تھے، اب دوسری اقلیتیں بھی اس کا شکار ہونے لگی ہیں۔ خود ہندوؤں میں ذات پات کے جھگڑے خونی تشدد کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ معروف تعریف کے مطابق تو بھارتی معاشرے کو اس وقت رواداری اور برداشت کی سوسائٹی ہونا چاہیئے تھا لیکن مذہبی گروہوں کا گراف کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا جا رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ وہاں میڈیا بھی آزاد ہے اور اس کی آواز بھی موثر ہے۔ سیکولرازم آئین کا حصہ ہے اور بظاہر اس کی گونج بھی ہر طرف سنائی دیتی ہے، ایک طرف میڈیا پر ایسی ایسی بحثیں ہو رہی ہیں کہ مشرقی ممالک میں ان

کا ابھی تصور نہیں اور دوسری طرف جنیوئن مذہب نہیں بلکہ تشدد پسند مذہب کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ کیا یہ مایوسی ہے، عدم تحفظ یا مستقبل کے دھندلا ہونے کی احساس؟ پاکستان میں بھی صورت حال مختلف نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایسی جماعتیں اور گروہ نہ صرف تیزی سے پھیل رہے ہیں بلکہ مضبوط ہو رہے ہیں جو اسلام کی تفسیر وتشریح قبائلی نظام کی صورت کر رہے ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں سے قطع نظر ایسے گروہ کا اسلام ایک بہت ہی محدود دائرہ بناتا ہے جس میں سارا زور عبادات اور رسومات پر ہے، اسلام کی برکتوں، علم، مشاہدے اور تدبر کی بات نہیں کی جاتی کہ اس سے موجودہ معاشرتی اقتدار اور نظام پر زد پڑتی ہے۔ ہمارے بڑے شہروں میں صنعت نے قدم جما لیے لیکن عجب بات ہے کہ مذہبی تشدد پسندی بھی یہیں زیادہ ہے۔ سنٹرل پنجاب سے جاگیرداری اب تقریباً ختم ہو چلی ہے۔ لیکن جمہوری قدریں یہیں کمزور ہیں۔ اسمبلی کے اراکین کی خرید وفروخت اور جوڑ توڑ یہیں زیادہ ہے، عام سطح پر بھی تعصب کی فضا نمایاں ہے، اس کے برعکس سرائیکی بیلٹ اور سندھ میں جاگیرداری اپنے پورے عروج پر ہے لیکن ان علاقوں میں نسبتاً کشادہ فضا کا احساس ہوتا ہے اور عام سطح پر رواداری اور برداشت کی صورت نظر آتی ہے۔ اس کا ایک مطالعہ ان علاقوں کی متعلقہ یونیورسٹیوں میں جا کر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ وہ نئی نسل جو پاکستان معاشرے کو بدلنے کی قوت، ہمت اور ولولہ رکھتی تھی، جس کے پاس ایک نظریہ بھی تھا، ہم نے اسے جہاد پر لگا دیا ہے، سب سے پہلے تو ہمیں اپنے معاشرے میں جہاد کرنا چاہیے اور اسے ایک فلاحی ریاست بنانے کے لیے اس سامراجی نظام کے بت کو توڑنا چاہیے۔ لیکن یہ نسل دنیا بھر میں انقلاب لانے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں یہ انقلاب آئے گا یا نہیں لیکن خود اپنے اندر کی صورت حال ضرور خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا یہ کوئی بین الاقوامی سازش تو نہیں کہ مسلمانوں کی فعال نسل کو تو یوں مروا دیا جائے اور جین پہننے والی ٹیڈی نسل کو باقی رکھا جائے۔

ہماری نئی نسل اس وقت دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہے، ایک جو جین پہن کر مغربی موسیقی پر تھرک رہی ہے اور دوسرے جو مجاہدین بن کر دنیا بھر میں جہاد کر رہی ہے اور انقلاب لا سکتی تھی لیکن کمال خوبصورتی کے ساتھ اسے ایسے کام پر لگا دیا گیا ہے جس کا کوئی انجام اور نتیجہ نہیں، سو سامراجی طبقے ملک کے ساتھ جو چاہیں کریں کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے دعویداروں میں دو طرح کے لوگ میں ایک وہ جو خلوص سے یہ سمجھتے ہیں کہ یوں ان کے مسائل حل ہو جائیں گے اور دوسرے جو اس آڑ میں طوائف الملوکی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اسلامی نظام کے پرجوش حامیوں نے بھی اس سلسلے میں کوئی عملی کام نہیں، صرف نعرے ہی لگائے ہیں۔ پوری بیسویں صدی میں اس معاملے میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ اقبال اور اس صدی کے دوسرے مفکرین نے ان مسائل پر غور وفکر کیا تھا۔ بات وہیں ہے۔ اقبال کے سوال تھے کہ اول اسلامی ریاست کا نظام حکومت کیا ہوگا، یعنی انتخاب کا طریقہ کیا ہوگا، سیاسی اصول کیا ہوں گے صرف پارلیمنٹ کو مجلس شوریٰ کہہ دینے سے تو بات نہیں بنے گی۔ دوم اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام کیا ہوگا۔ سود کی تعریف کیا ہے اور جدید دور میں بین الاقوامی رابطوں کے ساتھ اس کے معنی کیا ہوں گے سوم اسلامی ریاست میں عورت کی حیثیت کیا ہوگی۔ یورپ کی طرح مادر پدر آزاد یا قبائلی نظام کی طرح بھیڑ بکریوں جیسی، چہارم اجتہاد کون کرے گا اقبال نے اس سلسلے میں سید سلمان ندوی سے بھی خط وکتابت کی لیکن معاملہ وضاحتوں سے آگے نہ بڑھا۔ اب صدی اپنے اختتام کو پہنچ چکی اور یہ چاروں مسائل اسی طرح تشنہ ہیں۔ اسلامی نظام کا نعرہ لگانے والوں میں سے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ایک متفقہ کوڈ ہی بنالیں۔ جہاں یہ صورت ہو کہ ایک فقہ دوسرے کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔ وہاں ایک متفقہ نظام کیسے نافذ ہوسکتا ہے۔

○

ہم اپنی قومی تاریخ کی غلطیوں اور ناکامیوں کا ذکر تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں لیکن ہم نے کبھی سنجیدگی سے ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو ان ناکامیوں کی بنیادی وجہ ہیں۔ نظام کی خرابی کا رونا بہت رویا جاتا ہے۔ لیکن یہ خرابی ہے کیا؟ میرے نزدیک بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم ابھی تک نوآبادیاتی نظام ہی میں رہ رہے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام سامراج نے اپنی سہولتوں کے لیے وضع کیا تھا۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہم نے اس پر غور نہیں کیا۔ اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی تو وہ وقتی تھی۔ یوں ہم نے وقت گزارنے کی پالیسی کو اپنا کر اس نظام کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ میں اس نظام کا شکار ہوں اور میں نے اپنے حوالے سے اس پر کچھ سوچ بچار بھی کی ہے میرے نزدیک تین شعبے ایسے ہیں جن میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر ہماری تعمیر نو نہیں ہو سکتی ہے، یہ تعلیم، پولیس اور عدلیہ ہیں۔

ہماری تعلیمی پالیسیاں لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا تسلسل ہیں جس کا بنیادی مقصد ایک ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرے اور ان کے لیے آنکھیں کان اور ہاتھ بنیں۔ سر سید احمد خان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی خدمات بے پناہ ہیں لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ علی گڑھ میں انگریزی ادب پڑھا کر وہ مغربی ٹیکنالوجی حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ادب تو اپنے ساتھ ایک کلچر رکھتا ہے اور پڑھنے والے کو اپنے اندر، اپنی ثقافت میں رنگ لیتا ہے۔ ہوا بھی یہی کہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کر کے جو بھی نکلا وہ چھوٹا موٹا صاحب بن گیا۔ اکبر الہ آبادی کو علی گڑھ کی تعلیم سے یہی اختلاف تھا، وہ چاہتے تھے کہ انگریزی بے شک پڑھ لیں لیکن انگریز کی ملازمت نہ کریں۔ دوسری طرف انگریز بھی بے وقوف نہیں تھے وہ یہاں ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے انہوں نے یہاں وہی کام کیے جو ان کے مفاد کے لیے ضروری تھے۔ وہیں سڑک بنائی جہاں ضروری تھی۔ اس تعلیم کا مقصد حکمران کے لیے قوت فراہم کرنا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے اسی تعلیمی پالسی کو جاری رکھا۔ ہماری یہ تعلیم واضح طور پر دو کیمپوں

میں تقسیم ہے۔ یہ تقسیم ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہوگئی تھی۔ ایک طرف دین اور دوسری طرف دنیا۔ جب تک ہم ان دونوں کو اکٹھا نہیں کریں گے ہماری تعلیمی گاڑی صحیح لائن پر نہیں آئے گی۔ ہمارے دینی مدرسوں کا یہ حال ہے کہ وہ جدید افکار اور سائنسی انکشافات سے بدکتے ہیں۔ میں جب گلستان کالونی میں آیا تو یہاں ایک دینی مدرسہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک بزرگ چٹھہ صاحب اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مجھ سے بھی بات ہوئی۔ میں نے انہیں تجویز دی کہ مدرسہ میں بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ دنیاوی چیزیں بھی پڑھائی جائیں اور اس کے لیے میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ ایسے دو چار احباب ہیں جو فزکس، کیمسٹری، حساب، انگریزی اور اردو ادب بغیر معاوضہ کے پڑھا دیں گے۔ چٹھہ صاحب بڑے خوش ہوئے۔ بولے ''میں اگلی میٹنگ میں یہ تجویز پیش کروں گا'' میٹنگ ہوئی تو بڑے مایوس تھے کہنے لگے ''منتظمین کا خیال ہے کہ یہ لوگ بچوں کو خراب کریں گے انہیں دین سے برگشتہ کریں گے۔ چنانچہ اسے رد کر دیا گیا''۔

ہمارے دینی مدرسوں کے نصاب پر نظر ڈالیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اکثر جگہ ابھی تک درس نظامیہ ہی پڑھایا جا رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہاں سے جو طالب علم تحصیل علم کے بعد باہر آتا ہے اسے حدیث فقہ اور قرآن پر تو عبور ہوتا ہے لیکن عام دنیاوی معاملات کے بارے میں اس کا فہم نہ صرف کمزور ہوتا ہے بلکہ ایک منفی ردعمل اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ ضیاالحق کے زمانے میں پچاس نمبر کی اسلامیات اور پچاس نمبر کا مطالعہ پاکستان نصاب میں شامل کیا گیا۔ یہ صرف ایک سیاسی نعرہ تھا۔ جس کے پیچھے خلوص نہیں۔ اس لیے کہ پچاس نمبروں کا یہ سلسلہ طالب علم اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک میٹنگ میں تجویز دی تھی کہ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان پر ایک ایک مربوط اور تفصیلی مضمون لکھوا کر انہیں اردو اور انگریزی میں شامل کر کے اس سوال کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ کوئی جماعت ہو

یہ دو پرچے لازمی ہیں۔ طلبا رٹا لگاتے ہیں اور پرچہ دینے کے بعد دوبارہ اسی موضوع پر گفتگو تک نہیں کرتے۔ اس وقت ہمارے تعلیمی نظام کی صورت حال یہ ہے کہ ایک مرحلہ پرائمری ہے، دوسرا مڈل، تیسرا میٹرک، چوتھا انٹر اس کے بعد پروفیشنل کالجز اور یونیورسٹیاں۔ یہ طریقہ انگریز کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ میری رائے میں یہ مرحلے یوں ہونا چاہئیں۔ اول پرائمری، دوم مڈل اور سوم ہائر سیکنڈری، یہ مرحلے سکول کی سطح تک محدود ہوں۔ سکول سے سیدھا پروفیشنل ادارے۔ درمیان سے کالج کے دو سال نکال دیے جائیں۔ مدت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کالج میں بچے سوائے برباد ہونے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہائر سیکنڈری جو تین سال کا ہو (نویں، دسویں اور گیارہویں) میں سارے سائنسی مضامین پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد پروفیشنل کالجوں میں چھ ماہ یا ایک سال کی ابتدائی تربیت ہو جو اپنے متعلقہ مضمون کے بارے میں ہو۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہماری قابلیت کا معیار صرف نمبر رہ گئے ہیں۔ ایک نمبر کم ہو تو داخلہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ کی پروموشن سنیارٹی اور اے سی آر پر ہوتی ہے۔ اچھی اے سی آر کے لئے پرنسپل کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ ایک بار لندن سے امریک سنگھ ہمارے کالج آئے۔ ان سے بہت سی باتیں ہوئیں، کچھ باتیں تعلیم کے حوالے سے بھی ہوئیں۔ وہ آکسفورڈ میں پڑھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا...... "آپ کے ہاں پرموشن کا طریقہ کار کیا ہے"۔ انہوں نے بتایا کہ ہر تین سال بعد ہمیں اپنا پروجیکٹ بتانا پڑتا ہے کہ اس عرصہ میں ہم اپنے مضمون کے کس پہلو پر کام کریں گے۔ تین سال بعد میٹنگ میں ہمیں اپنا کام کمیٹی کو دکھانا پڑتا ہے اس کے بعد سالانہ ترقی یا دوسری ترقی ملتی ہے"۔ ہمارے یہاں صورت یہ ہے کہ استاد اپنے مضمون کے حوالے سے تازہ تبدیلیوں تک سے واقف نہیں ہوتا۔ اس نے جن نوٹس کی مدد سے خود ایم اے کیا ہوتا ہے وہی نوٹس آگے لکھا دیتا ہے۔ استاد کی قابلیت کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ پرائیویٹ سطح پر تو صورت حال اور بھی خراب ہے اکثر پرائیویٹ تعلیمی اداروں

نے کالج کی سطح پر دو دو ہزار پر اور سکول کی سطح پر ہزار ہزار پر اساتذہ رکھے ہوئے ہیں۔

ہماری پولیس کا ڈھانچہ بھی نو آبادیاتی نظام میں تیار کیا گیا تھا۔ جہاں پولیس حکمران کی قوت کا اظہار ہوتی ہے اور اس کا کام عوام کو دبانا اور ان کی تذلیل کرنا ہوتا ہے ہمارے تھانے تشدد اور مار دھاڑ کے اڈے بن چکے ہیں اتنے بڑے پیمانے پر ان کی اصلاح کی صرف یہی صورت ہے کہ ہر تھانے کے ساتھ متعلقہ علاقے کے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک اصلاحی کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی میں ایک وکیل، ایک پروفیسر یا استاد اور ایک اور شہری شامل ہو۔ یہ کمیٹی باقاعدہ اپنے اجلاس متعلقہ تھانے میں کرے اور کم از کم ہفتہ وار کارکردگی کا جائزہ لے۔

اسی طرح عدلیہ کے شعبے میں بھی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ معاشرے کو ٹھیک رکھنے کے لیے چار طرح کے خوف ہوتے ہیں اول قانون کا خوف کہ قانون کے ڈر سے کوئی غلط کام نہ کیا جائے، دوم معاشرے کا خوف کہ لوگ کیا کہیں گے، تیسرا ضمیر کا خوف کہ اپنے آپ سے شرمندگی ہوگی اور چوتھا خدا کا خوف کہ کم از کم وہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جس معاشرے سے یہ چاروں خوف ختم ہو جائیں اس کا پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ ہماری صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ قانون بے اثر، پہلے تو پکڑے ہی نہیں جاتے پکڑے گئے تو رشوت سفارش سے بچ جاتے ہیں۔ معاشرے کا خوف اس لیے نہیں کہ اب سب یہی کچھ کر رہے ہیں، دوسرے کو کون ٹوکے گا، ضمیر زندہ نہیں اور خدا سے ڈرتے نہیں۔

نظام کی خرابی کا یہ حال ہے کہ بیوروکریسی ایک ارنے بھینسے کی طرح ہر طرح دندنا رہی ہے۔ کوئی اسے نکیل ڈالنے والا نہیں۔ کہتے ہیں ایک سیکرٹری ایک لاکھ روپے مہینے میں پڑتا ہے۔ سرکاری گاڑیاں یوں دوڑ رہی ہیں جیسے ہوا سے چلتی ہیں۔ عام طور پر ان کا سفر یوں ہوتا ہے پہلے صبح بچوں کو سکول چھوڑنا، پھر صاحب کو دفتر پہنچانا، اس کے بعد بیگم صاحبہ کو بازار لے کر جانا اور گھر کا سودا لانا، دوپہر کو بچوں کو سکول سے لانا پھر صاحب کو لانا، شام کو میل ملاقات،

ایک افسر کی گاڑی کے پٹرول اور مرمت کے اخراجات کا تخمینہ لگایا جائے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ٹیلی فون مفت ہے ایک بار میں ایک دفتر میں بیٹھا ہوا تھا پی اے نے بتایا کہ صاحب کے گھر کے فون کا بل چالیس ہزار ہے۔ چار چار کنالوں میں گھر ہیں۔

کسی مہذب معاشرے میں اسی طرح کی عیاشی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ دفتروں اور سرکاری گھروں کی یہ حالت ہے کہ جب نیا افسر تبدیل ہو کر آتا ہے تو سب سے پہلے دفتر اور گھر کا سارا فرنیچر، پردے قالین بدلواتا ہے کہ پہلے سے موجود یہ چیزیں اور ان کے رنگ اس کو پسند نہیں ہوتے۔ کرپشن اوپر سے کیسے نیچے تک آتی ہے اس کے دو واقعے بیان کرتا ہوں۔ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ ایک بار سی بی آر کے ایک ممبر، جنھوں نے نیا گھر بنایا تھا، نے کمشنر کو فون کیا کہ اسے فوری طور پر دو اے سی بھجوائے جائیں۔ کمشنر نے انکم ٹیکس افسر کو کہا کہ تین اے سی کا بندوبست کرو۔ دو ممبر صاحب کو اور ایک میرے گھر بھیج دو۔ انکم ٹیکس افسر نے علاقہ کے انسپکٹر کو بلایا اور کہا کہ چار اے سی چاہیے۔ ایک ان کے گھر، ایک کمشنر کو اور دو ممبر کو۔ انسپکٹر متعلقہ بازار میں آیا اور بازار کی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری سے کہا کہ پانچ اے سی فوری طور پر اکٹھے کیے جائیں۔ ایک اس نے اپنے پاس رکھ لیا اور باقی اوپر چلے گئے۔ اس کے بدلے دکانداروں کو ٹیکس میں چھوٹ دے دی گئی۔ گزشتہ دنوں میں زکریا یونیورسٹی ملتان میں گیا تو ایک شام ملک ظفر نے ایک حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین واقعہ سنایا۔ اُنہوں نے بتایا کہ پنجاب کے ایک گورنر کو جو صاحبان عالیشان میں سے تھا۔ بہاولپور کے علاقہ میں مربے الاٹ ہوئے۔ ایک دن گورنر نے کمشنر بہاولپور سے فون پر پوچھا کہ ان مربوں کی مالیت کیا ہوگی۔ کمشنر نے یوں ہی نمبر بنانے کے لیے کہہ دیا "سر تقریباً ایک کروڑ" گورنر نے کہا...... "تو ایک ہفتہ میں مربے بیچ کر کروڑ روپے انھیں بھجوا دیے جائیں۔ کمشنر کو مصیبت پڑ گئی۔ اس نے یونہی نمبر بنانے کے لیے کہہ دیا تھا حقیقت یہ تھی کہ مربے چند لاکھ سے زیادہ کے نہ تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو بلایا کہ اب کیا

کریں میٹنگ میں ایک ایس پی بھی تھے۔انہوں نے کہا ''سر آپ اجازت دیں تو میں ایک راستہ بتاتا ہوں'' کمشنر نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

ایس پی نے کہا۔''مقامی نیشنل بنک کی شاخ میں تین چار کروڑ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔آپ اجازت دیں تو آج رات اس پر ڈاکہ پڑوا دیتے ہیں''

رات کو بنک پر ڈاکہ پڑا اور دو کروڑ لوٹے گئے۔ایک کروڑ تو گورنر کو بھیج دیے گئے اور ایک کروڑ متعلقہ انتظامیہ میں بٹ گئے۔صبح چوری کا پرچہ درج ہو گیا۔کچھ عرصہ ذکر اذکار رہا پھر داخل دفتر۔

ایک اور صاحب نے اسی محفل میں بتایا کہ ایک بنک کے پریذیڈنٹ کی بیٹی کی شادی تھی۔اس بنک کے وائس پریذیڈنٹوں نے اسی شہر میں سرکاری میٹنگ رکھ لی اور ہر شخص نے بنک کے کھاتے میں سے ایک ایک لاکھ کا تحفہ دیا۔

پچھلے دنوں مجھے جی ٹی روڈ پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔راستے میں کہیں مجھے کسی فکرو پریشانی کے آثار دکھائی نہ دیے۔رات لاہور میں گزری۔لاہور دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔نہر میں کپڑے کے بادبانوں کی کشتیاں تیر رہی تھیں، جن میں دیئے جل رہے تھے۔درختوں پر بتیوں کی لڑیاں تھیں اور شاخوں پر چھوٹے بلبوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔آج صبح ہی اخباروں میں پانی اور بجلی کے بدترین بحران کی خبریں چھپی تھیں۔کچھ عرصہ ہوا میں نے چولستان کی خشک سالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دریائے گاگرا سوکھ رہا تھا اور اس کی آس پاس کی بستیاں آنکھیں بند کیے اپنے ہونے کے نشے میں سرشار، اپنی دنیا میں مگن تھیں۔ہمارے دریا بھی سوکھ رہے ہیں، بندوں میں سلہٹ کی تہیں بلند ہو گئی ہیں، بارشیں روٹھ گئی ہیں لیکن ہم اپنے زوال کے نشے میں سرشار ہم چو ما دیگرے نیست (ہمارے جیسا دوسرا کوئی نہیں) کی افیون طرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔قومیں جب اپنے زوال کو انجوائے کرنا شروع کر دیں اور اس میں لذت

کے ساتھ ساتھ فخر کا پہلو تلاش کر لیں تو پھر دریاؤں کو سوکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ سو میرا سفر ختم نہیں ہوا، پھر شروع ہو رہا ہے، مجھے معلوم نہیں ابھی مجھے اور کیا دیکھنا ہے۔ آگ اور خون کے کس کس دریا سے گزرنا ہے اور میری بے تاب تمناؤں نے کیا رنگ اختیار کرنا ہے

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو